اسلام : منزل بہ منزل

قافلۂ اسلام کے منازل اور مقامات کی
تاریخی اور تحقیقی داستان

مصنف : ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجم : سید رئیس احمد جعفری ندوی

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

جُملہ حُقوق بحقّ ناشران محفوظ ہیں

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پرنٹرز
جامعہ اشرفیہ، اچھرہ، لاہور

مقامِ اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

انتساب

ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ کے نام

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر طہٰ حسین ہیں :

ڈاکٹر طہٰ حسین علم و فضل، تحقیق و مطالعہ، ادب و انشا اور نقد و احتساب کی مجلس میں جب رونق افروز ہوتے ہیں تو اپنی مثال آپ نظر آتے ہیں۔ ان کے قلم میں کوثر و سلسبیل کی روانی ہے۔ واقعات کا تجزیہ وہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ صُورت حال آئینہ کی طرح صاف اور روشن نظر آنے لگتی ہے نقد و احتساب میں وہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے۔ وہی بات کہتے ہیں جو حق ہوتی ہے لیکن ان کا لہجہ کڑوا نہیں ہوتا۔ اتنا سحر طراز ہوتا ہے کہ دل کے دریچے اس کے لیے کھل جاتے ہیں۔ ان کا انداز گفتگو کہیں بھی جارحانہ نہیں ہوتا۔ نہ اس میں تعریض اور طعن اور سب و شتم کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ اس لیے پڑھتے ہیں کہ حق کو تلاش کریں اور جب حق مل جاتا ہے تو اسے بے کم و کاست پیش کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے عقائد اور تصورات پڑھنے والے پر مسلط نہیں کرتے۔ وہ قاری کو اپنے ساتھ لے کر بزمِ تحقیق میں وارد ہوتے ہیں۔ اور یہاں آکر ایک طالب علم کی طرح سچائی کی جستجو کرتے ہیں۔ اور جب وہ مل جاتی ہے تو اسے قلم بند کر دیتے ہیں۔

مباحث اسلامیہ پر اب تک بہت سی کتابیں عربی اور دوسری زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں۔ لکھنے والے مستشرق بھی تھے اور مؤرخ بھی، اہل علم بھی اور صاحب دل بھی، ارباب

نظر بھی اور دانش وبینش کے حامل بھی۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ اور کوئی پہلو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی تحریروں نے طوفان بھی برپا کیا۔ اختلاف باہمی کی خلیج بھی وسیع کی۔ بحث وجدال اور نزاع فکر ونظر کا سروسامان بھی بہم پہنچایا۔ لیکن بات جہاں کی تھی وہیں رہی۔ اس ساری خامہ فرسائی کے باوجود کوئی ایسی تصنیف اب تک منظر عام پر نہیں آسکی تھی جس نے صحیح ترتیب اور نفسیاتی تجزیے کے ساتھ واقعات وحقائق قارئین کے سامنے پیش کر کے فیصلہ اُنہی سے کرایا ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی یہ کتاب اپنے موضوع اور اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے عجیب وغریب کتاب ہے۔ اگر میں یہ دعویٰ کروں تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ کتاب ہر اعتبار سے یکتا اور یگانہ ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دریا کوزے میں کس طرح بھرا جاسکتا ہے ؟ اور واقعات کو غیر جانبدارانہ لیکن مؤرخانہ کاوش کے ساتھ کس طرح ضبطِ تحریر میں لایا جاسکتا ہے؟

یہ کتاب ——— "یہ مختصر سی کتاب ——— ۱۴ سو برس کی تاریخِ اسلام کا نچوڑ ہے۔

یہ حروب وفتوحات کی تاریخ نہیں ہے

یہ کشور کشائی کی داستان جلال وجمال نہیں ہے۔

یہ نظم مملکت، راعی اور رعایا، مسلم اور غیر مسلم کے تعلقات ومراتب کی کہانی نہیں ہے۔

قصیدہ خوانی نہیں ہے

یہ مرثیہ نہیں ہے

یہ سب وشتم نہیں ہے۔

یہ حقائق کو مسخ کر کے اپنے تصورات وعقائد کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی ناکام نہیں ہے

یہ چھوٹی سی کتاب ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز، تحقیق کی پوری

شان کے ساتھ موجود ہے

نہ رنگ آرائی سے کام لیا گیا ہے نہ افترا پردازی سے ؛

نہ خطابت اور جوشِ کلام کو سہارا بنایا گیا ہے ۔ نہ جذبات سے اپیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

سیدھے سادھے الفاظ میں قافلۂ اسلام کی کہانی بیان کر دی گئی ہے ؛

یہ قافلہ کہاں سے چلا ؟ کہاں کہاں اس نے منزل کی ؟

کوچ کرتا، منزل بہ منزل قیام کرتا، دوستوں کو ساتھ لیتا، دشمنوں کا ساتھ چھوڑتا، حملے سہتا، وار روکتا، دفاع و مقاومت کے مرحلوں سے گزرتا، یہ کہاں کہاں پہنچا ؟

اب کہاں ہے ؟

اور اس آخری منزل سے اسے کس طرف جانا ہے ؟

اس کتاب میں تاریخی مباحث بھی ہیں، فلسفہ و کلام بھی، قرآن و سنت بھی، مذاہب اسلامیہ کے مختلف ادوار بھی ۔ مشاجرات صحابہ اور اختلافات بین المسلمین کی داستان بھی ۔ لیکن نہ کہیں تلخی ہے نہ اعلان جنگ و حرب ، بیان واقعہ ہے اور وہ بھی ایسے مدلّل، دل نشین اور فکر آفریں انداز میں کہ کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ۔

واقعات کی تحلیل اور ان کا تجزیہ اس خوبی سے کیا ہے کہ مصنف کی نیت پر حملہ کرنے کی کسی بدترین مخالف کو بھی جرأت نہیں ہو سکتی ۔ اس کی رائے سے مخالفت کرنے کی جرأت بھی بہ مشکل ہو سکتی ہے ۔ اور اس کے اخذ کیے ہوئے نتائج کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے ۔

اس کتاب میں قریش کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اور ان کے معتقدات سے ایک نئے انداز میں بحث کی گئی ہے ۔ میرا خیال ہے یہ چند صفحے لکھنے لیے ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ہزاروں صفحے پڑھے ہیں ۔

ان عنوانات پر ایجاز کے ساتھ، لیکن اس طرح کہ کوئی گوشہ نظر سے مخفی نہ رہے بحث کی ہے۔

اس کے بعد دعوتِ اسلام کی اساس و بنیاد، معراج اور کفار کے اعتراضات اور ان کا جواب پیش کیا ہے اور پڑھنے والا کہیں بھی تشنگی محسوس نہیں کرتا۔

ان مباحث سے گزرنے کے بعد ایک نہایت ہی اہم اور معرکہ آرا بحث آتی ہے یعنی

: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی
: قریش مکہ سے آویزش
: یہودیوں کی فریب کاری اور بدعہدی
: جنگ بدر
: غزوۂ احد
: معرکۂ خندق
: صلح حدیبیہ اور اس صلح کے شرائط
: منافقوں کی زشت کاری اور خباثتِ نفس۔

یہ سب بڑے اور اہم مسائل اور مباحث ہیں تفصیل کی جائے تو ہر عنوان ایک ایک کتاب کا طالب ہے لیکن مصنف علام نے ایک ہی باب میں —— ان سب چیزوں کو سمیٹ لیا ہے اور کہیں بھی بحث و نظر کا کوئی گوشہ ناتمام نہیں چھوڑا۔

یہودیوں اور مسلمانوں کے تعلقات کا مسئلہ بھی اپنے اندر بہت سے مضمرات رکھتا ہے۔ اور ان تمام مضمرات کو بڑے خوبی کے ساتھ مصنف نے واشگاف کیا ہے۔

نصاریٰ اور مسلمانوں کے تعلقات بھی اپنی جگہ پر غور طلب ہیں۔ ان تعلقات پر قرآن کریم کی روشنی میں مصنف علاّم نے گفت گو کی ہے۔

مسلمانوں میں سب سے زیادہ خطرناک طبقہ منافقین کا تھا۔

عربوں کے معتقدات پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لکھنے والے مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ ان کے علم اور پایۂ تحقیق سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سب نے تقریباً وہی باتیں لکھی ہیں، جو اصول موضوعہ کی طرح معروف اور مسلّم چلی آ رہی ہیں۔ ان کی بت پرستی، ان کی بربریت، اور سفاکی، ان کی تمدن بیزاری اور دیگر عادات قبیحہ و رذیلہ۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ان باتوں سے انکار نہیں کیا ہے۔ لیکن ان کی تحلیل و تجزی کرتے ہوئے جو نئے اور فکر آفریں پہلو پیش کئے ہیں وہ شاید پہلی مرتبہ صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوئے ہیں۔ اور اتنے توجہ طلب ہیں۔ کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان پر تفحص اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اہل یثرب اور ثقیف کے مابین مصنف علّام نے جو محاکمہ کیا ہے اور دونوں کے وضع و طریق پر جو روشنی ڈالی ہے وہ بھی ان کی مؤرخانہ ژرف نگاہی اور وسعت مطالعہ کی دلیل ہے۔

طائف اور یمن کے حالات اور وہاں کی حیات فردی و اجتماعی اور ان مقامات کے عادات و اطوار، اور یہاں کے باشندوں کے مزاج و خصائل پر جو روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ بھی تاریخ کا ایک نیا باب کھول دیتی ہے۔

یہ سب بیان کرنے کے بعد فاضل مصنف نے، عبدالمطلب، عبداللہ بن عبدالمطلب اور خدیجۃ الکبریٰ کے احوال و سوانح پر روشنی ڈالی ہے۔ اختصار، لیکن جامعیت کے ساتھ، ان گرامی قدر ہستیوں کا ایک دل آویز مرقع پیش کر دیا ہے۔

بعد ازاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی۔

: نزولِ وحی،

: تبلیغ و ارشاد،

: دعوتِ اسلام

: دورِ ابتلاء

: ہجرت

یہ اسلام کے مدعی تھے۔ لیکن اسلام ان کے قلب میں جاگزیں نہیں تھا۔ صرف زبان پر تھا۔ انہوں نے داعیٔ اسلام کو جو ذہنی اذیتیں دیں وہ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا اسے اوراقِ تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ کر لیا ہے۔

فاضل مصنف نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے بھی تاریخی واقعات اور روایات کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ لیکن بڑا زور اس بیان پر دیا ہے جو قرآن کریم میں منافقین کے اعمال زشت کے بارے میں موجود ہے۔ قرآن کی آیتوں کو جو منافقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس تسلسل اور ترتیب کے ساتھ مصنف نے پیش کیا ہے کہ ان کی مکمل تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ انہوں نے تخریبِ اسلام کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔ اور کس کس طرح ان کے شر سے اللہ نے مسلمانوں کو بچایا۔ اور محفوظ رکھا۔

اس کے بعد:

: قریش کی عہد شکنی
: فتح مکہ
: قبیلہ ہوازن سے جنگ اور عفو عام
: وفات کی پیش گوئی، وفات، مسلمانوں کا اضطراب
: انصار اور مہاجرین کا اختلاف
: بیعت خلافت
: مسیلمہ کذاب اور دوسرے مدعیان نبوت۔

ان تمام مسائل اور مباحث پر خوش اسلوبی کے ساتھ بحث کرتے ہوئے پہلے حصے کو ختم کر دیا ہے

کتاب کا دوسرا حصہ، پہلے حصے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ پہلا حصہ بطور تمہید کے سمجھنا چاہیے کہ اس کے بغیر دوسرے حصے کے مباحث کا فہم آسان نہ ہوتا۔

دوسرے حصے میں سب سے پہلے اسوہ نبویؐ پر بحث کی ہے۔

اس کے بعد قرآن، اعجاز قرآن، وجوہ اعجاز قرآن اور قرآن کے صفات و خصائص پر غایت درجہ دقت نظر کے ساتھ اور ایجاز کے بجائے "نسبتہ" اطناب سے گفتگو کی ہے

قرآن اور اس کے متعلقات پر فاضل مصنف نے جو کچھ فرمایا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآنیات پر اس فاضل جلیل کی نظر کتنی عمیق ہے۔

قرآن کے بعد سنت کی بحث آتی ہے اور یہ بھی اپنے مغز و معنیٰ کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ اس سلسلے میں سنت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر جو علمی بھی ہیں اور تحقیقی بھی ——— اور تاریخی بھی، کھل کر گفتگو کی ہے

اصولِ تصحیح حدیث پر بھی جامعیت کے ساتھ فاضل مصنف نے بحث کر کے تمام تشنہ پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے۔

روایت حدیث کے متعدد پہلوؤں کے ساتھ ساتھ درایت کا مسئلہ بھی لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روایت سے زیادہ درایت کی اہمیت ہے۔ اور اس اہمیت کو فاضل مصنف نے پورے طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے۔ مباحث کا آغاز کیا ہے اور کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچایا ہے۔

قرآن اور سنت کے تمام پہلوؤں کو زیر بحث لانے کے بعد خلافت راشدہ کے عہد پر ایک نظر ڈالی ہے۔ اور ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کی زندگی اور منہاج کو زیر بحث لائے ہیں خلفائے راشدین کی زندگی اور منہاج کو صرف تاریخی اعتبار سے زیر بحث نہیں لایا گیا ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں جس استدلال و استنباط سے کام لیا گیا ہے۔ واقعات کا جس طرح تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور ان سے جس طرح نتائج اخذ کئے ہیں۔ وہ بھی قابل غور چیز ہے

اس کے بعد ایک پل صراط سے زیادہ نازک اور اہم مسئلے پر مصنف محترم نے قلم اٹھایا ہے۔ یعنی مشاجرات صحابہ، اس سلسلے میں:

: اختلافِ صحابہ کا بیان

: جنگِ جمل اور اس کی تاریخ

: علیؓ اور معاویہؓ کے تعلقات اور ان کی نوعیّت

: خوارج کا وجود اور ان کی نشو و نما۔

: قتلِ علیؓ

ان مسائل پر اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ بحث کی ہے اور واقعات کا تجزیہ کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ایسے اختلافی اور نزاعی مسائل کو بھی اسی طرح سلجھایا جا سکتا ہے اس کے بعد دورِ معاویہ اور اس عہد کے مخترعات پر بحث کی ہے۔ یہ بحث بھی کافی و شافی ہے۔

اسلام میں فکری اعتقاد کی بنا پر جو فرقے پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ان کی تاریخ، ان کے عقائد اور ان کے منہاج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے:

: معتزلہ اور متکلمین کے معتقدات

: فلسفۂ یونان اور اس کے مؤثرات

: فتنۂ تاویل

: فرقۂ باطنیہ اور اس کے معتقدات

: تصوف

: رائے کا فتنہ

پر عالمانہ اور محققانہ گفتگو کی ہے۔ جو ایک عالم کے لیے بھی اتنی ہی مفید ہے جتنی ایک طالب علم کے لیے۔

فقہائے مدینہ اور فقہائے عراق کے اختلاف و اندازِ فکر پر بھی قابلیت کے ساتھ

روشنی ڈالی ہے۔

اس کے بعد!

: تعصب اور اس کے اثرات و نتائج

: رواداری، اور اسلام کے احکام ثابتہ

: استبداد، جو نتیجہ تھا اسلام کے راستے سے دور ہٹ جانے کا۔

: بغاوت، جو نتیجہ تھی استبداد کا۔

: تعدد خلفا جو نتیجہ تھا باہمی خلفشار کا۔

: علم وجہل، تقلید اور غلامی ——————!

اور ان سب کے باہمی روابط

: ذہنی اور عملی غلامی کے خلاف اقدام وعمل

پر گفتگو کرکے کتاب ختم کر دی ہے۔کتاب ختم کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تھوڑے سے صفحے پڑھ کر ہمارے مبلغ علم میں کتنا گراں بہا اضافہ ہوگیا ہے۔

طٰہٰ حسین کی زندگی کا یہ بہت بڑا اور عجیب انقلاب ہے

ایک زمانہ تھا کہ طٰہٰ حسین دہریت، الحاد اور حد سے بڑھی ہوئی روشن خیالی کے واسطے بدنام تھا علما نے اس کے خلاف کفر کے فتوے صادر کیے۔ علمی حلقوں نے اسے طعن واحتساب کا مستحق ردیا۔ وزارتِ تعلیمات کو مجبور کیا گیا کہ اسے یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے۔ حکومت پر دباؤ ڈالا گیا کہ اسے جلا وطن کر دیا جائے۔

طٰہٰ حسین نے مردانہ تیور کے ساتھ یہ وار سہے۔لیکن اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔ وہ اپنے اسلام کی سند کسی سے لینا اپنے ایمان واعتقاد کی توہین سمجھتا تھا۔اس کے خیالات خود اس کے تھے۔سوچے سمجھے، پچے لسے، مستعار نہ تھے۔ یہ اگر غلط تھے تو وہ خود ہی ان کی اصلاح کر سکتا تھا۔ اور صحیح تھے تو کسی کے اعتراض کی پروا کرنا اس کا شیوہ نہ تھا۔

دن گزرتے رہے اور طہٰ حسین تحقیق و تفحص کی منزلیں طے کرتا رہا۔

عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ بلکہ خواص بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد لوگ اسے بھول گئے کہ کبھی طہٰ حسین کا اسلام ما بہ النزاع رہ چکا تھا۔ ادب وانشار پر اس کی نئی نئی معرکہ آرا کتابیں منظرِ عام پر آتی رہیں۔ اور پھر دفعتہً ایک روز وہ ایک مردِ مومن کی طرح اپنے نتائجِ مطالعہ، مختلف کتابوں کی صورت میں لے کر اس طرح نوا ساماں ہوا جیسے کبوترِ بامِ حرم، اس کی نوا، اس کی صدا ایک مردِ مومن کی صدا بن گئی۔ اس نے مباحثِ اسلامیہ پر کئی کتابیں لکھیں۔ ہر کتاب اپنی معنویت کے لحاظ سے یکتا اور منفرد تھی۔ انہی کتابوں میں ایک یہ کتاب بھی ہے جس کا آپ مطالعہ کر رہے ہیں

رئیس احمد جعفری

۸۹۔ ٹیگور پارک .... لاہور

فہرست

حصّہ اوّل

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
	۱۔ عربوں کا عہد جاہلیت۔	۱
۲۶	یہودیت اور نصرانیت کا اثر ، شام و عراق میں داخلہ	
	۲۔ عرب جاہلیت کے شعراء۔	۲
۳۱	کیا عرب پڑوس کی متمدن قوموں سے متاثر ہوئے ؟	
	۳۔ بت پرستی	۳
۳۵	عقیدۂ توحید کے باوجود خود ساختہ خداؤں کی پرستش۔	
	۴۔ منفعت بخش بت پرستی	۴
۳۹	کیا قریش بت پرستی میں صادق نہ تھے ؟	
	۵۔ قریش کا نظم حکومت	۵

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
	حلفِ فضول کے اسباب و محرکات اور عوامل۔	۴۷
۶	۶۔ ثقیف اہل مکہ اور طائف کے تعلقات پر ایک نظر	۵۱
۷	۷۔ یثرب یہودیوں کے اثرات اوس وخزرج پر	۵۳
۸	۸۔ نظر بازگشت عربوں کے تعلقات یہودیوں اور نصرانیوں سے	۵۷
۹	۹۔ قریش کا مرد بزرگ "عبدالمطلب" ایک یتیم ولسیر بچے کی کہانی	۶۱
۱۰	۱۰۔ خدیجہ رض امین مکہ کی زندگی کا نیا دور	۶۹
۱۱	۱۱۔ نزول وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبلیغ وارشاد کی ہدایت۔	۷۳
۱۲	۱۲۔ دعوتِ اسلام۔ ابتلار کا دور، طائف کا سفر، ہجرت ۔ نئی زندگی	۷۸
۱۳	۱۳۔ ہجرت دعوتِ اسلام کی بنیاد و اساس، معراج، کفار کے اعتراضات کا جواب	۹۵
۱۴	۱۴۔ تاجدار یثرب قریش سے آویزش، یہودیوں کا دھوکا، بدر، احد اور خندق کی جنگ۔ صلح حدیبیہ، معاہدے کے شرائط، منافقوں کی زشت کاری۔	۱۱۱

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱۵	۱۵۔ مسلمان اور یہود	
	داعیٔ اسلام سے یہود کی دشمنی ۔ قرآن میں یہود کا ذکر	۱۳۱
۱۶	۱۶ ۔ مسلمان اور نصاریٰ	
	یہود اور نصاریٰ میں فرق، نجران کے عیسائیوں سے مباہلہ۔جنگ موتہ کا محرک	۱۴۱
۱۷	۱۷۔ مسلمان اور منافقین	
	منافقین کیطرف سے ایذارسانی، دروغ و فریب، غداری اور بے وفائی۔	
	منافقین کا مرقع آیاتِ قرآنی کی روشنی میں	۱۵۲
۱۸	۱۸۔ قریش کی عہد شکنی ۔ فتح مکہ ۔ ابوسفیان کو امان	
	ہوازن کے قبیلے سے جنگ، حلیمہ دائی کا رشتہ، عفو عام	
	وفات کی پیش گوئی۔ علامتِ وفات، مسلمانوں کا اضطراب	۱۷۶
۱۹	۱۹ مسئلہ خلافت	
	انصار اور مہاجرین کا اختلاف، بیعتِ ابوبکر، اہل بیت کا سکوت	۱۹۴
۲۰	۲۰۔ مرتدین سے جنگ	
	مسیلمہ کذاب اور دوسرے مدعیانِ نبوت سے مسلمانوں کی	۱۹۷

حصّہ دوم

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۲۱	۱۔ اسوہ حسنہ	
	قرآن کے مجمل کی تفصیل، قول سے یا عمل سے یا دونوں سے	۲۰۳
۲۲	۲۔ قرآن	
	اعجاز قرآن، وجوہ اعجاز قرآن، قرآن کے خصائص وصفات	

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
	قرآن کا انداز بیان۔ موضوعات، خصوصیات و ممیزات، تشریع و احکام	۲۰۹
۲۳	۳۔ سنت	
	قرآن کے بعد سنت نبوی احکام اسلام کی اصل ہے۔	۲۳۴
۲۴	۴۔ سنت نبوی ﷺ	
	ایمان۔ اسلام۔ احسان۔	۲۳۷
۲۵	۵۔ تعلیمات و بیان سنت	
	تطہیر اخلاق، تزکیہ روح، تنقیہ کردار	۲۴۶
۲۶	۶۔ سنت تادیب کے لیے	
	کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کا واقعہ	۲۵۱
۲۷	۷۔ قرآن اور حدیث	
	صحابہ کا طرز عمل، اصول تصحیح حدیث، قبول روایت میں احتیاط	۲۵۵
۲۸	۸۔ روایت حدیث میں اسراف	
	روایت کے ساتھ ساتھ درایت کی اہمیت	۲۵۷
۲۹	۹۔ جب زمین کا سلسلہ	
	آسمان سے قائم تھا اور جب منقطع ہوگیا۔	۲۶۰
۳۰	۱۰۔ دور ابوبکرؓ و عمرؓ	
	فتوحات اور کشور کشائی کا آغاز	۲۶۳
۳۱	۱۱۔ دور عثمانؓ	
	اضطراب، شورش اور بے اطمینانی کا آغاز	۲۶۸
۳۲	۱۲۔ عہد علیؓ	

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
	مشاجرات واختلافات صحابہ کا بیان اور ان کی کیفیت	
۳۳	۱۳ - جنگِ جمل	
	حضرت عائشہ صدیقہؓ میدانِ جنگ میں	۲۷۲
۳۴	۱۴ - علیؓ اور معاویہؓ	
	تاریخ اسلام کا ایک المناک باب	۲۷۵
۳۵	۱۵ - خوارج	
	تاریخ اسلام کا ایک عجیب وغریب	۲۷۸
۳۶	۱۶ - قتل علیؓ	
	خوارج کی سازش اور خونِ شہادت کے قطرے۔	۲۸۰
۳۷	۱۷ - دورِ معاویہ	
	استلحاق زیاد بن ربعیہ کی داستان	۲۸۲
۳۸	۱۸ - معتزلہ کی نمود	
	اختراع کئے ہوئے معتقدات، متکلمین کی عقلی توجیہات	۲۸۶
۳۹	۱۹ - معتزلہ	
	فکر ونظر میں کجی، اعتقاد میں غلو	۲۹۵
۴۰	۲۰ - معتزلہ کی انتہاپسندی	
	فلسفہ یونان سے سابقہ، ادیانِ غیر کے اثرات۔ عقل کی تحکیم	۲۹۷
۴۱	۲۱ - فتنۂ تاویل	
	دُور از کار اور لایعنی تاویلات کا دَور	۳۰۴
۴۲	۲۲ - باطنیہ	

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
	باطنی فرقے کے معتقدات و تصوراتِ دینی	۳۰۸
۴۳	۲۳ ۔ تصوف	
	کیا اسلام میں رواجی تصوف کی گنجائش ہے ؟	۳۱۰
۴۴	۲۴ ۔ "رائے" کا فتنہ	
	فقہائے مدینہ اور فقہائے عراق کا اختلاف فکر	۳۱۵
۴۵	۲۵ ۔ تعصّب	
	جس نے امتِ مسلمہ کی جڑیں ہلا دیں	۳۱۸
۴۶	۲۶ ۔ رواداری	
	جس کی اہمیت اسلام میں مسلّم ہے	۳۲۶
۴۷	۲۷ ۔ استبداد	
	مطلق العنان فرمانرواؤں کی قہرمانیت	۳۳۴
۴۸	۲۸ ۔ بغاوت	
	استبداد و قہرمانیت کی خوں آشامیوں کا ردّ عمل	۳۳۶
۴۹	۲۹ ۔ تعدّد خلفاء	
	افتراق بین المسلمین کی انتہا ۔	۳۴۰
۵۰	۳۰ ۔ علم و جہل	
	مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سبق آموز اور عبرت انگیز واقعہ	۳۴۵
۵۱	۳۱ ۔ تقلید	
	جہل اور سہل انگاری کی کرشمہ سازی	۳۵۰
۵۲	۳۲ ۔ غلامی	

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
	جہل اور تقلید کے نتائج بد	۳۵۸
۵۳	۳۳۔ بیداری	
	ذہنی اور عملی غلامی کے خلاف اقدام و عمل	۳۶۱
۵۴	۳۴۔ قدیم و جدید	
	دونوں کے ارتباط ہی سے بیڑا پار ہو سکتا ہے۔	۳۶۵

حصّۂ اوّل

(۱)

عربوں کا عہد جاہلیت

○

یہودیت اور نصرانیت کا اثر، شام و عراق میں داخلہ

چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں عرب قوم ان اقوام سے کہیں زیادہ پسماندہ تھی جو اس کے پڑوس میں بس رہی تھیں۔ البتہ جنوب میں عہد ماضی کی حضارت و ثقافت کے آثار باقیہ موجود تھے۔ اور خود اہل جنوب بھی اپنے ان احوال سے پورے طور پر آشنا نہیں تھے۔ ان کی معلومات جو کچھ بھی تھے وہ کہانی اور افسانے کے رنگ میں، جن پر حقیقت غالب تھی موجود تھے۔

حمیر اور ملوک حمیر، تبابعہ، سبا اور اذوار کے واقعات و احوال سے یہ آشنا تھے۔ ان سب میں اذوار اب تک اپنی رہی سہی شان و شوکت کے ساتھ موجود تھے۔ یہ بڑے بڑے قلعوں میں رہتے تھے۔ اور وہاں کے باشندوں پر حکومت کرتے تھے۔ اڑوس پڑوس کے لوگ بھی ان کے حلقۂ اطاعت میں داخل تھے۔ جنوب عرب اور بادیہ کے لوگ بھی ان کے زیر فرمان تھے

ساتھ ہی ساتھ ایسے قبائل بھی موجود تھے جو بالکل اجڈ تھے۔ یہ کسی کے سامنے سر جھکانا نہیں جانتے تھے۔ یہ صحرا میں ٹھیٹھ عرب کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جنوب میں بڑے بڑے اذ

چھوٹے چھوٹے شہر بھی موجود تھے۔ اور ان علاقوں میں حضارت کی جھلکیاں بھی موجود تھیں۔ لیکن بے اثر اور بے نتیجہ،

جنوبِ عرب کے علاقے میں خالص عربی تسلط نہیں تھا۔ اس کے ایک بہت بڑے حصے پر حبشیوں کی فرماں روائی تھی۔ عرب اتنی قدرت نہیں رکھتے تھے کہ انہیں نکال باہر کردیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر انہوں نے اہل فارس کی طرف استمداد کی نظروں سے دیکھا۔ اور اہل فارس نے مدد کی بھی، لیکن اس لیے نہیں کہ اس خالص عرب علاقے پر عرب حکومت کرنے لگیں۔ اور ان کا کھویا ہوا اختیار واقتدار پھر انہیں واپس مل جائے۔ بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے کہ یہ حبشیوں کی جگہ لے لیں۔ اور جو کچھ وہ کر رہے تھے یہ کرنے لگیں۔

جنوب عرب کے باشندوں تک دو مذہبوں کی دعوت بھی پہنچی ——— دین یہودی اور مسیحی، لیکن ان کی یہودیت اور مسیحیت بھی ان کی جہالت کے سانچے میں ڈھل گئی۔ جس پر بداوت کا غلبہ تھا۔

لیکن ان گوناگوں حالات وحوادث میں گھرے رہنے کے باوجود یہ بات بے تامل کہی جا سکتی ہے کہ جنوب عرب کے باشندے کسی مہیب خطرے سے دوچار نہیں تھے۔ جو زندگی بسر کر رہے تھے وہ بہرحال پوری امتِ عربیہ کے مقابلے میں، جو قلب جزیرۂ عرب اور شمال میں آباد تھی، کہیں بہتر، آسودہ تر اور سازگار تھی۔

جنوب عرب کاشتکاری اور زراعت سے بھی بہرہ مند تھے۔ ساتھ ہی ساتھ تجارت اور کاروبار سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے علاقے میں ہند کا مال آتا جاتا رہتا تھا۔ اسی طرح حبشہ اور فارس سے بھی درآمد برآمد جاری تھی۔ اس صورتِ حالات نے انہیں خوشحال اور فارغ البال بنا دیا تھا۔ ان کی زندگی میں وہ شدت اور غلظت نہیں تھی جو دوسرے علاقوں کے عرب باشندوں کا گویا طرۂ امتیاز تھی۔

دونوں آسمانی مذاہب ——— یہودیّت اور مسیحیّت ——— سے تاثر کا ایک

نتیجہ یہ بھی تھا کہ ان کے اندر باشندگان شمال کے مقابلے میں رقتِ قلب اور صفائی ضمیر کا جوہر بھی جھلکنے لگا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ عرب تہذیب یافتہ اور تمدن آشنا پڑوسی اقوام کے مقابلے میں بہت زیادہ پسماندہ تھے۔ ان کی آبادی کا غالب ترین حصہ ناخواندہ اور جاہل تھا۔ ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔

جنوب سے آگے بڑھ کر جب ہم قلب عرب ——— نجد ——— میں پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہاں زندگی اپنی پوری شدت، غلظت اور جہالت کے ساتھ موجود ملتی ہے۔ ان کے نظام قبائل کی بنیاد تمام تر عصبیت پر قائم تھی۔ کسی دوسری چیز سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔

اسی طرح تہامہ اور حجاز پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں کا حال بھی کسی درجے میں نجد سے بہتر نہیں تھا۔ اگرچہ حجاز میں ایسے علاقے موجود تھے جنہیں شہر اور قصبے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اور ان شہروں اور قصبوں کی آبادی اپنے گھروں کی مستقل مکین بھی تھی۔ بارش کی تلاش یا چارے کی جستجو میں اسے نقل مکانی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ لیکن تجارت اور کاروبار کا شوق ان لوگوں کو کشاں کشاں موسم سرما میں جنوب کی طرف اور موسم بہار میں شمال کی جانب لے جاتا تھا۔ جیسا کہ قرآن مجید نے قریش کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اہلِ طائف اور اہلِ یثرب زراعت اور کاشتکاری سے بہرہ ور تھے۔ لیکن جس طرح ان کی زندگی زراعت پر قائم تھی، اسی طرح تجارت پر بھی تھی۔ اور مکہ کی زندگی جہاں تجارت پر قائم تھی وہاں حج پر بھی قائم تھی۔ موسم حج میں جزیرۂ عرب کے دور و دراز علاقوں سے لوگ ٹولیاں بنا کر جتھوں کی صورت میں وارد ہوا کرتے تھے۔ یہاں آکر یہ لوگ جہاں دینی فرائض انجام دیتے تھے وہاں ان کی موجودگی نت نئی تجارتی سرگرمیوں کی بھی مظہر ہوا کرتی تھی۔

عرب کے شہروں اور قصبوں کے اردگرد بادیہ کے علاقے تھے جہاں زندگی یکسر تعب،

سختی، شدت اور قسارت سے عبارت تھی۔ یہ لوگ چراگاہوں کی تلاش میں مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ ان میں جھگڑے ٹنٹے بھی رُونما ہُوا کرتے تھے۔ قبائل کے مابین عصبیت کی چنگاریاں سُلگا کرتی تھیں، جو غارت گری، جنگ اور مقاتلے کی صورت میں نمودار ہوتی رہتی تھیں۔ شہروں اور قصبوں کے لوگ بھی اس عصبیت سے بَری نہیں تھے۔ نہ ان کی زندگی اتنی متمدّن اور مہذّب تھی جتنی ان الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے۔ بلاشبہ عصبیت کو ان کے ہاں قوامِ حیات کی صورت اور حیثیت حاصل تھی۔ ان کی زندگی میں بھی وہی خصائص موجود تھے جو اہلِ بادیہ کے تھے۔ ان میں بھی خصومات اور مناقشات برپا ہوا کرتے تھے۔ اور جنگ و پیکار کی آگ بھڑکا کرتی تھی۔

دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ طبائع اور خصائل، مزاج اور عادات، فطرت اور سرشت کے اعتبار سے اہلِ بادیہ اور اہلِ مدن کے مابین کوئی خاص فرق نہ تھا۔ تنگ دلی، بداخلاقی اور دوسرے سیئات و رذائل دونوں میں مشترک تھے۔ فرق اگر تھا تو صرف غربت اور امارت کا، یہ مٹھی بھر دولت مند لوگ اپنے ہم جنسوں پر پوری سفاکی، بہیمیت اور سختی و درشتی کے ساتھ حکومت کر رہے تھے۔ شمالی حجاز میں یہودیت کے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ کیوں اور کیسے؟ اس راز کی گرہ کشائی تاریخ نہیں کرتی۔ یثرب کے اندر اوس و خزرج کے اطراف میں یہودی قبائل موجود تھے۔ اسی طرح خیبر میں بھی وہ غالب اور متصرف تھے۔ اور یہ یہودی قبائل بھی وہی زندگی بسر کر رہے تھے جو دوسرے غیر یہودی عربوں کی تھی یعنی تہذیب سے ناآشنا اور اجڈپن سے بھرپور۔

حجاز میں یہودیوں کی آبادی کا بھی غالب ترین حصہ دوسرے عربوں کی طرح ناخواندہ اور جاہل تھا۔ یہ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے۔ البتہ ان کے احبار خود نوشت و خواند سے واقف تھے، لیکن احبار کا بھی یہ حال تھا کہ ان کے دامن میں علم کی پونجی اتنی نہیں تھی جتنی جہل کی، بہت کم احبار ایسے تھے جو صحیح طور پر اپنے دین کا علم رکھتے تھے۔ جب ان کا یہ حال

تھا تو باقی یہودیوں کی حالت کا اندازہ لگا لینا کیا مشکل ہے ؟

آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ قرآن کریم نے حجاز کے یہودیوں کی دینی جہالت اور پسماندگی کو کس طرح واشگاف فرمایا ہے۔ یہ بات تحقیقی طور پر اب تک نہیں معلوم ہو سکی کہ بعض عربی قبائل اطرافِ شام اور اطرافِ عراق میں کب اور کس طرح پہنچے ؟

لیکن یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس عہد میں عربوں کے قدم جزیرۂ عرب سے باہر نکل چکے تھے۔ وہ شمال میں شام کی طرف بڑھ چکے تھے۔ اور وہاں کے بعض علاقوں میں آباد بھی ہو چکے تھے۔ اسی طرح مشرق میں عراق اور جزیرے کی طرف پہنچ چکے تھے۔ ان مقامات پر عیسائیت غالب تھی۔ لیکن عیسائیت کا بھی حال یہ تھا کہ اس کے اربابِ دین اس کے حقائق سے بے بہرہ اور نا واقف تھے۔ وہ صرف مظاہر اور صورت پر جان دیتے تھے۔

بازنطینی شہنشاہیت نے شام کے عربوں کو اپنے حدود مملکت اور جزیرۂ عرب کے مابین پاسبان بنا دیا، ان پر انعامات اور مناصب کی بارش کی۔ ان کے دامن کو مال و زر سے بھر دیا۔ ان کے لوگوں کو بادشاہت اور سرداری عطا کی۔ اسی طرح ایرانی شہنشاہیت نے بھی ان عربوں کو نوازا جو عراق میں بسے ہوئے تھے۔ اپنے حدود مملکت اور جزیرۂ عربیہ کے مابین انہیں نگہداری سونپی اور بعض کو بادشاہ بنایا اور سرداری عطا کی۔

۲

عرب جاہلیت کے شُعراء

کیا عرب پڑوس کی متمدن قوموں سے متاثر ہوئے؟

شام و عراق میں عربوں نے دینِ عیسوی سے تعارف حاصل کیا۔ بلکہ شاید یہ بھی غلط نہیں کہ مکے میں بھی انہوں نے کسی نہ کسی حد تک مسیحیت کو پایا۔ اور طائف میں بھی اس سے آشنا ہوئے۔ کچھ تجارت اور کاروبار کے باعث، کچھ ان غلاموں کی وجہ سے جو وہاں پہنچا کرتے تھے اور زیادہ تر ان لوگوں کے سبب جو تجارت اور کاروبار کے سلسلے میں مکے پہنچے اور وہیں رہ پڑے۔ اسی طرح عربوں نے مسیحیت سے شناسائی جنوب کی طرف شہر نجران میں حاصل کی جہاں ان کی کمان چڑھی آتی تھی۔ اور وہ من مانی کاروائیاں سرانجام دینے میں کسی زیادتی اور جفاکاری سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ یہودیت کا جہاں تک تعلق ہے وہ جزیرۂ عرب کے شمال و جنوب میں اپنے قدم جمائے ہوئے تھی۔

یہ کہنا قطعاً درست نہیں ہو گا کہ اس زمانے میں عرب بالکل الگ تھلگ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور پڑوس کی تمدن آشنا اور مہذب اقوام کے احوال و مقامات سے یکسر ناآشنا اور ناواقف تھے۔ کیونکہ یہودیت اور مسیحیت کا نزول جنوبی اور شمالی عرب میں

آسمان سے نہیں ہوا تھا۔ اس سرزمین پر ان مذاہب کا وجود اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ عرب پڑوس کی مہذب اور متمدن اقوام سے ربط و تعلق رکھتے تھے۔

یہ بات بھی شک و شبہ سے بالا ہے کہ کچھ ایسے عرب بھی تھے جو ایران سے متصل اقامت گزیں تھے اور مملکت ایران کے جلال اور دبدبے سے مرعوب و متاثر تھے چنانچہ انہوں نے ایران کی مجوسیت سے راہ و رسم پیدا کی اور بعض نے مجوسی دین بھی قبول کر لیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نجد و تہامہ اور حجاز کے اہل بادیہ یکسر دوسری اقوام اور مقامات سے بے تعلق تھے۔ اور ان سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ وہ سب سے الگ تھلگ زندگی بسر کر رہے تھے جو عبارت تھی سنگ دلی، جفاکاری، شدت اور غلظت سے۔ لیکن یہ دعوٰی بھی ایسا نہیں ہے۔ جسے پورے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ان اہل بادیہ میں ایسے شعراء پیدا ہوئے اور ابھرے جو سخن سرائی کرتے ہوئے شام اور عراق کے عرب خطوں تک پہنچے۔ وہاں کے بادشاہوں اور سرداروں سے مال و زر اور انعامات کی صورت میں خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اور اس کے بعد پھر اپنے بادیئے میں واپس پہنچ گئے۔ اور یہاں آ کر انہوں نے وہ داستانیں بیان کیں جو شام و عراق کے مشاہداتِ سفر سے تعلق رکھتی تھیں۔

پڑوس کی قوموں اور اعرابِ بادیہ کے مابین جو تجارتی اور کاروباری ربط و صلہ تھا وہ اس کا سزاوار تھا کہ فارس، روم اور حبش کے بارے میں عربوں کے معلومات خاصے وسیع ہوتے اور واقعتہً ایسا تھا بھی۔ چنانچہ قریش کے جو افراد مذہب مسیحی میں داخل ہوئے۔ ان میں ورقہ بن نوفل اور زید بن عمرو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں اس عہد کے شعراء کے کلام میں بھی ہمیں ایسے اشارات اور استعارات ملتے ہیں جو اس حقیقت پر دال ہیں کہ یہ یہودیت اور مسیحیت کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ مثلاً نابغہ ذبیانی زہیر، اعشیٰ اور امیہ بن ابی الصلت وغیرہ کے اشعار اس دعوے کے بہترین شاہد ہیں۔ اور

امیہ بن ابی الصلت کے بارے میں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

"امیّہ بن ابی الصلت قریب تھا کہ مسلمان ہو جاتا۔"

بلکہ ہم تو ایک قدم اور بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صرف یہی نہیں کہ یہ شعراء یہودیت اور مسیحیت سے واقف تھے۔ بلکہ ان کے کلام ——— اگر اس کی نسبت ان کی طرف صحیح ہے ——— سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ پڑوس کی مہذب اور متمدن قوموں اور ملتوں کے اندازِ حیات اور طورِ زندگی سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اشعار میں ان قوموں کی مجالس لہو و لعب، بزم نا ؤ و نوش اور محفل نغمہ و سرود کا ذکر بھی کیا ہے

ان حقائق کی روشنی میں یہ خیال کہ عرب ایک عزلت گزیں قوم تھے، یکسر باطل اور قطعاً ناقابلِ قبول ہے نہ یہ بات دل کو لگتی ہے نہ اسے کسی طرح بھی باور کیا جا سکتا ہے۔

البتہ یہ صحیح اور درست ہے کہ عرب کا وسطی اور شمالی حصہ کسی مہذب اور متمدن ملت کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا۔ اس نے اپنی آزادی اور حریت کو ہر حالت میں قائم رکھا۔ جہاں تک بھی ممکن ہو سکا اور جس حد تک بھی بس چلا اس علاقے کے لوگوں نے اپنی آن اور اپنی انفرادیت قائم اور باقی رکھی۔ اسے کسی دوسری قوم کے قبضے میں نہیں جانے دیا۔ یہ لوگ وہی زندگی بسر کرتے رہے جو بسر کرتے آئے تھے۔ یعنی سخت کوشی کی زندگی جس میں سختی تھی، درشتی تھی، شدت تھی، غلظت تھی۔ اس زندگی تک کوئی حضارت نہیں پہنچ سکی، البتہ اس کے اطراف و جوانب تک ضرور کسی نہ کسی حد تک پہنچی پھر بھی ان کی جاہلیت اپنے جملہ معاصی، شرور اور منکرات کے ساتھ ان پر غالب اور مسلط رہی۔

○

عربوں کا دین و مذہب

داخلی اور خارجی محرکات و مؤثرات

(۳)

بُت پرستی

عقیدۂ توحید کے باوجود خود ساختہ خداؤں کی پرستش،

جس طرح ان عربوں کی زندگی شدید اور غلیظ تھی، اسی طرح ان کا دین بھی تھا۔ اور یہ دین تھا وثنیت، یعنی بت پرستی۔ اس میں سادگی بھی تھی اور غلظت بھی۔ اس دین کو انہوں نے تفکر سے نہیں حاصل کیا تھا اور نہ صحیح معنیٰ میں یہ ان کے قلوب میں ممزوج تھا، یہ انہیں وراثت میں ملا تھا۔ جو سلف سے خلف تک منتقل ہوتا آ رہا تھا۔ اس میں انہوں نے کسی طرح کا تغیر اور تبدل نہیں کیا تھا۔ اور اگر کوئی ایسی جرأت کرنا چاہتا تھا تو یہ اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ قریش نے زید بن عمرو کے ساتھ بدسلوکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب اس دین کے خلاف انہوں نے بیزاری کا اظہار کیا تھا۔

اس دین بت پرستی کی اگر ہم تحلیل کریں تو محسوس ہو گا کہ عرب جس دین پر عامل تھے۔ اس میں تفقہ اور تعمق کو دخل نہیں تھا۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بت پرستی کے باوجود یہ اس کے منکر نہیں تھے بلکہ زمین و آسمان اور کائنات کا خالق یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو تسلیم کرتے تھے، جیسا کہ خدائے عزوجل فرماتا ہے :-

ولئن سألتهم من خلق السمٰوٰت والارض ليقولن الله۔ | یعنی اگر تم ان سے سوال کرو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے ؟ تو بلاشبہ یہ کہیں گے ، "اللہ" !

یا جیسا کہ لبید کا یہ شعر ہے ـ جس کے بارے میں بخاری و مسلم کی روایت ہے ـ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے بہت پسند فرماتے تھے ـ

الا کل شیء ماخلا الله باطل
وكل نعيم لا محالة زائل

یعنی :

خبردار ، (یاد رکھو) اللہ کے سوا جو کچھ ہے باطل ہے ۔

اور ہر نعیم و راحت کو بہرحال زائل ہونا ہے ۔

لیکن اللہ تعالیٰ کے وجود کا علم ان عربوں کو سادگی کے ساتھ تھا ۔ یہ علم ان کے قلب کی گہرائیوں تک نہیں پہنچا تھا نہ اس نے ان کے ضمیر کے نشیمن میں جگہ بنائی تھی ۔ نہ یہ ان کے نفوس کے ساتھ ممزوج تھا ۔ چنانچہ انہوں نے ایسے خدا بنا لیے تھے جو ان سے قریب تھے ، جنہیں یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے اور ہاتھ سے چھو سکتے تھے ۔ بلکہ ان میں سے اکثر تو وہ تھے جو خود اپنے ہاتھوں سے ان خداؤں کو تراشتے اور بناتے تھے ، جیسے پتھروں کے ترشے ہوئے اور لکڑی کے گھڑے ہوئے بُت یا مثلاً وہ درخت جن کی یہ تعظیم کرتے اور جن کے سایے سے فائدہ اٹھاتے تھے

صرف اتنا ہی نہیں ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ یہ زمین جس پر یہ رہ رہے اور بس رہے ہیں صرف انہی سے معمور نہیں ہے ، بلکہ ان کے ساتھ ایک اور کائنات بھی ہے جو یہاں آباد ہے ، یہ زندگی سے بھرپور ہے اور قوت و طاقت میں ان سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے ۔ ایسی کائنات جسے یہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے ۔ لیکن گوش آشنا ضرور ہیں ۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اس کائنات مخفی و مستور کے آثار و علامات دیکھ سکتے ہیں اور دیکھتے ہیں یہ کائنات ان کے خداؤں کے ساتھ مخلوط

ہے اور اس کے ہاتھوں بڑے بڑے حوادث وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کائنات کی ہستیاں بعض افراد میں پیوست ہو جاتی ہیں اور ان کی زبان سے بولنے لگتی ہیں۔ اور ایسی خبریں دیتی ہیں جو واقع ہو چکیں یا واقع ہونے والی ہیں۔ یہ کائنات ہے جنوں کی، جنوں کی اس کائنات کو لوگ نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن وہ ان کی کارگزاریوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

ان لوگوں کا یہ اعتقاد تھا کہ جن خداؤں کو خود اپنے ہاتھوں بنا کر انہوں سے پوجنا شروع کیا ہے یہ بذاتِ خود کسی چیز کے خالق نہیں ہیں نہ کسی چیز کو انہوں نے بنایا ہے لیکن یہ واسطہ ضرور ہیں۔ مخلوق اور خدائے اعظم کے درمیان، جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، جو تدبیر امور کرتا ہے۔ پس یہ لوگ ان خود ساختہ خداؤں کی پرستش یہ سمجھ کر نہیں کرتے تھے کہ یہ نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ بلکہ اس لیے پوجتے تھے کہ اللہ کے حضور میں ان کی شفاعت کر سکتے تھے اور اس طرح یہ ان کے واسطے سے اللہ کی قربت حاصل کر سکتے تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

بلاشبہ یہ مشرک تھے لیکن اللہ سے برسرِ جنگ نہیں تھے۔ یہ صرف خدائے واحد کو نہیں مانتے تھے۔ بلکہ دوسرے خداؤں (بتوں) کو بھی مانتے تھے کہ وہ خالق اور مخلوق کے مابین واسطے کا کام دیتے تھے۔

صدیاں گذر گئیں اور بت پرستی اسی نہج پر جاری رہی۔ پھر مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اور بہت سے خرافات اور سخافات اس بندگی میں داخل ہوتے گئے۔ جب یہ اپنے ان معبودوں کے تقرب سے سرفراز ہوتے تھے تو اس توقع کے ساتھ کہ یہ اللہ کے حضور میں ان کی شفاعت کریں گے۔ اپنے اکثر امور میں یہ ان سے صلاح مانگتے اور پانسے پھینک کر ان کی رضا کے طالب ہوتے۔ اگر بات پوری ہو جاتی تو یہ اپنے معبودوں سے خوش ہو جاتے، ورنہ بگڑ بیٹھتے، یہ سوچے بغیر کہ یہ بت انہیں راضی رکھنے اور مایوس کرنے کی طاقت سے محروم ہیں یہ اپنے ان خداؤں سے مدد کے بھی طالب ہوتے تھے۔ اگر ان کی خواہش پوری ہو جاتی، تو

باچھیں کھل جائیں اور سمجھ لیتے کہ بتوں نے ان کی سُن لی اور مراد پوری کر دی، بصورتِ دیگر یہ رنجیدہ ہو جاتے اور خیال کرتے کہ ان کی مراد پوری نہیں ہوئی اور بتوں نے ان کی مدد نہیں کی۔

اس طرح اس وثنیت یعنی بت پرستی کی سادگی کا جہاں تک تعلق تھا انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور جہاں تک لغویت کا تعلق تھا، وہ بھی اپنی آخری حد پر نظر آتی تھی۔

ان بت پرست عربوں نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ بعد از مرگ کیا ہوگا؟ بلکہ ان کا خیال تھا کہ جو زندگی اس زمین پر بسر کر رہے ہیں یہ اصل زندگی ہے اور بت ان کے اور خدا کے درمیان واسطہ ہیں۔ جب ان میں سے کوئی مرتا ہے تو وہ اپنی راہ چلا جاتا ہے اور جو پیدا ہوتا ہے وہ مرنے والے کے دین اور افکار و آراء دربارۂ خلق ارض و سما کا وارث ہوتا ہے۔ اور یہ خود ساختہ خدا طلب خیر کی آرزو میں اللہ تعالیٰ سے ان کی سفارش کر کے ممد و معاون ہوتے ہیں اور جس شر اور مکروہ سے یہ خائف ہوتے ہیں وہ بتوں کی سعی و سفارش سے دور ہو جایا کرتا ہے

ان بت پرست عربوں کی خاصی بڑی تعداد عیسائیوں اور یہودیوں کے پاس اٹھتی بیٹھتی تھی۔ ان کی سنتی تھی اور اپنی کہتی تھی۔ شئون و مسائلِ حیات میں ان سے معاملت رکھتی تھی لیکن بایں ہمہ کیا مجال ہے جو اپنے دین و مذہب کے خلاف ذرا بھی تاثر قبول کرتی ہو۔

(۴)

منفعت بخش بُت پرستی

کیا قریش بت پرستی میں صادق نہ تھے؟

بہر حال یہ بات ہم بغیر کسی شک و شبہے کے کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ مکہ کا جہاں تک تعلق تھا۔ ان کی بت پرستی نہ صادق تھی نہ خالص۔ یہ ان کا ذریعہ تجارت تھی، بالکل اسی طرح جیسے یہ اس مال کی تجارت کرتے تھے جسے یہ جنوب اور جزیرۂ عربیہ کے اطراف سے لاکر جمع کرتے تھے تاکہ اسے خطۂ ارض کے ان مقامات تک منتقل کردیں جو ان چیزوں کے زیادہ ضرورت مند اور محتاج تھے۔ یہ اہلِ مکہ زیادہ پاک دل تھے۔ ان کے نفوذِ بصیرت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مختلف قریات و مدن میں (جہاں یہ تجارت اور کاروبار کے سلسلے میں جایا کرتے تھے۔) زندگی کی جو رنگارنگی کارفرما تھی اس سے بخوبی ممارست رکھتے تھے۔ تجارت اور کاروبار سے ممارست کے باعث شام و مصر، عراق اور بلادِ فارس کی مہذب و متمدن اقوام و ملل سے بھی یہ ربط و صلہ رکھتے تھے۔ یہ ان قوموں اور ملتوں کے دین و مذہب کی کارفرمائی کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے جو زندگی اور دین کے دائروں میں جاری و ساری تھی۔ پس یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ یہ ان خرافات پر سچے دل سے ایمان و اعتقاد رکھتے جن کے بُت پرست عام طور پر

قائل تھے۔

پھر ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیئے۔ کہ کعبہ ان کے مابین موجود تھا۔ اور عرب اس کعبہ کے حج کے لیے جزیرہ عرب کے تمام اقطاع و اطراف سے جوق درجوق آیا کرتے تھے۔ یہ لوگ مکے میں صرف حج کرنے نہیں آتے تھے۔ بلکہ حج کے ساتھ ساتھ تجارت بھی ان کے پیشِ نظر ہوتی تھی۔ جس کے مواقع ان میلوں میں بہت زیادہ تھے، جو ہر سال آس پاس کے علاقوں میں ہوا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ باشندگانِ مکہ بتوں کی پرستش اور تعظیم کا اظہار محض اس لیے کیا کرتے تھے کہ عربوں کو حج کی طرف راغب کیا جائے اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اور جب ہم قریش کی اس زندگی پر نظر ڈالتے ہیں جو اسلام سے پہلے اور بعثت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تھی تو بہت واضح اور نمایاں طور پر یہ حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے کہ یہ لوگ نہ اہلِ ایمان تھے نہ اصحابِ دین، یہ سب سے پہلے تاجر تھے جس کی تگ و دو میں سارا سال صرف کردیتے تھے۔ ان کے قافلے مالِ تجارت فراہم کرنے کے لیے لگاتار سفر کرتے رہتے تھے۔ پھر لدے پھندے واپس آتے تھے۔ پھر کچھ عرصے تک مکے میں دم لیتے اور ستاتے تھے۔ بعدازاں یہ مالِ تجارت لے کر آفاق میں پھیل جاتے تھے۔ یہ اپنی تجارت پر کسی چیز کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ مال جمع کرنے کی فکر و تدبیر کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ مالِ تجارت فراہم کرنے کے لیے یہ اپنے وطن کے دولت مندوں، سفید پوشوں اور غریبوں، سب سے روپیہ بٹورتے تھے۔ پھر اسے فروخت کر کے دوسرا سامان خریدتے تھے اور اسے جزیرۂ عربیہ میں فروخت کردیتے تھے۔ اور اس کاروبار اور الٹ پھیر سے جو نفع ہوتا تھا اسے ان لوگوں میں تقسیم کردیتے تھے جن سے روپیہ حاصل کیا تھا۔ گویا یہ اپنا پورا سال اخذ و عطا اور انتقال و استقرار میں گذار دیتے تھے۔ ایک دوسرے سے جب مڈبھیڑ ہوتی تو موضوعِ گفت گو بس مال و تجارت تک محدود رہتا اور جب اکیلے ہوتے تو بھی ذہن و دماغ میں جو خیال گردش کرتا رہتا

وہ بھی صرف یہی ہوتا۔ اور جب لوگ صرف مال و دولت کی حرص میں مبتلا ہو جائیں اور اپنی تمام کوششیں اور صلاحیتیں مال جمع کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں صرف کر دیں تو وہ دوسری تمام چیزوں کی طرف سے بے نیاز اور بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ کاروبار ہی انکا معبود ہوتا ہے جس کی بلا شرکت غیرے یہ پرستش کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مال و دولت کی حرص قلب انسانی کے لیے ایک فتنہ ہے۔ جو ہر چیز کو فاسد کر دیتا اور ہر بھلائی سے دور کر دیتا ہے اور عہد زیر بحث میں قریش کی بالکل یہی کیفیت تھی۔ ان کا دین و ایمان مال اور صرف مال تھا۔ دُھن تھی تو بس اس کی کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ مال جمع ہو؟ کیونکر زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے؟ اور اس اثنا میں زندگی کے طیبات اور خبائث جو کچھ بھی اور جتنے بھی سامنے آجائیں ان سے بہرہ ور ہوا جائے۔ پس قریش دولت مندی کے جویا تھے۔ دولت جو جتنی بھی زیادہ سے زیادہ حاصل ہو سکے۔ اور تسلط کے طلبگار تھے۔ بشرطیکہ ان کی دولت کو زوال نہ آئے۔

اگر عہد زیر بحث کے مکے کا آپ تصور کرنا چاہتے ہیں تو چشم تصور کے سامنے فینقی شہروں میں سے کسی شہر کو لائیے جہاں کے باشندے تجارت اور مال کے سوا ہر چیز سے مستغنی اور بے پروا تھے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیجئے کہ فینقی شہروں میں کوئی شہر بھی ایسا نہیں تھا جہاں کوئی ایسا مرکز ہو جس کی طرف اطراف واکناف سے لوگ کشاں کشاں اور جوق در جوق چلے آرہے ہوں۔ جیسا کہ مکے میں کعبہ تھا ——!

عہد زیر بحث کے باشندگان مکہ کو تین طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) :۔

ایک طبقہ تو وہ تھا جسے سارے حقوق حاصل تھے۔ یہ قریش کا قبیلہ تھا۔ قریش کے حقوق کی بنیاد ایک تو ان کے شرف نسب پر تھی۔ دوسرے اس بات پر کہ وہ کعبے کے نگہدار اور پاسبان تھے۔ اور یہ طبقۂ اعلیٰ تین گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔

نہیں ہو سکتا تھا جو قریش کو حاصل تھے۔

(۳) :-

تیسرا طبقہ تھا غلاموں کا، یہ طبقہ جملہ حقوق سے محروم تھا۔ حتیٰ کہ اسے خود اپنی ذات، اپنے وجود اور اپنی ہستی تک پر کسی طرح کا حق نہیں تھا۔ اس کا مالک اس کا آقا تھا۔ اور یہ ملکیت بالکل اسی طرح کی تھی جیسے کسی کو اپنے گھر کے ساز و سامان پر مالکانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ آقا اپنے غلام سے اپنی مرضی کے مطابق ہر کام لے سکتا تھا۔ غلام کو حق نہ تھا کہ انکار کرے یا اعتراض کرے۔ اس کا کام صرف سمع و طاعت تھا، حکم کا سننا اور آنکھ بند کر کے بے چون و چرا اس کی تعمیل کرنا۔ آقا کو اس بات کا اختیار حاصل تھا کہ جب چاہے غلام کو بندِ غلامی سے آزاد کر دے، بالکل اسی طرح جیسے اسے یہ حق تھا کہ غلام کو فروخت کر دے یا ہبہ کر دے، جس طرح اسے یہ حق تھا کہ غلام کو جیسی لرزہ خیز سزا چاہے دے اور جیسا سخت کام چاہے لے۔ غرض آقا اپنے غلام کی زندگی اور موت دونوں کا مالک تھا ——— لیکن قریش اس حق کے استعمال میں زیادہ غلو سے کام نہیں لیتے تھے۔

ان تینوں طبقات کے ساتھ ساتھ جو مکے میں زندگی بسر کر رہے تھے ایک چھوٹا سا طبقہ اور تھا جو دنیا کے مختلف علاقوں کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ عرب نہ تھے عجم تھے۔ اور امم مختلفہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ بھی تاجر تھے اور طبقۂ امراء اور طبقۂ متوسط کی ضروریات کا سر و سامان بہم پہنچاتے تھے۔ ان میں سے بعض لہو و لعب کا کاروبار کرتے تھے۔ مثلاً شراب پلانا، گانا سنانا اور نوجوانانِ قریش کے لیے ایسی دلچسپیاں فراہم کرنا۔ عرب لوگوں میں جن کا بند و بست آسان نہیں تھا، ان میں سے بعض روپیہ کے لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔

یہ اجانب یعنی غیر ملکی لوگ امن و آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان سے کسی طرح

۱:۔ گروہ امراد، جن کی دولت و ثروت بے حساب اور بے اندازہ تھی۔

۲:۔ جماعتِ سوداگران، یہ وہ لوگ تھے جو اپنے مال کو تجارت میں صرف کرتے تھے۔ عام اس سے کہ خود مال تجارت لے کر سفر کرتے ہوں۔ یا دوسروں کو اپنا مال دے کر شریکِ تجارت ہو جاتے ہوں۔

۳:۔ زمرۂ کارکن، یہ وہ لوگ تھے جو کم بضاعت تھے لیکن تجارت میں لگے رہتے تھے۔ زندگی بسر کرنے کے لیے انہیں مسلسل مصروفِ کار رہنا پڑتا تھا۔

قریش کے تینوں گروہ شرف و عظمت اور استمتاع حقوق میں مساوی تھے یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار سادات اور سرداروں کے طبقے میں ہوتا تھا۔

(۲) :۔

اس پہلے طبقے کے بعد دوسرا طبقہ "حلفاء" کا تھا۔ یہ عرب نسل اور عرب قومیت کے لوگ تھے اور مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے لیکن اختلاف قبائل کے باوجود مکے میں حصولِ امن و امان کے لیے آبسے تھے۔ کیونکہ یہ شہر دار الحرم تھا۔ جس نے یہاں پناہ لے لی وہ مامون ہو گیا۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجرم اور گنہگار اور اپنی قوم کا مغضوب و مقہور کیوں نہ ہو ——!

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو قریش کی دولت مندی اور ثروت کے چرچے سن کر اور مکے کی حیات آسودہ سے متاثر ہو کر یہاں تلاش روزگار اور حصول رزق کی امید میں آگئے تھے

اس طرح کے لوگوں کو مکے میں امن و عافیت کی نعمت اس وقت تک نہیں مل سکتی تھی جب تک یہ قریش کے قبائل میں سے کسی قبیلے یا افرادِ قریش میں سے کسی فرد کے حلیف نہ بن جائیں۔ اگر یہ حلیف ہو جاتے اور جوار کا حق ادا کرتے رہتے تو قریش انہیں اپنی پناہ میں لے لیتے تھے۔ پھر انہیں امن حاصل ہو جاتا تھا۔ یہ آزاد تھے اور پوری یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ حصولِ رزق کی جدّ و جہد میں مصروف رہ سکتے تھے لیکن بہر حال یہ قریش نہیں تھے یہ ایک فروتر اور پسماندہ طبقہ تھا۔ جو قریش کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اور ان حقوق میں شریک

کا تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کی اکثریت عیسائیوں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ بلاد روم سے آئے تھے۔ یہ اپنے بلاد کے واقعات قریش کو سناکر اس اعتبار سے انہیں نفع پہنچاتے تھے کہ یہ باتیں سن سن کر ان کا جذبۂ تجارت تیز ہوتا تھا اور نفع و کاروبار کے دروازے ان کے لیے کھل جاتے تھے۔

غرض عہد زیر بحث میں یہ تھا مکے کا حال اور ماحول جس میں وہاں کے باشندے اختلاف طبقات و منازل و اجناس کے باوجود زندگی بسر کر رہے تھے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ غلاموں کی اکثریت عرب نہیں تھی۔ کیونکہ قریش جنگ جو اور اصحاب پیکار نہیں تھے۔ جو لوگ مال و زر اور تجارت و کاروبار میں اپنی زندگی کے شب و روز بسر کر رہے ہوں وہ رزم و قتال کے خوگر کس طرح ہو سکتے ہیں؟

یہ غلام بھی اسی طرح خریدے جاتے تھے جس طرح دوسرا مال تجارت خریدا جاتا تھا۔ زیادہ تر ان کی خریداری مختلف حاجات و مآرب اور منافع کے سلسلے میں کی جاتی تھی۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ غلام اپنے آقاؤں کے مذہب پر نہیں چلتے تھے۔ ان میں مسیحی بھی تھے۔ یہودی بھی اور مجوسی بھی اور جو دین ان کے وطن میں رائج تھا اس کے پابند تھے۔ جہاں انہوں نے نشو و نما کے مراحل طے کیے تھے۔ اور جہاں سے یہ آئے تھے۔

یہ طبعی امر ہے کہ اغنیاء قریش اور اہل طبقۂ متوسط کو ان غلاموں سے بجز اس کے کوئی سروکار نہیں تھا کہ اپنی تجارت میں ان کے خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔

یہ غلام اپنے آقاؤں کے روزمرہ کے ضروریات و احتیاجات پورا کرتے تھے۔ اونٹوں کو چراتے تھے۔ بکریوں کی رکھوالی کرتے تھے، گھوڑوں کو چارہ دیتے تھے، مکے سے باہر طائف وغیرہ میں جو زمین ان کے آقاؤں کی تھی۔ اس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ علاوہ ازیں گھروں میں چاکری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ سفر کے مواقع پر موسم سرما اور موسم بہار میں جب قافلے رواں دواں ہوتے تھے، یہ اپنے آقاؤں کی خدمت کرتے تھے۔ اور ان سب

باتوں پر بالا یہ کہ ان غلاموں میں بعض بہت اچھے صناع اور ماہر حرفہ بھی تھے۔ ان کے آقا ان کی صنعت اور حرفت سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ جو بھی نفع ہوتا اور آمدنی ہوتی وہ آقا کی جیب میں چلی جاتی۔ غلاموں کو صرف دو روٹیاں مل جاتیں کہ جسم و جان کا رشتہ قائم رہ سکے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ لوگوں کی اجناسِ مختلفہ اور ادیانِ مختلفہ کا گہوارہ بن گیا تھا۔

اور یہ بالکل ناگزیر تھا کہ قریش ان چیزوں سے متاثر ہوتے کیونکہ لوگوں پر کوئی چیز بھی اس قدر جلد اور اتنی زیادہ اثر انداز نہیں ہوتی جتنے دوسروں کے تہذیبی اور دینی و مذہبی رجحانات ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دوسرے عربوں کے مقابلے میں قریش متعدد اعتبارات سے ممتاز تھے۔ ان کی ذکاوتِ قلب، وسعتِ تدبیر، نفاذِ بصیرت، عمقِ نظر، حسنِ سیاست یہ ساری چیزیں انہیں دوسرے عربوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ گُر بھی آتا تھا کہ روپیہ کیونکر جمع کیا جائے؟ لوگوں سے میل جول کا انداز کیا ہو؟ اور ان کے دل کی گہرائی میں اتر جانے کی تدبیر کیا کی جائے؟

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود قریش وادی غیر ذی زرع کے قریے میں بود و باش رکھتے تھے جو مہذب اور متمدن دنیا سے یکسر جدا اور بالکل الگ تھلگ اور قطعاً منقطع تھا۔

اور سچی بات یہ ہے کہ اپنے منظم اور مسلسل تجارتی سفر کے باعث مہذب و متمدن شہروں سے ربط و علاقہ بھی ایک تنظیم کے ساتھ قائم کئے ہوئے تھے۔ لیکن حضارت ایسی چیز نہیں۔ جو ایک جگہ سے دوسری جگہ اس طرح منتقل ہو جاتی ہو جیسے مالِ تجارت ہوا کرتا ہے۔ وہ ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتی ہے۔ پہلے اس کا بیج زمین سے سر نکالتا ہے پھر وہ ایک قوی اور تناور درخت بنتا ہے اور اس میں برگ و بار حضارت آشنا قوموں کے اتصال سے آتے ہیں[۱]۔

---

[۱] حاشیہ مترجم: ڈاکٹر طٰہٰ حسین کوئی شبہ نہیں اپنے وقت کے بہت بڑے فاضل اور محقق ہیں۔

(باقی بر صفحہ ۴۶)

(بقیہ حاشیہ) وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں وزن ہوتا ہے معنویت ہوتی ہے۔ اس باب میں بھی انہوں نے جو نکتہ سنجیاں کی ہیں وہ انہی کا حصہ ہیں۔ ان کے یہ علمی اور تحقیقی نکتے اہل نظر اور اصحاب علم کے لیے دعوت فکر و مطالعہ ہیں۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے ادب کے ساتھ اختلاف ہے کہ مکے کے عرب بت پرستی کو بربنائے مصلحت و منفعت اختیار کیے ہوئے تھے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو مکہ داعی اسلام علیہ السلام کے مخالفوں اور دشمنوں کا سب سے بڑا گڑھا اور مرکز نہ ہوتا۔ مکے سے داعی علیہ السلام کو ہجرت نہ کرنا پڑتی۔ کے ہر طبقہ کے لوگ داعی اسلام کے خلاف متحد نہ ہو جاتے۔

تاریخ و سیر کے صفحات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ منظم اور ہمہ گیر مخالفت مکے ہی میں ہوئی۔ اہلِ مکہ نے نہ صرف دعوتِ اسلام کو رد کیا۔ بلکہ اسلام قبول کرنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ عرب کے کسی گوشے اور خطے نے بھی بدترین دشمنی کا ایسا سنگ دلانہ مظاہرہ نہیں کیا جیسا مکے والوں نے کیا۔ پھر کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ مکے کے لوگ بت پرستی کو محض مصلحت و منفعت کی خاطر اپنائے ہوئے تھے۔“

رئیس احمد جعفری

(۵)

قریش کا نظمِ حکومت

حلفِ فضول کے اسباب و محرکات اور عوامل :-

غرض یہ تھی چھٹی صدی عیسوی میں قریش کی زندگی !

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قریش کا نظامِ حکومت کیا تھا ؟

اس نظام کی ہم تحدید نہیں کر سکتے ۔

یہ تحدید اس لیے ممکن نہیں کہ نہ وہاں کوئی بادشاہ تھا جو مطلق العنان طور پر فرمانروائی کر رہا ہو۔ نہ وہاں جمہوریۂ ارستقراطیہ (ارسٹوکریٹ) تھی۔ ان معنی میں جو متعارف ہیں۔ نہ وہاں جمہوریۂ دیمقراطیہ (ڈیموکریسی) تھی جو عام طور پر آج کل معروف و متعارف ہے۔ نہ ان کا کوئی ڈکٹیٹر تھا جو ان کی مرضی اور رائے کے خلاف ان پر حکومت کرتا۔ یہ ایک عربی قبیلہ تھا جس نے بڑی حد تک خصائص بادیہ کو محفوظ رکھا تھا۔ یہ بہت سی شاخوں، کنبوں اور خاندانوں میں منقسم تھا۔ ان کنبوں اور خاندانوں کے مابین تنافس اور خصومت کے اثرات کارفرما تھے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ کبھی اکڑ جاتے کبھی نرم خو ہو جاتے۔ لیکن بہر حال ان کی خصومتیں اتنی دیرپا اور مسلسل تھیں جتنی اہلِ بادیہ کی۔

قریش مکہ کا نظم اجتماعی اور نظم حکومت ــــــــ بشرطیکہ اس پر نظم حکومت کا اطلاق ہو سکے ــــــــ بالکل ویسا ہی تھا جیسا اہل بادیہ کا۔ اہل بادیہ میں اور قریش میں جو فرق تھا۔ وہ یہ کہ شئونِ حکومت میں ان کا دستور یہ تھا کہ اہل بادیہ کے برعکس ان کا کوئی ایک شیخ یا سردار نہیں تھا۔ جس سے جملہ اُمور مہمہ میں رجوع کیا جاتا ہو اور جس کا فیصلہ ناطق ہو۔ بلکہ ان کے ہاں ایک مجلس، شیوخ اور سرداروں کی قائم کی گئی تھی جس کی نشستیں مسجد حرام یا دار الندوہ میں ہوتی رہتی تھیں۔ اس مجلس کے سامنے ہر طرح کے معاملات و مسائل پیش ہوتے تھے۔ تجارتی اور کاروباری بھی، اور وہ اختلافات اور مشکلات بھی جو خود کنبوں اور خاندانوں کے مابین پیش آیا کرتے تھے۔ افراد واشخاص کے اختلاف و مخاصمت نے بھی اگر کبھی کوئی خطرناک صورت اختیار کر لی۔ تو یہ معاملات بھی تصفیہ کے لیے مجلس کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ یا اگر افراد و اشخاص کے اختلاف و خصومت نے ایسی ناگوار صورت اختیار کر لی جس سے اندیشہ پیدا ہو جاتا تھا۔ کہ یہ آگ کنبوں اور خاندانوں تک بھڑکتی ہوئی پہنچ جائیگی۔ تو بھی مجلس مداخلت کیا کرتی تھی۔

قریش کا یہ انداز اجتماعی آخر عصر جاہلی تک قائم رہا۔

لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل اس نظام میں جھول پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ احساس ہو گیا تھا۔ کہ یہ نظام ایسے عدل کی کفالت نہیں کر سکتا جو قوی اور ضعیف دونوں کے لیے یکساں اطمینان بخش ہو، جہاں تک سرداروں کا تعلق تھا وہ تو خیر اچھی طرح نمٹ لیتے تھے۔ لیکن ان سے فروتر جو لوگ تھے یعنی ضعفاء و حلفاء اور وہ لوگ جو دوسرے مقامات سے آکر مکے میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ وہ ظلم کے شاکی تھے۔ یہ نظامِ عدل ان کیلئے کچھ زیادہ سازگار نہیں رہ گیا تھا۔

یہی حالات دیکھ کر ان سادات اور سرداروں کے معاملہ فہم اور دوراندیش لوگوں نے ایک جماعت بنائی اور قسم کھائی۔ کہ یہ ہر حالت میں اور ہر قیمت پر ظلم کو دفع کرینگے مظلوم کا ساتھ دیں گے۔ ظالم کا ہاتھ پکڑینگے اور مظلوم کو اس کا حق دلائیں گے۔

یہی وہ قسم ہے جو "حلفِ فضول" کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کہ ابھی شرفِ نبوت سے مشرف نہیں ہوئے تھے از قبیل بنو ہاشم شرکت کی تھی۔ چنانچہ بعد میں آپؐ اس کا ذکر تعریف و تحسین کے انداز میں فرمایا کرتے تھے۔

◎

طائف اور یثرب

○

باہمی تعلقات اور ادیانِ غیر کے اثرات

(۶)

ثقیف

○

اہلِ مکّہ اور طائفؔ کے تعلّقات پر ایک نظر،

طائف میں ثقیف کا انداز حیات اور اسلوب اجتماعی بھی وہی تھا جو مکے میں قریش کا تھا۔ البتہ فرق یہ تھا کہ ان کے پاس کوئی کعبہ نہیں تھا جہاں حج اور تجارت کے سلسلے میں اطراف واکناف سے لوگ جوق درجوق اور کشاں کشاں آیا کرتے۔

ثقیف کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے زراعت میں خاصی اور کافی ترقی کر لی تھی۔ پھلوں کی کاشت پر انہوں نے خاص توجہ مبذول کر رکھی تھی۔ ان کی تجارت اور کاروبار کا اگر تمام تر نہیں تو زیادہ تر انحصار قریش پر تھا۔ قریش طائف کی پیداوار خرید لیا کرتے تھے۔ اور اپنے مالِ تجارت کے ساتھ اس کی درآمد برآمد کرتے تھے۔ ثقیف کے بعض اہلِ ثروت قریش کے سوداگروں کے ساتھ شریکِ تجارت بھی ہو گئے تھے۔ گویا اس بارۂ خاص میں ان کی پوزیشن وہی تھی جو مکہ میں رہنے والے غیر ملکی تاجروں کی تھی۔

علاوہ ازیں قریش اور ثقیف کے مابین تعلقات بھی بہت اچھے اسلوب پر قائم تھے۔ ان میں رشتہ و پیوند کے تعلقات بھی قائم ہوتے رہتے تھے۔ قریش کے بعض دولتمند

نے بھی طائف میں زمینیں خرید لی تھیں۔جہاں انہوں نے انگوروں کے اور دوسری چیزوں کے باغات لگا لیے تھے۔ قریش کے اربابِ ثروت نے طائف میں مکانات بھی بنا لیے تھے۔ جہاں تبادلۂ آب و ہوا کے سلسلے میں آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔نیز اس سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ قریش اور ثقیف کے درمیان حلف فضول کی قسم کا کوئی عہد نامہ کار فرما تھا۔اور یہ لوگ زراعت اور تجارت سے متعلق مشترک مسائل پر غور و فکر اور بحث و گفتگو کیا کرتے تھے

عہد جاہلیت میں ثقیف قریش کی طرح ذکاءِ قلب، نفاذِ بصیرت اور فہم و خرد میں ممتاز نہیں تھے۔ البتہ قوت و شوکت، مکر و فن، دشمن کو دھوکا دے کر چت کرنے میں بہت زیادہ ممتاز تھے۔

(۷)

یثرب

یہودیوں کے اثرات اوس و خزرج پر

اب رہا یثرب!

یثرب کی حالت مکے اور طائف سے یکسر مختلف تھی۔

اس اختلاف احوال کا ایک سبب تو یہ تھا کہ یثرب طائف اور مکے سے دور و دراز فاصلے پر واقع تھا۔ جس کے باعث دونوں میں کم و زیادہ مشابہت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ یثرب میں کوئی ایک قبیلہ آباد نہیں تھا۔ اس کے برعکس مکہ صرف قریش کا اور طائف صرف ثقیف کا شہر تھا۔ یثرب میں دو قبیلے بسے ہوئے تھے جن کی اصل عرب اور یمنی تھی۔ لیکن دونوں میں ہمیشہ لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی یہ لڑائیاں نسلاً بعد نسل جاری رہتی تھیں۔

یثرب کے یہ دونوں قبیلے اوس و خزرج تھے۔ ان میں سے ہر قبیلہ اپنے امور و معاملات کا انتظام بھی قبائل کے طریقے پر کیا کرتا تھا۔ اس باب خاص کے اندر ان میں اور اہل بادیہ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ بجز اس کے کہ وہ اہل بادیہ تھے اور یہ شہر میں مقیم

تھے۔ انہیں گھاس اور چارے کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنا بھی نہیں پڑتا تھا۔ ان دونوں قبیلوں کی معیشت کا دارومدار زراعت اور کھجور پر تھا۔

علاوہ ازیں اہل یثرب اور باشندگانِ طائف و مکہ میں ایک فرق اور بھی تھا۔ وہ یہ کہ یثرب کے باشندے تمام تر عرب نہیں تھے۔ بلکہ یہود بھی ان کے ساتھ رہتے اور بستے تھے۔ زراعت اور تجارت کے معاملات یہود اور اوس و خزرج کے مابین جاری رہتے تھے۔ کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ اور کھیتی باڑی میں اشتراک رکھتے تھے اور اختلافات کے باوجود بہت سے مسائل ان کے مشترک تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اوس و خزرج میں سے ہر قبیلہ کے ساتھ یہودی حلیف تھے۔ ایک کا دوست دوسرے کا دوست، ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن۔ جس سے ایک کی صلح اس سے دوسرے کی بھی صلح۔

اس کے علاوہ اہل مکہ و طائف اور اہل یثرب کے مابین ایک اور بھی بہت بڑا اور عظیم فرق تھا۔ اہلِ یثرب کسان اور کاشتکار تھے۔ یہ کھیتی باڑی اس لیے کرتے تھے کہ اس سے زندگی قائم رکھیں۔ اس لیے نہیں کہ اس کی تجارت کریں۔ جزیرۂ عربیہ سے باہر ان کا مالِ تجارت شاذ و نادر ہی جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان میں اور یہودیوں میں قریبی اور گہرے تعلقات بھی اختلاط اور امتزاج کی صورت میں قائم ہو گئے۔

ان حالات میں ظاہر ہے یہ بات تعجب انگیز نہیں ہو سکتی کہ اس صورت احوال کا اثر ان کے اخلاق و طبائع پر پڑنا لابدی اور ضروری تھا۔ چنانچہ پڑا۔ اسی لیے یثرب کے یہ عرب شمائل و اوصاف کے لحاظ سے بہت زیادہ مرغوب اور پسندیدہ اطوار کے حامل تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے دوسرے عرب ہم قوموں کی طرح یہ مشرک بھی تھے۔ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ خرافات و سخافات پر ان کا بھی اہل بادیہ کی طرح ایمان و اعتقاد تھا۔ بیت الحرام کی حرمت و عظمت میں بھی یہ پیش پیش تھے۔ اور موسم حج میں زیارت کے لیے وہاں جاتے بھی تھے۔

ایک بات اور بھی پیشِ نظر رکھنی چاہئے۔ عصر زیرِ گفتگو میں ان دونوں قبائل کے مابین اختلافات وخصومات نقطۂ عروج پر پہنچے ہوئے تھے۔

یثرب کے عرب اور یہودی، جوار اور اشتراک مصالح کے رشتے میں جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن یہود، اہل یثرب پر غالب تھے۔ کیونکہ یہ عرب جاہل اور ناخواندہ تھے۔ اور یہودیوں کو اس پر گھمنڈ تھا کہ وہ حاملِ دین اور حاملِ کتاب الٰہی ہیں۔ اس وجہ سے یا کسی اور وجہ سے بہر حال امر واقعہ یہ تھا کہ یثرب والوں کی بت پرستی دوسرے عربوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہلکی اور سبک تھی۔

داستانِ جمال

○

دعوتِ انقلاب، فکری غلامی کے لیے پیامِ مرگ

۸

نظر بازگشت

عربوں کے تعلقات یہودیوں اور نصرانیوں سے

گذشتہ صفحات میں ایجاز و اختصار کے ساتھ جو معروضات پیش کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں ملتِ عربیہ کے احوال و شئون صحیح اور واضح طور پر نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ پھر یہ بات کچھ عجیب سی نہیں معلوم ہوتی کہ یہ قوم جیسی سخت کوشی اور درشتی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ ویسے ہی سخت اور درشت اس کے اخلاق و صفات بھی تھے۔ اس کے عادات و خصائل بھی اتنے ہی نا ملائم اور شدید تھے جتنی اس کی زندگی۔

یہ وہ لوگ تھے جو اپنے ہاتھوں سے بتوں کو تراشتے اور بناتے تھے۔ اور ان کی پرستش کرنے لگتے تھے۔ یہ درختوں کی بھی پوجا کرتے اور ان کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ مگر اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے کہ اگر ضرورت داعی ہو تو اس کے پھلوں سے منتفع ہوں۔ اور ان کی شاخیں کاٹ کر اپنے کام میں لائیں۔ ان سے خوبیٔ طبع، حسنِ اخلاق، گداز قلب اور زیبائی شمائل کی توقع سرے سے کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ ان سے تو بس غیر متوقع چیزوں ہی کا ظہور ہوسکتا تھا۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ بداوت یعنی بادیہ نشینی نے انہیں فقر وافلاس اور غربت و نکبت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اور یہ شہروں میں رہنے والے عرب بھی درحقیقت پہلے بادیہ نشین ہی تھے۔ بعد میں انہوں نے شہروں کا رخ کیا۔ اور وہاں آ کر بس گئے۔ اس کے باوجود ان کے اصل خصائص اگرچہ جوں کے توں نہیں تو بڑی حد تک قائم اور باقی رہے۔

ان واقعات و احوال کی روشنی میں یہ بات حیرت انگیز نظر نہیں آتی کہ جن حالات اور جس ماحول میں انہوں نے زندگی بسر کی اس کا اقتضا ہی یہ تھا کہ یہ جفاجو، کینہ پرور، سنگدل اور اکھڑ ہوتے۔

اور اس پر بھی ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیے کہ فقر و فاقے کے اندیشے سے یہ لوگ بے دھڑک اپنی اولاد کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ اپنی نوزائیدہ بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ کچھ فقر و فاقے کے ڈر سے، کچھ ننگ و عار کے باعث۔

نہ یہ بات متعجب کرنے والی ہے کہ ان میں اور ان کی عورتوں میں جو تعلقات تھے۔ وہ نہ مہذب تھے، نہ پاک و صاف، نہ ان عادات سے بری جنہیں اسلام نے ناپسندیدہ اور نامرغوب قرار دیا اور انہیں یکسر متغیر اور متبدل کر دیا۔ اس طرح کے واقعات و حوادث کے اشارات اشعار و ابیات عرب میں بکثرت ملتے ہیں۔

اور یہ بات بالکل طبیعی تھی کہ شہروں میں رہنے والے عرب اہل بادیہ کے مقابلے میں زیادہ رقیق القلب واقع ہوتے تھے۔ چنانچہ ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اہلِ مکہ، اہلِ طائف یا اہلِ یثرب میں سے کسی نے اپنے بیٹوں کو قتل کر دیا ہو یا لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی مالی حالت بہتر تھی۔ یہ زیادہ آسودہ حال اور فراخ دست تھے۔ انہیں اطمینان اور عافیت کی زندگی حاصل تھی۔ بہرحال بات کوئی بھی ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اہل بادیہ اور شہروں میں بود و باش

رکھنے والے عرب بت پرستی کی حد تک بالکل ایک تھے۔ ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اپنے پڑوسی یہودیوں اور عیسائیوں سے اس باب میں یہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس اگر یہ دعویٰ کیا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ جن یہود اور نصاریٰ عرب میں آکر عربوں کے بہت سے طور طریقے اختیار کر لیے تھے۔ حیاتِ عربیہ کی غلظت اور شدت ان میں بھی رچ بس گئی تھی۔ عربوں ہی سا اکھڑپن ان میں بھی آگیا تھا۔ ویسے ہی درشت فطرت اور درشت اخلاق یہ بھی ہو گئے تھے۔

اور ہمارے دعوے کا ثبوت یہ ہے کہ نجران میں جو عیسائیت تھی۔ وہ اس عیسائیت سے یکسر مختلف تھی۔ جو مہذب اور متمدن عیسائی شہروں میں پائی جاتی تھی۔ اسی طرح یثرب اور خیبر میں جو یہودیت تھی۔ وہ ان یہود کی یہودیت سے کوئی نسبت نہیں رکھتی تھی۔ جو تہذیب آشنا اور متمدن بلاد میں موجود تھی۔ یہ دونوں مذاہب اس رشتے اور صلے کو بالکل منقطع کر چکے تھے جو ان میں اور ان کے دوسرے ہم مذہبوں میں کبھی قائم تھا۔ یا جس پر ان کے احبار عمل پیرا تھے۔ یہ اگرچہ عرب شہروں میں رہ رہے تھے لیکن ان میں بدویت کے خصائل و عادات پورے طور پر موجود تھے۔ کیونکہ ان شہروں کی زندگی بجائے خود بداوت یعنی بادیہ نشینی کی زندگی سے قریب تر تھی اور تہذیب و حضارت سے دور تر۔

بہرحال اصل بات یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ سے قرب و اتصال کے باوجود عرب اپنے ڈھنگ پر قائم تھے۔ اور یہ صورت اس وقت تک قائم رہی۔ جب تک ایک نیا دین ظہور پذیر نہیں ہوگیا۔

نوٹ از مترجم

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے عربوں کے دین و مذہب، ان کی سرشت اور اطوار، ان کے تصورات اور عقائد، نیز

یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات سے متعلق جو باتیں گذشتہ صفحات میں لکھی ہیں وہ بڑی حد تک ایک نئی چیز ہے۔ دوسرے مورخین نے ان پہلوؤں کو جنہیں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اجاگر کیا ہے۔ یا تو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ یا اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا۔

ضرورت ہے کہ ان اشارات کی روشنی میں اس موضوع پر باقاعدہ تحقیقات کی جائے۔ اور اس سلسلے میں جو مواد بھی مستند طور پر فراہم ہو سکے اسے کتابی صورت میں مرتب اور مدوّن کر دیا جائے۔ اصحابِ تحقیق و تفحص کو اس طرف ضرور توجہ کرنی چاہیے۔ (رئیس احمد جعفری)

۹

قریش کا مردِ بزرگ ○ عبدالمطلبؓ

○

ایک یتیم و یسیر بچّے کی کہانیؒ

اشرافِ قریش میں ایک شخص تھا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی تجارت کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ اور مسجد حرام اور دار الندوہ میں اشرافِ قریش کی جو نشستیں ہوا کرتی تھیں ان میں بھی شریک ہوتا تھا۔

یہ تھا عبدالمطلب بن ہاشم!

عبدالمطلب کو اپنی قوم میں غیر معمولی اثر و اقتدار اور وقار حاصل تھا۔

عبدالمطلب کا میلان مذہب کی طرف بہت زیادہ تھا۔ جن خداؤں کی تعظیم ان کی قوم کرتی یہ بھی ان کی تعظیم و تمجید میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اور عبدالمطلب کا یہ مذہبی رجحان مبنی تھا تمام تر صدق و اخلاص پر۔ نہ کہ تکلف اور ریاء پر۔ عبدالمطلب کو کچھ ایسے امتیازات حاصل تھے کہ ان کی قوم ان سے برسرِ پرخاش رہنے لگی۔ شروع شروع میں تو مخاصمت زوروں پر رہی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد قوم کے یہی لوگ اس شخص کی بڑائی اور بزرگی کا کلمہ پڑھنے لگے ——— یہی شخص تو تھا جس نے چاہِ زمزم کھود نکالا تھا۔

اصحابِ اخبار وآثار کا بیان ہے کہ چاہِ زمزم عبدالمطلب نے بذاتِ خود نہیں کھود نکالا تھا۔ بلکہ اس کی انہیں بشارت ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ عالمِ خواب میں انہیں چاہِ زمزم کھودنے کی ہدایت ملی۔ اور وہ جگہ بھی بتادی گئی۔ جہاں یہ کنواں واقع تھا۔ انہوں نے بشارت پر عمل کیا۔ زمین کھودی اور چاہِ زمزم برآمد ہوگیا۔

اصحابِ اخبار و آثار کا قول ہے کہ چاہ زمزم کھودنے کے دوران میں قبل اس کے کہ پانی برآمد ہو، عبدالمطلب کو ایک خزانہ بھی ملا۔ قریش اس بات پر جھگڑ پڑے۔ کیونکہ وہ اس خزانے پر تصرف چاہتے تھے۔ لیکن عبدالمطلب نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ نہ خود لیا نہ دوسروں کو دیا۔ بلکہ سارا خزانہ کعبہ کے لیے وقف کر دیا۔

پھر جب پانی نکل آیا تو پھر قریش عبدالمطلب سے جھگڑ پڑے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کنویں پر حقِ ملکیت ان کا ہے اور عبدالمطلب اپنے حق کو فائق سمجھتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے بذاتِ خود کنواں کھود نکالا تھا۔ اور بڑی سعی و کوشش کے بعد پانی حاصل کیا تھا۔

قریش کا اور عبدالمطلب کا جھگڑا جب زیادہ طول پکڑ گیا۔ تو اس بات پر اتفاق رائے ہوگیا کہ کسی کاہن کو حکم بنا کر فیصلہ کرا لیا جائے۔ چنانچہ یہ لوگ عبدالمطلب سمیت ایک کاہن کے پاس چلے۔ لیکن اسے حکم بنانے اور اس سے فیصلہ کرانے کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ راستے میں کچھ ایسی باتیں ظاہر ہوئیں جن کی بنا پر حریفوں کو یقین آگیا۔ کہ عبدالمطلب نہ دروغ گو ہیں، نہ ریاکار!

راویوں کا بیان ہے کہ اس خصومت کے دوران میں عبدالمطلب نے محسوس کیا کہ اس دنیا میں وہ یکہ و تنہا ہیں۔ کوئی اولاد نہیں جو عصائے پیری بن سکے۔ انہوں نے نذر مانی کہ اگر دس بیٹے انہیں عطا ہوتے تو وہ ان میں سے ایک کو اپنے خداؤں کے لیے قربان کردینگے

عبدالمطلب کے دس بیٹے ہوئے۔ انہوں نے طے کر لیا کہ ایک بیٹے کی قربانی کردیں لیکن قریش آڑے آئے۔ انہوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ بات اس طرح ٹلتی رہی۔ یہاں

تک کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ قرعہ اندازی سے کام لیا جائے۔ یعنی ہر بیٹے کے مقابلے میں دس دس اونٹ قربانی کے لیے پیش کیے جائیں۔ جتنے اونٹوں پہ قرعہ نکل آئے۔ ان کی قربانی کردی جائے۔ جب بھی قرعہ ڈالا جاتا۔ اونٹوں کے بجائے بیٹے کے نام پر پڑتا۔ وہ پھر دس اونٹ بڑھا دیتے۔ یہاں تک کہ سو اونٹ جب ہوگئے تب بیٹے کے بجائے ان پہ قرعہ پڑا۔ اس طرح بیٹا قربان ہونے سے بچ گیا۔

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبدالمطلب دین و مذہب کے معاملے میں کتنے مخلص اور صادق تھے۔ اور اس راستے میں مال و فرزند کی ذرا پروا نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ہر چیز داؤں پر لگا دی۔ اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریش عبدالمطلب کی کتنی عزت اور ان کے بیٹے سے کتنی محبت کرتے تھے۔ وہ اس پر منت سماجت اور سختی و شدت کے ساتھ اڑے رہے کہ جس طرح بھی ہو ان کے بیٹے کو قربان ہونے سے بچالیں۔

لیکن یہ لڑکا جس کے فدیے میں سو اونٹ دیے گئے تھے اور جو اتنا گراں قیمت ثابت ہوا تھا، زیادہ عمر لے کر نہیں آیا تھا۔ باپ نے جواں عمر بیٹے کی شادی کر دی۔ اور اسے شام کے سفر پر اپنے افراد قوم کے ساتھ تجارت کے سلسلے میں بھیجا۔ وہ گیا لیکن واپس نہیں آیا۔ شام سے آتے وقت یثرب میں اسے موت نے آ لیا۔ اس کی موت کے بعد اس کا بچہ تولد ہوا۔ اور اسے اللہ نے اس کام کے لیے منتخب کر لیا کہ عرب میں ایک نئے دین کا داعی بنے۔

یہ بڑا خطرناک زمانہ تھا ——— مکہ ایک بہت بڑے خطرے کی زد میں تھا۔ حبشیوں کا لشکر جرار یمن سے یہ ارادہ کر کے بڑھا۔ کہ حجاز پر اس طرح قبضہ کر لے۔ جس طرح یمن کو اس نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اور حجاز میں دین مسیح اس طرح پھیلائے جس طرح یمن میں اس امر کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اور پھر کعبے کو ڈھا دے اور ان بتوں کو اکھاڑ پھینکے جو خانہ کعبہ میں جاگزیں تھے۔

لیکن اللہ کے کھیل اللہ جانے ۔ اس نے اہلِ حبش کی آرزوئے دیرینہ نہیں پوری ہونے دی ۔ اس نے حبشیوں کو مکے میں داخل بھی نہیں ہونے دیا ۔ انہیں ناکام و نامراد اور خائب و خاسر یمن واپس جانے پر مجبور کر دیا ۔ اور انہیں ایسے حالوں تک پہنچا دیا کہ وہ درسِ عبرت بن کر رہ گئے ۔ جیسا کہ قرآن کریم کی ایک سورۂ کہ میہ میں ارشاد ہوا ہے :-

الم ترکیف فعل ربک	یعنی :
باصحاب الفیل ؟ الم یجعل	(اے محمدؐ) کیا آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے
کیدھم فی تضلیل ۔ وارسل	رب نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟
علیھم طیرًا ابابیل ۔ ترمیھم	کیا ان کی تدبیر کو (جو وہ برائی کعبہ کے بارے میں تھی
بحجارۃ من سجیل ۔ فجعلھم	یکسر) رائگاں نہیں کر دیا ؟ اور ان پر غول کے غول پرندے
کعصف ماکول ؕ	بھیجے ۔ جو ان پر کنکریاں پھینکتے تھے ۔ سو اللہ تعالیٰ نے
	ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی طرح (پامال) کر دیا !

میں اسے پسند نہیں کرتا کہ اس جگہ "طیرًا ابابیل" کے سلسلے میں کوئی تاویل کروں جس نے پتھریلی کنکریاں پھینک کر حبشی لشکر کو کھائے ہوئے بھوسے کی طرح پامال کر دیا تھا ۔ کیونکہ میں ہمیشہ نص کے الفاظ پر جما رہتا ہوں ۔ اور اسی مفہوم کو ترجیح دیتا ہوں جو مسلمین اولین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک کی تلاوت کا قبول کیا ۔ اور مانا تھا

اس موقع پر ——— ابرہہ کی فوج کشی کے موقعہ پر ——— عبد المطلب نے انتہائی صبر و برداشت اور شجاعت و خود اعتمادی کا ثبوت دیا تھا ۔ جس کا نشان عرب کے اشراف و عوام میں نہیں ملتا ۔ ہوا یہ کہ انہوں نے لشکر کشی کے وقت قریش کو ہدایت کی کہ مکہ خالی کر دیں ۔ اور پہاڑوں کے غاروں میں جا کر پناہ گزین ہو جائیں اور دشمن کے لشکر کو اس کے حال پر چھوڑ دیں ۔ قوم نے اپنے مرد بزرگ کی یہ بات مان لی ۔ جنگ سے باز آ گئی ۔ اور مکہ خالی کر دیا ۔ مگر یہ مردِ بزرگ بدستور مکے میں مقیم رہا ۔ ایک لمحہ کے

لیے ابھی اس نے تخلیہ نہیں کیا۔ وہ کعبے میں جاتا اور اللہ تعالیٰ سے مدد کی درخواست کرتا

راویوں کا قول ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے غارت گری شروع کر دی جیسا کہ ایسے مواقع پر فوجیں کیا کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ لشکری قریش کے اونٹ اپنے ساتھ ہنکالے گئے عبدالمطلب ابرہہ کے پاس پہنچے جو اس لشکر کے سردار اور حبشہ کا فرمانروا تھا۔ جب بات آئی تو صرف قریش کے اونٹوں کی واگزاری کا مطالبہ کیا جنہیں اس کے لشکری اپنے ساتھ ہنکالائے تھے۔

راویوں کا بیان ہے کہ یہ بات سن کر ابرہہ کی نظر میں عبدالمطلب حقیر ہو گئے۔ اس نے ان سے کہا:۔

"میرا خیال تھا کہ تم اس لیے میرے پاس آئے ہو کہ مکے کے بارے میں کوئی التجا کرو گے یا خانہ کعبہ کے لیے عرض معروض کرو گے جس کی تم بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہو۔ لیکن تم نے نہ مکے کا ذکر کیا نہ خانہ کعبہ کا۔ صرف اونٹوں کی واگزاری کی درخواست کرنے لگے۔"

عبدالمطلب نے جواب دیا:۔

"میں آپ سے اس مال کے بارے میں بات کر رہا ہوں جس کا میں مالک ہوں رہا خانہ کعبہ، تو اس کا مالک خود اس کی حفاظت کرے گا۔"

عبدالمطلب کو اونٹ واپس مل گئے۔ اور وہ کعبہ کے قریب اپنے مکان میں آ گئے۔ اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے لگے۔

راویوں کا بیان ہے کہ دوسرے روز ابرہہ نے خانہ کعبہ ڈھانے کے لیے اور مکے میں فاتحانہ داخل ہونے کے لیے قدم آگے بڑھایا۔ لیکن اس کے اور خانہ کعبہ کے مابین غول کے غول پرندے آڑے آ گئے۔ اور اس لشکر جرار پر مخصوص کنکریاں برسائی گئیں۔ جس سے یہ لشکر کھائے ہوئے بھوسے کی طرح پامال ہو گیا۔

قریش جوشِ مسرت سے لبریز عت مکے میں واپس آ گئے۔ اب ان کے دل میں عبدالمطلب کی بڑائی اور بزرگی پہلے سے کہیں زیادہ بیٹھ گئی تھی۔ وہ ان کی شجاعت، ثبات قدم اور خود اعتمادی کے پہلے سے زیادہ قائل ہو گئے تھے۔ کیونکہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ وہ راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے پہاڑوں کی گھاٹیوں اور غاروں میں جا کر پناہ حاصل کی تھی۔ مگر یہ شخص، یہ نڈر اور بے باک شخص بدستور اپنے شہر اور اپنے گھر میں مقیم رہا۔

اور ٹھیک اس سال ——— جس کا نام قریش نے "عام الفیل" رکھا تھا ——— عبدالمطلب کے گھر میں ایک یتیم بچہ تولد ہوا۔ عبدالمطلب نے اس کا نام "محمدؐ" رکھا اس کی کفالت اپنے ذمے لے لی۔ اور بنو ہذیل کی ایک شاخ بنو سعید میں اسے شیرخوارگی کے لیے بھیج دیا۔ جب رضاعت کی مدت ختم ہو گئی۔ تو یہ بچہ پھر اپنی ماں کی گود میں آ گیا۔

مکے میں اپنے بوڑھے دادا کے زیر سایہ نشوونما کے مراحل یہ بچہ طے کرنے لگا۔ پھر اس کی ماں اسے لے کر یثرب کے سفر پر ——— جب اس کی عمر صرف چھ سال کی تھی۔ ——— روانہ ہوئی۔ مقصد یہ تھا کہ مرحوم شوہر کی تربت ایک نظر دیکھ لے۔ اور اس بچہ کو اس کے باپ عبداللہ بن عبدالمطلب کی قبر دکھا دے۔ وہ مکے سے نکل کر واپس نہیں آئی۔ جیسے اس کا شوہر بھی سفر سے واپس نہیں آیا تھا۔

یثرب سے مکے واپس آتے ہوئے پیامِ اجل آ پہنچا۔ اور یہ بیوہ دل گرفتہ عورت اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ بچہ کو لے کر اس کی کھلائی ام ایمن واپس آئی۔ اور دادا کے زیر سایہ وہ محبت، و شفقت کی لوریاں دے کر اسے پروان چڑھانے لگی۔ اب یہ بچہ یتیم بھی تھا اور یسیر بھی۔ نہ اس کا باپ زندہ تھا نہ ماں! یہاں تک کہ اس کی عمر سات سال کی ہو گئی اور اس کا دادا بھی دنیا سے رختِ سفر باندھ کر روانہ ہو گیا۔ ماں اور باپ سے یہ پہلے ہی محروم ہو چکا تھا۔ اب دادا کی شفقت اور سرپرستی سے بھی محروم ہو گیا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔

الم یجدك یتیماً فاوی (کیا اللہ نے تجھے یتیم نہیں پایا اور پھر پناہ نہیں دی ؟)

عبد المطلب کے انتقال کے بعد اس یتیم بچے کا چچا ——— ابوطالب ——— آگے بڑھا - اور اس کی کفالت اس نے اپنے ذمے لے لی - اور کوئی شبہ نہیں، وہ بہترین کفالت کرنے والے اور بہترین ولی تھے -

ابوطالب بھی دوسرے اشرافِ قریش کی طرح تجارت کے سلسلے میں زیادہ تر سرگرم سفر رہتے تھے -

رواۃ کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ ابوطالب نے سفر شام کا ارادہ کیا - اب یہ یتیم لڑکا عمر کی بارہ منزلیں طے کر چکا تھا - اور اپنے چچا سے بہت زیادہ مانوس تھا - سفر کے وقت مچل گیا کہ وہ بھی ساتھ جائے گا - اس کا الحاح دیکھ کر چچا کا دل پانی ہو گیا - وہ اسے اپنے ساتھ لے کر شام کی طرف چل پڑا -

راویوں کا قول ہے کہ ابھی وہ حدودِ شام میں نہیں پہنچا تھا کہ افتاں و خیزاں مکے واپس آ گیا - کیونکہ ایک عیسائی راہب نے اس کے ساتھ اس کم عمر لڑکے کو دیکھ کر وہ کچھ دیکھ لیا تھا جو اس کا چچا نہیں دیکھ سکا تھا - اور اس نے تاکید کی تھی کہ اس لڑکے کو لے کر فوراً وطن واپس جاؤ - اور اسے یہود و نصاریٰ کی چشمِ بد بیں سے محفوظ رکھو !

چچا کے زیرِ سایہ برابر یہ یتیم لڑکا پروان چڑھتا رہا - یہاں تک کہ اس کی عمر ۱۴ سال کی ہو گئی - اور اسے جنگ فجار دیکھنے کا موقعہ ملا جو حرم مکہ میں قیس و قریش کے مابین ہوئی تھی یتیم لڑکے نے اس جنگ میں عملی حصہ نہیں لیا - کیونکہ کم سن تھا - لیکن تیر چن چن کر چچاؤں کو جنگ کے وقت دیتا جاتا تھا -

پھر جب یہ کچھ سوجھ بوجھ کا ہوا تو کام کاج میں حصہ لینے لگا - چنانچہ یہ بکریوں کے ریوڑ

چرایا کرتا تھا۔ اور اس طرح اپنا رزق خود پیدا کر لیتا تھا۔
اور جب یہ بیس سال کا ہوا تو اس کا راستہ بدل گیا۔

(۱۰)

خدیجہ رضی اللہ عنہا

امینِ مکّہ کی زندگی کا نیا دَور

اور یہ جواں عمر یتیم کسی چیز کا مالک نہ تھا۔ اپنی روزی بھیڑ بکری کے ریوڑ چرا کر کماتا تھا۔
لیکن تھا قریش ——— یکے از اشرافِ قریش۔

اور یہ ریوڑ چرانے کا کام بچپن ہی سے شروع کر دیا تھا۔ وہ لڑکے جو ابھی شباب کی منزل تک نہ پہنچے ہوں۔ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے، اور ضروریاتِ حیات میں وسعت پیدا ہوتی تو حصولِ رزق کے لیے کوئی اور سبیل نکالتے۔

اس قریش نوجوان کے چچا کا ذریعہ رزق تجارت تھا۔ اس کے باپ کا انتقال بھی ایک کاروباری سفر ہی کے دوران میں ہوا تھا۔ اس کا دادا بھی تجارت پیشہ تھا۔ پھر کیا چیز مانع تھی کہ یہ اس لگے بندھے رستے پر نہ چلنے لگتا؟

ایک روز اس کے چچا نے اس سے باتیں کرتے ہوئے بتایا۔ خدیجہ بنت خویلد ایک بڑی دولت مند عورت ہے۔ مال و زر میں کوئی قریش اس کا ہم پلہ نہیں۔ شرفِ نسب سے بھی مالا مال ہے۔ وہ ایک بڑا کارواں تجارتی مقاصد کے ماتحت شام بھیج رہی ہے۔ اس کے

ایجنٹ بن کر کیوں نہ ساتھ ہو جاؤ؟ پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"اگر تمہارا ارادہ ہو تو میں خدیجہ سے تمہاری سفارش کر سکتا ہوں"۔

نوجوان بھتیجے نے یہ صلاح مان لی اور خدیجہ نے منظور کر لیا۔ اور پھر خدیجہ کا قافلۂ تجارت مکے سے نکل کر شام کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس قافلے کے ساتھ خدیجہ کا ایک غلام میسرہ بھی تھا۔

کارواں شام پہنچا۔ کچھ بیچا، کچھ خریدا۔ اور قافلے کے ساتھ یہ نوجوان قریش مکے واپس آ گیا۔ اس نے خدیجہ کو مال تجارت جو لایا تھا دے دیا۔ اور جو نفع کمایا تھا وہ بھی پیش کر دیا۔ نفع بھی اتنا جو آج تک نہیں ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اللہ نے اس تجارت کو کسی دوسرے مقصد کے لیے ایک وسیلہ بنایا تھا۔ اور بہت جلد یہ بات نمایاں بھی ہو گئی۔ خدیجہ کے دل میں اس نوجوان کی محبت نے گھر کر لیا۔ انہوں نے اسے پیام نکاح بھیجا۔ اس نے یہ پیام قبول کر لیا اور خدیجہ کا شوہر بن گیا ——— خدیجہ کی عمر اس سے ۱۵ سال زائد تھی۔

اس کے بعد سے یہ فارغ البال اور آسودگی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ کوئی ضرورت ایسی نہ تھی۔ جو پوری نہ ہو جاتی ہو۔ نہ کوئی تنگی ایسی تھی جس سے سابقہ پڑا ہو۔ جیساکہ اللہ تعالے سورۃ "الضحیٰ" میں فرماتا ہے

ووجدك عائلاً فاغنیٰ ط   ہم نے تجھے مفلس پایا اور تونگر بنا دیا۔

——— ٭ ———

خدیجہ کے بطن سے اس کی اولاد بھی ہوئی۔

خدیجہ کے ساتھ رہ کر اس نے امن و سکون اور عافیت بھی حاصل کی۔

لیکن اس نوجوان میں کچھ ایسے عجیب سے خصائل تھے جو قریش کے دوسرے نوجوانوں میں بالکل نہیں پائے جاتے تھے۔

یہ لہو و لعب سے یکسر متنفر تھا۔ لغویات اور خرافات سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ نمائش

اور یہ یا اس کی فطرت سے دور تھی۔ باوقار اور وجیہہ تھا۔ بتوں سے اسے کد تھی۔ جن بتوں کو اس کی قوم پوجتی تھی۔ یہ ان کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ جن بتوں کی پرستش میں خواہ از راہِ مصلحت یا خلوص و صداقت کے ساتھ اس کی قوم کے اعیان و اشراف مشغول و منہمک تھے۔ وہ اس کی نظر میں مردود تھے۔ صدق و راستی اس کی خصوصیت تھی۔ جب بھی اس کے منہ سے کوئی بات نکلتی تھی۔ تو صرف سچ۔ کسی سے اگر کوئی عہد کرتا، وعدہ کرتا تو اسکے ایفا میں کھرا ثابت ہوتا۔ ان تمام باتوں اور حرکتوں سے دور رہتا دور جو مجد و شرافت کے خلاف تھیں۔ صرف اتنا ہی نہیں صلۂ رحم میں کوئی اس کا ہمسر نہ تھا۔ حق کے ادا کرنے میں کوئی اس کا ہم پایا نہ تھا۔ ایثار، احسان اور حسنِ سلوک میں کوئی اس کی گرد تک بھی نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے چچا نے اس کی پرورش کی تھی۔ اسے پالا پوسا تھا۔ اب وہ کثرت اولاد سے گراں بار تھا۔ اور مالی اعتبار سے تہی دست اور تہی دامن۔ سوچا ایسے موقع پر چچا کا بوجھ ہلکا کرنا چاہئے۔ اس سے اس کے بیٹے علی کو مانگ لیا۔ اور علی کے باپ نے جب یہ یتیم اور بے آسرا تھا اس کے ساتھ لطف و عنایت اور احسان کا جو برتاؤ کیا تھا۔ اس کی تلافی بڑی حد تک کر دی۔

اس کا یہ اخلاقِ پسندیدہ اور وصفِ حمیدہ ہر شخص کی نوکِ زبان تھا قریش کی نظر میں بہت جلد اس نے ایک بڑا مقام حاصل کر لیا۔ قریش اس سے محبت کرنے لگے۔ اسے امین کے نام سے پکارنے لگے۔ اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ واقعی ہر اعتبار سے یہ امین تھا

جس سال قریش نے ارادہ کیا کہ بناء کعبہ کو پھر سے استوار کریں۔ تو کافی سوچ بچار کے بعد اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلی بنیادیں منہدم کر دیں۔ اور از سرِ نو تجدید و تاسیس کا مرحلہ طے کیا جانے لگا۔ اس کارِ اہم میں "امین مکہ" بھی برابر کا شریک تھا

یہاں تک کہ بنیاد حجرِ اسود تک پہنچ گئی۔ قریش کے مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں اس بات پر اختلاف رونما ہو گیا کہ حجرِ اسود کو اس کے اصل مقام پر [illegible] عزت و

سعادت کسے حاصل ہوگی ؟ ان کا خیال تھا ——— اور بجا خیال تھا ———
کہ یہ عزت و سعادت جسے حاصل ہوگی ۔ اس کے شرف و وقار میں غیر معمولی اضافہ ہوجائے گا۔ اس مسئلہ نے اختلافی صورت اختیار کرلی ۔ بات بڑھی اور نوبت خصومت تک پہنچ گئی ۔ اور اندیشہ ہو چلا کہ معاملہ کہیں جنگ وجدل تک نہ پہنچ جائے ۔ اگر ایسا ہوا تو پھر معاملہ حد درجہ نازک ہو جائے گا ۔

اس موقعے پر اصحابِ فکر ورائے آگے بڑھے اور ان کے صلاح ومشورہ سے طے پایا کہ معاملہ کسی حکم کے سپرد کر دیا جائے ۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اتنے اہم معاملے میں حکم کسے بنایا جائے ؟ آخر کافی تامل و تردد کے بعد اس پر اتفاق ہوا کہ کل جو شخص سب سے پہلے مسجد حرام میں داخل ہوگا ۔ یہ ذمہ داری اس کو سونپ دی جائے اور یہ آنے والا امین مکہ کے سوا کوئی نہ تھا ۔ اس نے جو فیصلہ کیا وہ سب کے لیے قابلِ قبول اور دل خوش کن تھا ۔ اس نے فیصلہ یہ کیا کہ اپنی چادر بچھا دی ۔ اس پر حجرِ اسود رکھ دیا ۔ اور ان جھگڑنے والے لوگوں سے کہا کہ چادر کے اطراف ہاتھ میں لے لیں ۔ سب نے ایسا ہی کیا ۔ جب وہ مقام آیا ۔ جہاں حجرِ اسود کو رکھا جانا تھا ۔ اس نے اسے اٹھایا اور جگہ پر رکھ دیا ۔

لیکن اب اس میں ایک عجیب طرح کی تبدیلی ہو رہی تھی ۔

یہ خلوت گزیں اور مردم بیزار ہوتا جارہا تھا ۔ تھوڑے تھوڑے سے وقفے سے مکے سے باہر چلا جاتا ۔ تھوڑا سا ناشتہ ساتھ رکھتا ۔ اور کئی کئی دن غارِ حرا میں گذار دیتا ۔ بالکل خلوت اور عزلت میں ۔ جب کئی شب و روز اس طرح گذر جاتے ۔ اور توشہ ختم ہو جاتا ۔ تو واپس آجاتا ۔ واپس آنے کے بعد پھر توشہ فراہم کرتا اور پھر غارِ حرا میں خلوت نشیں ہو جاتا ۔ اور جب تک حالات اجازت دیتے وہیں رہتا ۔

یہ خلوت گزینی اب اس کی عادت بن گئی تھی ۔ لیکن ایک روز یہ اپنی رفیقۂ حیات کے پاس بیکرِ اضطراب بنا واپس آیا ۔ اور عجیب بات خدیجہ کو سنائی ۔

(۱۱)

نزولِ وحی

○

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبلیغ وارشاد کی ہدایت،

محمدؐ نے خدیجہ کو بتایا:

غارِ حرا میں خاموش بیٹھا تھا کہ اس نے اپنے سامنے ایک شخص دیکھا۔ کہ کچھ کہہ رہا ہے۔
وہ اس سے مخاطب تھا اور کہہ رہا تھا:۔

اقراء (پڑھ)

اس نے جواب دیا

"میں پڑھنا نہیں جانتا"

اس نے اسے سینہ سے لگا لیا ——— جیسا کہ بخاری و مسلم میں حدیث عائشہ رضؓ
سے ثابت ہے ——— اس کے بعد اس نے پھر کہا۔

اقراء (پڑھ)

اس نے پھر وہی جواب دیا۔

"میں پڑھنا نہیں جانتا"

اب کے مرتبہ پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ اس نے اسے بھینچا۔ پھر چھوڑ دیا۔ اور گویا ہوا:۔

اقراء باسم ربك الذی	یعنی:
خلق ۰ خلق الانسان من	(اے محمدؐ) آپ (پر جو) قرآن (نازل ہوا کرے گا)
علق ۰ اقراء وربك الاکرم ۰	اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجیے۔ جس نے (مخلوقات کو)
الذی علم بالقلم ۰ علم	پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا
الانسان مالم یعلم ۰	کیا۔ آپ قرآن پڑھا کریں اور آپ کا رب بڑا کریم ہے
	جس نے قلم سے تعلیم دی اور انسان کو ان چیزوں کی
	تعلیم دی جنہیں وہ نہیں جانتا تھا۔

پھر وہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔ یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ پھر کچھ دیکھا نہ سنا۔ وہ سخت سراسیمگی اور دہشت زدگی کے عالم میں غار سے باہر نکلے۔ وہ جلدی جلدی گھر کی طرف جانے کے لیے بڑھے۔ کہ پھر کان میں آواز آئی۔ جیسے انہیں کوئی پکار رہا ہے۔ سامنے دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا۔ داہنی طرف دیکھا۔ مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔ بائیں طرف دیکھا۔ مگر کوئی نہ تھا۔ پیچھے کی جانب دیکھا۔ مگر نظر خالی واپس آ گئی۔ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو وہی شخص جو غار میں نظر آیا تھا۔ زمین و آسمان کے مابین ایک کرسی پر متمکن تھا۔ اب تو دہشت حد انتہا کو پہنچ گئی۔ اب وہ آگے بڑھے۔ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر تیز تیز خدیجہ کے پاس آئے اور ارشاد فرمایا:

زملونی (مجھے کمبل اڑھاؤ)

زملونی (مجھے کمبل اڑھاؤ)

یا ایک دوسری روایت کے مطابق فرمایا:۔

دثرونی (مجھے چادر اڑھاؤ)

دثرونی (مجھے چادر اڑھاؤ)

اور میرے اوپر ٹھنڈا پانی چھڑکو۔

خدیجہ نے تعمیل ارشاد کی۔ یہاں تک کہ دہشت کا اثر کم ہوگیا۔ پھر انہوں نے سارا ماجرا خدیجہ کو کہہ سنایا۔ اور فرمایا:

"مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے۔"

خدیجہ نے جواب دیا:

"ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ آپ کو کبھی بھی رسوا کرے۔ آپ صلۂ رحم کرتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں۔ بے نواؤں کی دستگیری کرتے ہیں۔"

محدثین اور راویان سیر کا بیان ہے کہ:

پھر خدیجہ آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ کے پاس، جو ان کے ابن عم تھے پہنچیں۔ یہ عہد جاہلیت میں عیسائی مذہب قبول کر چکے تھے۔ اور عبرانی زبان میں ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ انجیل سے عبرانی زبان میں مباحث منتقل کر رہے تھے۔ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ آنکھیں بھی جاتی رہی تھیں۔ خدیجہ نے ان سے کہا:

"اے ابن عم ذرا اپنے برادر زادے کا ماجرا سنئے۔"

ورقہ نے آپ سے پوچھا:

"اے برادر زادے بتاؤ تمہارا ماجرا کیا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ورقہ کو بھی ساری داستان از اوّل تا آخر سنادی۔

ورقہ نے یہ ماجرا سن کر کہا:

(وہ شخص جسے تم نے دیکھا) وہ ناموس تھا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر اتارا تھا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا۔ جب تمہاری قوم تمہیں وطن سے نکال دے گی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا۔

"کیا یہ لوگ مجھے میرے دیس میں نہیں رہنے دیں گے"؟

ورقہ نے جواب دیا:

"ہاں، ——— تم جیسا آدمی جب کبھی بھی ظہور پذیر ہوا۔ اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا۔ اگر اس دن تک میں زندہ رہا۔ تو ضرور تمہاری پوری پوری مدد کروں گا۔"

اس واقعے کے بعد آپ خانہ نشین ہو گئے۔ اور غارِ حرا کا جانا ترک کر دیا۔ اور انتظار کرنے لگے کہ دیکھا چاہیئے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ آخر اللہ نے آپ پر وحی بھیجی:

یاایہا المدثر ٥ قم	یعنی:
فانذر ٥ وربك فكبر ٥	اے چادر میں لپٹے ہوئے شخص (محمدؐ) اٹھ۔
وثیابک فطہر ٥ والرجز	اور اپنے رب کی بڑائیاں بیان کرو۔ اپنے کپڑوں
فاہجر ٥ ولا تمنن	کو پاک رکھو۔ اور بتوں سے الگ رہو (جس طرح اب
تستکثر ٥ ولربك فاصبر ٥	تک ہو) اور کسی کو اس لیے نہ دو کہ (دوسرے
	وقت) زیادہ معاوضہ چاہو۔ اور اپنے رب کے
	رستے میں (مصائب برداشت کرکے) صبر کرو

اس کے بعد سے وہ چیزیں ظہور میں آنے لگیں جو اللہ نے آپ کے لیے مقدر کر دی تھیں۔ غار میں جو ماجرا (وحی) پیش آیا تھا وقتاً فوقتاً ایک بارِ گراں کی صورت میں اب بھی پیش آتا۔ جو گویا آپ پر لاد دیا گیا تھا۔ آپ پر یہ واجب تھا کہ پیامِ وحی کو صبر و عزیمت اور استقلال و تحمل کے ساتھ لوگوں تک پہنچائیں۔ اور اس سلسلے میں جو مصائب اور نوائب، مشقتیں اور اذیتیں پیش آئیں انہیں برداشت کریں۔

آپ ہر حالت میں دو امور پر مکلّف تھے۔ اور ان میں سے کسی ایک کے بارے میں

بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ از روئے نظر وہ دوسرے سے کم اور ہلکا ہے۔

ہر دو امور میں سے پہلا امر تھا:

۱ : مجاہدۂ نفس۔

۲ : دلوں پر اور زبانوں پر اللہ کی بزرگی اور عظمت کی دعوت۔

۳ : ہر ظاہر اور مخفی آلودگی سے تطہیر۔

۴ : بت پرستی سے یکسر علیحدگی۔

۵ : احسان رکھنے سے اجتناب۔ کم دے کر زیادہ لینے کے جذبے سے علیحدگی۔

۶ : خدائے واحد و یکتا کی بزرگی اور طاعت

۷ : گوناگوں مصائب کا جو اللہ کے راستے میں پیش آئیں استقلال و عزیمت کے ساتھ تحمل۔

اور دوسرا مرحلہ جس کے آپ مکلف تھے یہ تھا:

لوگوں کو اس بات سے ڈرانا کہ جو زندگی وہ بسر کر رہے ہیں۔ وہ اس لیے نہیں ہے کہ لہو ولعب اور فکر سود و زیاں میں صرف کر دی جائے۔ اور اس کا مقصد حصول لذات و آسائش قرار دیا جائے اور آلام و محن اور نوائب و مصائب کو بھگتا جائے۔

یہ زندگی اپنے پیچھے بھی ایک زندگی رکھتی ہے ——— حیات بعد الممات!

پس ضروری اور ناگزیر ہے کہ آنے والی زندگی کی بھی تیاری کی جائے۔ اس زندگی کے بعد جو زندگی آنے والی ہے اسے بسر کرنے کا سر و سامان بہم پہنچایا جائے۔ اور جتنا کچھ بھی توشہ اور زادِ راہ مہیا کیا جا سکتا ہے۔ مہیا کر لیا جائے۔

(۱۲)

دعوتِ اسلام

ابتلاء کا دور ، طائف کا سفر، ہجرت :— نئی زندگی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کارِ اہم کو انجام دینے کے لیے مکلّف کئے گئے تھے۔ اور خدا کی طرف سے جو امانت انہیں سونپی گئی تھی اس کو اس کے محل تک پہنچانے کے لیے ہمہ تن جہد و عمل ین گئے تھے۔ مجاہدۂ نفس کے سلسلے میں وہ اتنی دور تک چلے گئے تھے۔ جہاں تک کسی انسان کا پہنچنا قطعاً ناممکن تھا۔ امرالٰہی کو انہوں نے اپنی ذات پر نافذ کر لیا تھا۔ اور کسی تکلیف و مصیبت کو جھیلنے سے دریغ نہیں فرمایا تھا

آپ نے سب سے پہلے اپنے کام کا آغاز اپنی بیوی اور عزیز و رشتے داروں اور قرابت مندوں سے کیا جنہیں قبول کی توفیق ملی انہوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی جو اس توفیق سے محروم رہے انہوں نے انکار کر دیا۔

اس کے بعد خدا کی طرف سے تعمیم دعوت کا آپ کو حکم ملا چنانچہ آپ نے اپنی قوم کو خدا سے ڈرایا بھی، اور خوش خبری بھی دی - آپ کی دعوت کیا تھی ؟ ——— ایمان

نیکی اور احسان۔

لیکن اس دعوت کو بہت کم لوگ ایسے تھے جنہوں نے قبول کیا۔ بہت بڑی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جس نے انکار کر دیا۔ بلکہ صرف انکار پر اکتفا نہیں کیا۔ مقابلہ پر آ گئے مزاحمت و مقاومت کے تمام حربے استعمال کر ڈالے۔ ایسا کم ہوا کہ انہوں نے دعوتِ اسلام تحمّل اور نرم خوئی کے ساتھ سنی ہو۔ اکثر ایسا ہوا کہ تشدد، رعونت اور گستاخی کے ساتھ یہ ردّ دعوت پر اتر آئے۔ آپ کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے دعوتِ اسلام قبول کر لی تھی طرح طرح کی تکلیفیں اور روح فرسا اذیتیں دینے لگے۔ ان کی زبان دلوں پر چرکے لگا رہی تھی۔ اور ان کے ہاتھ طرح طرح کے دکھ پہنچا رہے تھے۔

رفتہ رفتہ باقاعدہ ایک محاذِ جنگ قائم ہو گیا۔

ایک طرف تن تنہا آپ تھے یا آپ کے چند رفقاء اور یہ سب کے سب بے سر و سامان تہی مایہ اور تہی دامن، دوسری طرف پوری قوم تھی اور اس کے اشراف و اعیان۔ اور ان سب کے پاس ہر طرح کے وسائل و ذرائع تھے۔ نہ مال و دولت کی کمی تھی، نہ دوسرے اسلحہ اور سامانِ جنگ کی قلت۔

اس جہاد میں آپ کی سپر تھی "صبر"!

اور اسی کا آپ کو حکم بھی دیا گیا تھا۔ آپ کو تاکید تھی کہ اللہ کے رستے میں مشقتیں اور تکلیفیں خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کریں۔

آپ خود بھی صبر سے کام لیتے تھے۔ اور اپنے متبعین اور مقلدین کو بھی تاکید فرماتے تھے کہ کسی حالت میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ اور یہ کوئی انہونی بات نہ تھی۔ اصحاب عزیمت و استقامت کو ایسے نامساعد اور روح فرسا حالات سے دوچار ہونا ہی پڑا کرتا ہے انہیں گوناگوں فتنہ و عذاب کا مقابلہ کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔

اس اثنا میں نزولِ وحی کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ جو کچھ بذریعہ وحی آپ پر نازل ہوتا۔ اسے ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے تھے۔ اور ان لوگوں کو ابھی تک جو ایمان نہیں لائے تھے۔ آپ سناتے رہتے تھے۔ کیونکہ اب آپ کی دعوت عام تھی۔ اور پیغامِ رسالت ہر شخص تک پہونچانے پر آپ مکلف اور مامور تھے۔

اس پیغامِ الٰہی کو آپ پوری دیانت و امانت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ تبلیغ کے فریضے میں آپ شب و روز منہمک تھے۔ آپ ڈرانے بھی تھے اور خوش خبری بھی دیتے تھے۔ ترہیب سے بھی کام لیتے تھے اور ترغیب سے بھی۔ خصومت کرنے والوں سے مجادلہ جاری تھا۔ ان کے دلائل کا حجۃ اللہ سے آپ جواب دیتے تھے۔ نہ آپ میں کوئی جھجک تھی، نہ بے حوصلگی۔

قریش آپ کی دعوت و تبلیغ سے تلملائے ہوئے تھے۔ لیکن ——— لیکن آپ کو بہت زیادہ ایذا دیتے ہوئے یا جلا وطن کرتے ہوئے یا قتل کرتے ہوئے ڈرتے بھی تھے۔ کیوں کہ اندیشہ تھا کہ اگر ایسا کیا تو بنی عبد مناف سے ٹھن جائے گی۔ اور ایسا ہوا تو بات سلجھنے کے بجائے اور زیادہ الجھ جائے گی۔ چنانچہ قریش کے بردبار اور نرم خو لوگ "تدبّر" کے ساتھ آپ کی دعوت کا توڑ کرنے کی سعی میں لگے رہتے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ قبل اس کے کہ صورتِ حال حد درجہ نازک اور پیچیدہ ہو جائے کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ معاملہ طے ہو جائے۔ چنانچہ آپ کو پیش کش کی گئی کہ اگر بادشاہت چاہتے ہو تو ہم بے چون و چرا آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کیے لیتے ہیں۔ اگر دولت و ثروت کی آرزو ہے۔ تو ہم سیم و زر کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں۔ مالدار اور غنی ہو جائیے اور اگر یہ دعوت و تبلیغ جنوں اور روحوں کی کرشمہ سازی ہے تو ہمارے پاس اس کا بھی بندوبست ہے۔ ہم اچھے سے اچھے طبیب اور ٹونے ٹوٹکے کرنے والوں کی خدمات حاصل کریں گے اور اس وقت تک دم نہیں لیں گے۔ جب تک آپ بالکل بھلے چنگے نہ ہو جائیں۔

لیکن ان ساری کشش انگیز پیش کشوں کا جواب کیا تھا ——— ؟
ان آیات کی تلاوت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وقتاً فوقتاً نازل ہوا کرتی تھیں

———— ❖ ————

قریش کے حلیم اور بردبار اور انصاف پسند لوگ ۔ جب آپ تلاوت کرتے تو قرآن سنتے تھے ۔ اور اس کے لفظ و معنیٰ اور نظم و رفت پر دنگ اور مبہوت ہو کر رہ جاتے تھے ۔ وہ محسوس کرنے لگتے تھے ۔ یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا ۔

لیکن با ایں ہمہ وہ اسلام نہیں قبول کرتے تھے ۔ بعض حسد کے باعث اس سعادت سے محروم تھے ۔ بعض کبر و نخوت کے سبب اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے ۔ اور اس وقت تو ان کا جوش غضب حد سے باہر ہو جاتا تھا جب انہیں نیکی بھلائی ، عدل مساوات اور انصاف ——— امیروں کے مقابلے میں غریبوں سے انصاف ——— طاقتور کے مقابلے میں کمزور سے انصاف ——— اور ان خداؤں کو ترک کر دینے ، ان عادتوں سے باز آجانے اور اس اخلاق سے کنارہ کش ہو جانے کی دعوت دی جاتی تھی جو ان کے آباؤ اجداد کا شعار رہا تھا ۔ اور سلف سے خلف تک نسلاً بعد نسل متوارث طور پر منتقل ہوتا چلا آ رہا تھا ۔

آخر کار جب یہ بالکل مایوس ہو گئے تو ایک روز آپ کے چچا سے مدد کے طالب ہوئے ۔ جنہوں نے بچپن سے ریعان شباب تک آپ کی کفالت کی اور آپ کو پالا پوسا تھا ۔ اور زندگی کے ہر مرحلے پر اپنے یتیم بھتیجے کی تائید ، حمایت اور پشت پناہی کی تھی ۔ آشفتہ اور دل گرفتہ آموجود ہوئے ۔ اس لیے کہ ان چچا نے اپنی سرپرستی کا ہاتھ بھتیجے کی اس دعوت جدید کے بعد بھی نہیں اٹھایا تھا ۔ اور مطالبہ کیا کہ اپنے اس بھتیجے کو اس دعوت سے روکیں جس نے اپنا شعار بنا لیا ہے کہ ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہتا ہے ، ہمارے نظریہ حیات کو سفاہت قرار دیتا ہے ۔ جو عبادات و اخلاق پشت ہا پشت سے ہم میں رچے اور بسے

ہوئے ہیں ۔ان کے خلاف زہر چکانی کرتا رہتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے غلاموں باندیوں اور حلیفوں کو ——— مساوات انسانی کا درس دے کر ——— ورغلاتا اور بہکاتا رہتا ہے۔

ابو طالب نے ان لوگوں کی بات سن کر اپنے بھتیجے کو بلایا اور بتایا کہ قوم کی طرف سے ترک دعوت وتبلیغ کے صلے میں یہ لوگ کیسی کیسی سحر طراز اور کشش انگیز پیشکشیں لائے ہیں اور انہیں رد کر دینے کی صورت میں ان کی طرف سے قہر وغضب اور بطش وعذاب کے کیسے کیسے اندیشے ہیں۔

لیکن چچا کی یہ نصیحت سن کر بھتیجے نے کیا جواب دیا ——— اس نے کہا:

"خدا کی قسم اے چچا اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج رکھ دیں اور بائیں ہاتھ میں چاند اور چاہیں کہ میں اپنی دعوت وتبلیغ سے باز آجاؤں تو بھی اپنی روش ترک نہیں کر سکتا۔

ابو طالب نے بھتیجے کے یہ الفاظ مشائخ قریش کے کانوں تک پہنچا دیئے اور ظاہر ہے اس کا نتیجہ عناد واستکبار اور اشتعال کے سوا کیا ہو سکتا تھا ؟

ان لوگوں نے سب سے پہلے یہ کیا کہ آپ پر ایمان لانے والوں میں جو لوگ کمزور، بے بس اور بے سہارا تھے۔ یعنی غلام اور دوسرے پسماندہ لوگ پہلے انہیں ہدف ستم بنایا کہ ممکن ہے سختیوں کی تاب نہ لاکر یہ اسلام ترک کر دیں اور پھر سے اپنے آبائی دین ——— کفر ——— میں واپس آجائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کی یہ لرزہ خیز مظلومیت دیکھ کر آپ بھی اس آئینے میں اپنا انجام دیکھ لیں اور دہشت زدہ ہو کر دعوت وتبلیغ سے باز آجائیں۔ اور ان لوگوں کو بھی یہ مشورہ دیں کہ اگر جان عزیز ہے، تو میرا ساتھ چھوڑ دو۔

یہ سوچ کر ان مخالفین دعوت اسلام نے اپنے تمام حربے آزمانا شروع کئے۔ کبھی یہ

آپ کے ساتھیوں کو چار چوٹ کی مار مارتے۔ کبھی انہیں تپتی ریت پر لٹاتے۔ کبھی انہیں ٹھنڈے یخ پانی میں نہلاتے۔ اور کبھی انہیں آغوشِ مرگ سے ہمکنار کر دیتے۔

لیکن یہ ساری ایذا رسانیاں رائگاں گئیں۔ تشدد اور عقوبت سے نہ آپ مرعوب ہوئے نہ آپ کے ساتھی۔

ایک روز ان لوگوں نے جوشِ اشتعال و غضب سے بے بس ہو کر یاسر کو اور ان کی بیوی سمیہ کو ان دونوں کے بیٹے عمار کے سامنے قتل کر دیا۔ لیکن نہ مرتے مرتے یاسر اور سمیہ نے کسی طرح کی کمزوری دکھائی نہ عمار نے۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں ایمان کی بزرگی پر قائم رکھا۔ یاسر اور ان کی بیوی کو خدا نے صبر و تحمل اور عزیمت و استقامت کا نمونہ بنا کر پیش کر دیا۔ انھوں نے بڑی سے بڑی اذیت اس طرح جھیل لی کہ نہ ان کے پائے ثبات میں لغزش ہوئی، نہ ان کی جبین استقامت پر شکن آئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آلِ یاسر کی طرف سے اس وقت گزرے کہ ان پر تشدد کیا جا رہا تھا۔ یاسر کے منہ سے اس موقعہ پر اگر کچھ نکلا تو صرف اتنا:

"یا رسول اللہ بس یہ ہے دنیا"

راویانِ سیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آلِ یاسر صبر کرو تم سے جنت کا وعدہ ہو چکا ہے"

یاسر اور ان کی بیوی سمیہ اسلام میں سب سے پہلے مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

ماں باپ کا یہ روح فرسا انجام دیکھ کر عمار کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی بلکہ ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان کے صبر و استقامت کو دیکھ کر بالآخر جوشِ غضب میں بھرے ہوئے دشمن مایوس ہو گئے اور عقوبت و تشدد کا سلسلہ ختم کر دیا۔

راویانِ آثار و سیر کا بیان ہے کہ عمار بن یاسر وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے اپنے گھر میں مسجد بنائی تھی۔ جس کے بارے میں سورۂ زمر کی یہ آیتیں نازل ہوئیں:

تھیں۔ کہ کسی کی ملامت کا اندیشہ تھا، نہ کسی طرف سے جوابی کاروائی کی فکر۔

لیکن جو لوگ اشراف و اعیان میں سے تھے۔ انہیں بہر حال کسی نہ کسی درجے میں اپنے کنبے اور خاندان کا آسرا تھا۔ لہذا انہیں جسمانی اذیت نہیں پہنچائی جاتی تھی۔ انہیں دلدوز طعنے دیئے جاتے تھے۔ ان پر بدزبانی کے تیر برسائے جاتے تھے۔ ان کا مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا جاتا تھا۔ اور ان کے کنبے والوں کو ان کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا۔ کہ وہ ان پر تشدد کریں۔ اور عرصۂ حیات تنگ کر دیں۔ لیکن یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ جن مسلمانوں کا مقاطعہ کیا۔ جن پر دشنام طرازیاں کی گئیں۔ جن کے خلاف ان کے خاندان اور کنبے کو آتش زیر پا اور مشتعل کیا گیا۔ انہوں نے بھی یہ ساری کڑیاں بغیر کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے جھیل لیں۔ بلکہ بعض نے تو مقاومت اور مزاحمت بھی کی۔ اور ترکی بترکی جواب دینے سے گریز نہیں کیا۔ مثلاً عمر بن الخطاب اور حمزہ بن عبدالمطلب۔

غرض یہ تھی جنگ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مٹھی بھر ساتھیوں، قریش اور ان کے اَن گنت حامیوں اور ہم نواؤں کے مابین پوری قوت اور شدت کے ساتھ جاری تھی۔ اور جنگ کی اس ساری مدت میں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح کی کمزوری نہیں دکھائی نہ اخفاءِ دعوت سے کام لیا۔ نہ مداہنت سے۔ اور آپ کے احباب میں جو قوی اور طاقتور تھے۔ انہوں نے برابر کا مقابلہ نامساعد حالات کے باوجود کیا۔ اور جو ضعیف اور کمزور تھے۔ انہوں نے صبر و استقامت کے ساتھ تمام مصیبتوں اور اذیتوں کو جھیلا۔ بلکہ ان ناداروں اور ضعیفوں میں ایسے باحوصلہ لوگ بھی تھے جو ان تشدائد و مصائب کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اس کے شائق رہتے تھے کہ یہ تشدد اور یہ سختیاں جھیلیں۔ چنانچہ بے دھڑک مجالسِ قریش میں پہنچتے تھے۔ اپنے اسلام کا اعلان کرتے تھے۔ اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان کے ظلم و ستم کا استقبال کرتے تھے۔ مثلاً ابوذر غفاری کہ انہوں نے جب اسلام قبول کیا۔

امّن ھو قانت اناء اللیل	یعنی بھلا جو شخص اوقات شب میں سجدہ
ساجدا و قائما، یحذر	و قیام (نماز) کی حالت میں عبادت کر رہا ہو
الاخرۃ ویرجو رحمۃ ربہ	آخرت سے ڈر رہا ہو اور اپنے پروردگار کی رحمت
قل ھل یستوی الذین	کی امید کر رہا ہو۔ آپ کہیے کیا علم والے اور
یعلمون والذین لا یعلمون	جہل والے (کہیں) برابر ہوتے ہیں؟ وہی لوگ
انما یتذکر اولوا الالباب ٥	عقل پکڑتے ہیں جو صاحبِ عقل (سلیم) ہیں۔"

—:—

اسلام کے ان دشمنوں نے بلال کو بھی طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائیں۔ اور انہیں بچوں اور نادانوں کے لیے ایک تماشہ بنا دیا۔ اور عذاب و اذیت کا سلسلہ اس وقت تک جاری رکھا۔ جب تک حضرت ابوبکر نے انہیں خرید نہیں لیا۔ بلال غلام تھے۔ ابوبکر نے خرید کر آزاد کر دیا۔

—:—

یاسرؓ اور بلالؓ کے علاوہ بھی بہت سے لوگ تھے ——— تفصیل کتب سیر سے فراہم ہو سکتی ہے ——— جنہیں فتنہ و عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ اور سخت ترین اذیتیں دی گئیں۔ وہ برسہا برس تک دکھ جھیلتے رہے۔ لیکن چٹان کی طرح اپنی جگہ جمے رہے۔ کیا مجال ہے جو ان کے تیوریں ذرا فرق آیا ہو۔ یہ بے سہارا اور پسماندہ لوگ اب صرف ہدف ستم بننے کے لیے تھے۔ ان سے جو عہد قریش کا تھا۔ وہ فوت ہو چکا تھا۔ ان کا جو ذمہ تھا۔ اس سے قریش دستبردار ہو چکے تھے ان کے ساتھ پہلے جو کچھ حسن سلوک ہوتا بھی تھا تو اب وہ قصۂ ماضی بن چکا تھا۔

—:—

مسلمانوں کے ساتھ قریش کی بدسلوکی اور ظلم و تشدد کے مدارج اور مراحل مختلف تھے۔ جو کمزور، بے سہارا اور پسماندہ تھے۔ انہیں ہر طرح کی جسمانی اذیتیں بے دھڑک پہنچائی جاتی

تو مکے میں مسافر اور غریب الوطن کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اس بات کے جویا تھے کہ اعلان اسلام کر کے قریش کی ٹھوکریں کھائیں۔ طمانچے سہیں اور مبتلائے عذاب ہوں۔ یہاں تک کہ ادھ موئے ہو جائیں۔ چنانچہ اعلان کر کر کے بار بار قریش کے ہاتھ سے پٹتے اور مار کھاتے تھے یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ اپنی قوم میں واپس جائیں اور اس وقت تک وہیں رہیں جب تک کوئی دوسری ہدایت انہیں نہ ملے۔

قریش نے محسوس کیا کہ اب تک انہوں نے جو کچھ کیا ہے اس کا براہ راست اثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ خاص پر کچھ نہیں پڑا ہے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ آتش غضب کے شعلوں میں سارے بنو ہاشم کو جھلس دیں، جب تک یہ لوگ اسلام نہیں لائے تھے، صرف بر بنائے عصبیت و قرابت آپ کی پشت پناہی کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا امید تھی اس حملے کی وہ تاب نہ لا سکیں گے۔

چنانچہ قریش نے فیصلہ کر لیا کہ بنو ہاشم سے لین دین اور کاروبار نہیں کریں گے۔ نہ ان کی لڑکی لیں گے۔ نہ انہیں لڑکی دیں گے۔ نہ ان سے رشتہ و پیوند کے تعلقات رکھیں گے اور نہ کسی درجے میں بھی ان سے ربط ضبط اور میل جول اور معاملت روا رکھیں گے۔ چنانچہ بنو ہاشم مجبور ہو کر ایک گھاٹی میں پناہ گزین ہو گئے۔ اور یہاں ان کی زندگی اس طرح گذر رہی تھی جیسے وہ محاصرے میں ہوں۔ نہ ان سے کوئی بات کرتا تھا، نہ معاملت روا رکھتا تھا۔ حد یہ ہے کہ سامان غذا تک بے انتہا دشواریوں اور صعوبتوں کے بعد اس گھاٹی تک پہنچ سکتا تھا۔

قریش نے باقاعدہ ایک عہدنامہ تحریر کیا تھا۔ جس پر ان کے خاندانوں اور کنبوں کے اشراف و اعیان کے دستخط تھے۔ اور اس معاہدے میں درج تھا کہ جب تک بنو ہاشم محمدؐ سے کنارہ کشی نہ کر لیں اور انہیں قریش کے حوالے نہ کر دیں۔ یہ مقاطعہ جاری رہے گا۔

لیکن پاس حسب نسب سے بنو ہاشم نے محاصرے، مقاطعے اور حمایت کا دور صبر

واستقلال کے ساتھ گذارا۔ اس طرح کئی سال گذر گئے۔ مگر ان کی آن اور شان میں فرق نہ آیا۔ یہاں تک کہ خود محاصرہ کرنے والے اس صورت احوال سے تنگ آ گئے۔ اور ایک دوسرے سے سرگوشیاں شروع کر دیں کہ اس ظالمانہ معاہدے کا "قصّہ ختم" ہونا چاہیئے۔ ان میں سے جو لوگ رقیق القلب تھے وہ اپنے بھائیوں کے اس ابتلا پر کڑھ رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی اس معاہدے کو یوں توڑا کہ اپنی قوم سے چوری چھپے بنو ہاشم تک سامان غذا پہنچانے لگے۔

اور عین اس اثنا میں ابو طالب ایک روز قریش کے پاس گئے اور ان سے دوران گفتگو میں کہا —— جیسا کہ اصحاب سیرت کا بیان ہے —— کہ محمدؐ کا دعوٰی ہے کہ تم لوگوں نے جو معاہدۂ مقاطعہ دیوار کعبہ پر لکھ کر لٹکایا تھا۔ اسے دیمک چاٹ گئی اور اب اس میں سے سوا "اللہ" کے نام کے کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا ہے۔

اس کے بعد ابو طالب نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"اے گروہ قریش میرے ساتھ کعبے تک چلو اور چل کر دیکھو کہ میرے بھتیجے نے جو کچھ کہا ہے وہ امر واقعہ ہے یا نہیں؟ اگر امر واقعہ ہے تو اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نے اپنے قبیلے کی ایک شاخ —— بنو ہاشم —— پر تعدی اور زیادتی کی ہے اور بغیر جائز اور معقول سبب کے اسے ہدف ستم بنایا ہے اور وقت آ گیا ہے کہ اس ظلم بے سبب کا سلسلہ ختم ہو۔ جو کچھ جفا کاریاں تم کر چکے ان پر قناعت کرو اور اب اپنے بھائیوں —— بنو ہاشم —— کے ساتھ عدل اور انصاف کا برتاؤ کرو اور اگر تمہیں وہ معاہدہ اس طرح لکھا ہوا ملے جیسا لکھ کر تم نے آویزاں کیا تھا۔ تو بے شک ہم محمدؐ کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔ پھر جو سلوک تم چاہنا ان کے ساتھ روا رکھنا!"

جن لوگوں کے دل بنو ہاشم کی اس مصیبت اور درگت پر کڑھ رہے تھے۔ انہوں نے پیش قدمی کی اور کہا:

"اے گروہ قریش! ابو طالب نے بڑی کھری اور دو ٹوک بات کہی ہے۔ ان کی بات

مان لینے سے تمہاری مرضی اور تمہارا مطالبہ پورا ہوجاتا ہے۔ اس معاہدے کو چل کر دیکھو اگر وہاں اسے ایسا پاؤ جیسا محمد (ص) نے بتایا ہے تو ابوطالب کی بات مان لو اور اپنے بھائیوں پر جفاکاری اور ظلم آرائی کا یہ سلسلہ ختم کردو۔ ورنہ انہوں نے وعدہ کرلیا ہے کہ بصورتِ دیگر محمد (ص) کو تمہارے حوالے کردیں گے۔"

قریش نے یہ بات مان لی اور معاہدے کو دیکھا تو واقعی اسے دیمک چاٹ چکی تھی صرف لفظ "اللہ" جوں کا توں موجود تھا۔

اس کے بعد قریش نے بنوہاشم کا محاصرہ اٹھالیا اور یہ لوگ عافیت کے ساتھ واپس آگئے۔

بلاشبہ بنوہاشم محاصرے کی شدت سے آزاد ہوگئے۔ لیکن جہاں تک اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق تھا، ان پر جو ظلم ہورہے تھے۔ ان میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح اب بھی ایذا کی چکی میں پیسے جارہے تھے۔ فتنہ و عذاب کی یورش عہدِ ماضی کی طرح اب بھی ان پر جاری تھی۔

اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاں تک تعلق ہے آپ بھی لگاتار شدید امتحان و ابتلاء کے دور سے گزر رہے تھے۔ سب سے پہلے آپ کی رفیقۂ حیات اور مونس جاں خدیجہؓ کا انتقال ہوا۔ یہ بیوی تھیں جو بعثت کی خبر سن کر سب سے پہلے آگے بڑھیں تھیں، اسلام لائی تھیں، اور نصرت و اعانت کے لیے وقف ہوگئی تھیں۔

اس کے بعد ابوطالب کا انتقال ہوگیا۔

وہ ابوطالب ہی تھے جنہوں نے بچپن میں آپ کی کفالت کی۔ ہر نازک گھڑی پر سہارا اور پشت پناہ بن کر نمودار ہوئے۔ جو مصیبت آپؐ پر آئی اس کے لیے سینہ سپر ہوگئے۔

اگرچہ انہوں نے آپ کا دین نہیں قبول کیا تھا اور دین آبا سے دستکشی نہیں اختیار کی تھی لیکن آپ کی محبت سے مجبور ہو کر، بھائی کی اس یادگار کو چشم زخم سے بچانے کے لیے یہ سب کچھ کر گزرے تھے

ان حوادث نے قریش کو اور زیادہ بے لگام اور مسلمانوں کو کہیں زیادہ بے آسرا کر دیا مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا اور قریش آپ کی ذاتِ خاص کو ہدف بنانے کی سعی کرنے لگے۔

چنانچہ آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جو ہجرت کر سکتا ہو وہ بلادِ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائے۔ وہاں وہ امن اور عافیت کے ساتھ خدا کی پرستش کر سکیں گے۔ اور کسی فتنہ و عذاب سے دوچار نہیں ہوں گے۔ چنانچہ جن لوگوں میں استطاعت تھی۔ انہوں نے ہجرت اختیار کر لی اور اس سرزمین دور و دراز میں امن و عافیت کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ لوگ جو آپ کا فراق نہ برداشت کر سکے مکے میں رہے، اور گوناگوں مصائب اور شدائد سہتے رہے۔ ہر اذیت اور مصیبت کے موقع پر ان میں اگر کسی چیز کی زیادتی ہوتی تھی۔ تو وہ ایمان تھا اور عزم و استقلال!

ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے نکل کر طائف کے سفر پر روانہ ہوئے۔ آپ کو امید تھی کہ قبیلۂ ثقیف کی طرف سے آپ کی مدد کی جائے گی۔ اور وہ اچھے پڑوسی ثابت ہوں گے۔ اور وہاں پیامِ رسالت امن کے ساتھ پہنچایا جا سکے گا۔

لیکن ثقیف کا برتاؤ بھی حد درجہ سنگ دلانہ اور مایوسانہ ثابت ہوا۔ انہوں نے صرف دعوتِ اسلام کے قبول کرنے سے اعراض و انکار ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے غنڈوں اور آوارہ گرد چھوکروں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ انہوں نے آپ کو اتنا ستایا اور

پریشان کیا کہ درماندگی کے عالم میں ایک باغ کے پاس پہنچے اور وہاں ایک درخت کے سایے میں تشریف فرما ہوگئے۔

اس باغ کا حق ملکیت دو آدمیوں کو حاصل تھا۔ اور یہ دونوں کے دونوں قریش تھے۔ ان میں سے ایک کا نام عتبہ بن ربیعہ تھا دوسرا اس کا بھائی شیبہ تھا۔ ان دونوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ درماندگی کے عالم میں ان غنڈوں اور چھوکروں سے بچنے کے لیے باغ کے سایۂ شجر میں آکر تشریف فرما ہوئے ہیں۔

اصحابِ سیرت کا بیان ہے کہ ان قریشیوں کا یہ منظر دیکھ کر دل پسیجا۔ لیکن بے بس تھے، بھلا قریش کے معتوب و مقہور کو کس طرح مدد دیتے؟ یا پشت پناہی کے جرم کا ارتکاب کرتے؟ انہوں نے اپنے غلام عداس کو طلب کیا۔ اور اس کے ہاتھ کھجور کا ایک طبق بھیجا۔

عداس آپ کی خدمت میں آیا اور باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں اس کے آقاؤں نے دیکھا کہ وہ رو رہا ہے اور آپ کے قدموں پر جھکا ہوا ہے۔ اس پر ایک طرح کی والہانہ کیفیت طاری ہے۔

جب وہ اپنے آقاؤں کے پاس واپس آیا۔ تو انہوں نے سوال کیا:

"یہ کیا کر رہے تھے تم؟"

معلوم ہوا یہ غلام جہاں تک دین اور عقیدے کا تعلق ہے ہاتھ سے گیا۔ یہ اس نئے داعیٔ دین کا دل سے پیرو ہوچکا تھا جسے ثقیف نے ایذا دی تھی اور جس کی ضیافت اس کے آقا نہیں کر سکے تھے۔

اس واقعے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکے واپس آگئے۔ اس مرتبہ جب آپؐ داخل مکہ ہوئے تو یکے از اشراف مکہ مطعم بن عدی نے آپؐ کو پناہ دی۔

اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم حج کا انتظار کرنے لگے کہ قبائل عرب کے سامنے اپنی دعوت پیش کریں اور دیکھیں کون اسے گوش ہوش سے سنتا ہے اور کون رد کر دیتا ہے؟

قبائل عرب نے یہ دعوت رد کردی۔ ایک تو اس لیے کہ وہ بدخو تھے اور دوسرے اس لیے کہ وہ قریش کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ موسم حج میں اہل یثرب کے ایک گروہ کے سامنے آپؐ نے دعوتِ اسلام پیش کی۔ یہ لوگ اس دعوت کی طرف مائل نظر آئے۔ ان کے دل آپؐ کی طرف کھنچ رہے تھے۔ لیکن بات کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ دوسرے سال پھر اہل یثرب کی جماعت آئی۔ اس مرتبہ ان لوگوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کرلی۔ اور عہد کیا کہ آپ کو پناہ دیں گے۔ آپؐ کی تا بُد حمایت میں جان لڑا دیں گے۔ یہ عہد آپؐ کے اور اہل یثرب کے مابین پختہ ہوگیا۔ آپؐ خوش خوش گھر واپس آگئے۔

اس کے بعد آپؐ اپنے اصحاب کو یثرب کی طرف ہجرت کا حکم دینے لگے۔ جو لوگ کمزور اور بے مایہ تھے وہ چپ چپاتے ہجرت کو نکل کھڑے ہوئے۔ جو طاقتور اور باحوصلہ تھے وہ کھلے بندوں ہجرت پر روانہ ہوئے۔

یثرب میں اسلام پھیلنے لگا۔ بہت سے گھر تھے جن میں قرآن کی تلاوت ہوا کرتی تھی۔

لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اب تک مکے میں مقیم تھے۔ وہ حکم الٰہی کے منتظر تھے۔ بغیر اس کے یثرب کی طرف آپ کے قدم کیسے اٹھتے؟

جب یہ حکم مل گیا۔ تو آپؐ کے رفیق و ہمدم ابوبکرؓ نے اجازت چاہی کہ وہ بھی اس سفر میں ہمرکاب رہیں گے۔ آپؐ نے یہ عرضداشت قبول کرلی۔

قریش سے یہ بات چھپی نہ رہی کہ آپؐ سے اور اہل یثرب سے معاہدہ طے پاچکا ہے۔ اور آپؐ کے اصحاب تھوڑے تھوڑے کرکے وہاں ہجرت کرکے جارہے

ہیں۔ یہ دونوں باتیں ان کے لیے حد درجہ نا مرغوب اور ناپسندیدہ تھیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ کہ آپؐ یثرب ہجرت کر جائیں۔ اس کے بعد آپؐ اور اہل یثرب ان کے دشمن ہو جائیں۔

چنانچہ یہ لوگ اس اہم مسئلے پر غور و فکر کرنے کے لیے بیٹھے۔ اس رائے پر اتفاق ہو گیا کہ رات بھر خانۂ نبیؐ کی نگرانی کی جائے۔ جب آپؐ بر آمد ہوں تو ایک جماعت جس میں ہر قبیلے کا ایک ایک نمائندہ شامل ہو آپ پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہی وار میں قتل کر دے۔ پھر آپؐ کے قصاص کا مطالبہ نہیں کیا جا سکے گا۔ کیونکہ جملہ قبائل سے کون یہ مطالبہ کر سکتا ہے؟ لہذا بنو عبد مناف مجبور ہو جائیں گے کہ آپ کے خون سے درگزر کریں۔

رواۃ کا بیان ہے کہ رات بھر قبائل قریش کے نمائندوں پر مشتمل ایک جماعت بیت النبیؐ کا پہرہ دیتی رہی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس واقعہ یعنی مکر قریش کی خبر کر دی چنانچہ آپ اس رات اپنے بستر پر نہیں سوئے۔ آپؐ نے اپنے ربیب اور ابن عم علیؓ کو حکم دیا کہ وہ آپؐ کے بستر پر سو جائیں۔ اور آپؐ کی چادر اوڑھ لیں۔ اسی اثناء میں پہرہ دینے والوں کو اونگھ آ گئی۔ اور آپؐ صاف بچ کر نکل گئے۔

راویوں کا بیان ہے کہ چلتے وقت آپؐ نے تھوڑی سی خاک ان پہرہ دینے والوں کے سر پر ڈال دی۔ اور ابو بکرؓ کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ یہ دونوں چشم مردم سے بچتے غار ثور تک پہنچ گئے۔ اور یہاں اس وقت تک کے لیے پناہ گزیں ہو گئے۔ جب تک قریش آپ کی تلاش و جستجو میں ناکام اور مایوس نہ ہو جائیں۔ اس غار میں تین روز تک آپ کا قیام رہا۔ اور ہر روز کھانا پہنچتا رہا۔

اصحاب سیرت کا بیان ہے کہ صبح کو پہرہ دینے والوں کو پتہ چلا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بچ کر نکل گئے۔ اور وہ غفلت میں اونگھتے رہ گئے۔ اب قریش اور زیادہ جوش و سرگرمی

کے ساتھ آپؐ کی جستجو کرنے لگے۔

اصحابِ سیرت بیان کرتے ہیں کہ آپؐ کی جستجو اور تلاش کرنے والوں میں سے کچھ لوگ غارِ ثور کے دہانے پر پہنچ گئے۔ جہاں آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ پناہ گزین تھے۔ لیکن ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ دونوں یہاں پناہ گزین ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ اپنے پاؤں کے نیچے دیکھ لیتے تو فوراً ان کی نظر آپ پر اور ابوبکرؓ پر جا پڑتی۔

یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ ابوبکرؓ اس قلق میں پیکرِ اضطراب بنے ہوئے تھے کہ کہیں قریش اپنی طلب و جستجو میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاں تک تعلق ہے آپؐ پر سکون اور اطمینان کامل کی کیفیت طاری تھی۔ جیسا کہ سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

الا تنصروہ فقد نصرہ	یعنی!
اللہ اذ اخرجہ الذین	اگر تم لوگ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی
کفروا ثانی اثنین اذ	مدد نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد اس وقت
ھما فی الغار اذ یقول	کر چکا ہے جب آپ کو کافروں نے جلاوطن
لصاحبہ لا تحزن ان	کر دیا تھا۔ جبکہ دو آدمیوں میں سے ایک آپ
اللہ معنا ۔ فانزل اللہ	تھے جس وقت کہ دونوں غار میں تھے آپ اپنے
سکینتہ علیہ و ایدہٗ بجنود	ساتھی سے فرما رہے تھے۔ غم نہ کرو۔ بلاشبہ خدا ہمارے
لم تروھا وجعل کلمۃ	ساتھ ہے۔ سو اللہ نے آپ کے قلب پر اپنی (طرف سے)
الذین کفروا السفلیٰ و	تسلی نازل فرمائی اور آپ کو ایسے لشکروں سے قوت
کلمۃ اللہ ھی العلیا ۰	دی جنہیں تم لوگوں نے نہیں دیکھا۔ اور اللہ نے کافروں
واللہ عزیز حکیم ۰	کی بات (اور تدبیر) نیچی کر دی۔ اور اللہ ہی کا بول
	بالا رہا۔ اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

ابو بکرؓ نے سارا ساز و سامان سفر مہیا کر رکھا تھا۔ جب ان دونوں نے یہ اندازہ کر لیا کہ اب قریش کے پائے طلب تھک چکے ہیں۔ تو یثرب کی طرف چل پڑے اور بہت جلد وہاں پہنچ گئے۔ جہاں آپؐ کا بہترین استقبال ہوا۔ آپؐ کے انصار اوس اور خزرج پر نشاط و سرور کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور جو مہاجرین یہاں پہلے سے پہنچ چکے تھے ان کی مسرت کا بھی کیا کہنا۔

جس روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم یثرب میں داخل ہوئے اسی دن سے آپؐ کے اور آپؐ کی دعوت کے لیے ایک نیا راستہ کھل گیا۔

(۱۳)

ہجرت

○

دعوتِ اسلام کی بنیاد و اساس، معراج، کفار کے اعتراضات کا جواب

بعثت کے بعد سے ہجرت تک مکّے میں آپ کا قیام تیرہ سال تک رہا جیسا کہ جمہور رواۃ کا بیان ہے۔ تیرہ سال کی اس مدت میں کفار قریش کی طرف سے آپ کو جو اذیتیں دی گئیں اور جس جس طرح آپ کے رستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ اور جس طرح آپ پر عرصۂ زیست تنگ کیا گیا۔ وہ ایک دلگداز اور لمبی کہانی ہے۔ یہ ساری مدت آپ نے انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ گزاری۔ اسی طرح آپ کے اصحاب نے بھی ہر قسم کے فتنہ و عذاب کے مقابلے میں انتہائی صبر و استقامت اور استقلال کا ثبوت دیا۔

تیرہ سال کی اس مدت میں قرآن کریم کا بیشتر حصہ مکے میں نازل ہوا۔

مکے میں آپ کی دعوت جن بنیادوں پر قائم تھی۔ وہ حسب ذیل تھیں:

(۱) آپ لوگوں کو خدائے یکتا کی طرف بلاتے تھے۔

(۲) شرک اور بت پرستی سے باز رہنے کی تلقین فرماتے تھے

(۳) عدل کی تاکید فرماتے تھے۔

(۴) جور وجفا سے روکتے تھے۔

(۵) بہ بانگِ دہل اس بات کا اعلان فرماتے تھے کہ خدا کی بارگاہ میں تمام انسان یکساں ہیں۔ کسی کو کسی پر فضیلت اور امتیاز حاصل نہیں ہے۔ البتہ فضیلت اور امتیاز نیکی اور تقویٰ کی بنا پر ضرور ہے۔ جو جتنا زیادہ نیک اور متقی ہے۔ خدا کی بارگاہ میں اس کی اتنی ہی زیادہ پوچھ ہے۔

(۶) آپؐ ان لوگوں کو جو مبتلائے شرک تھے۔ اور کسی کو خدا کا ساجھی قرار دینے میں حیات بعد از مرگ کی سزا اور عقوبت سے ڈراتے تھے۔ اور بتاتے تھے کہ یہ دنیا جس میں لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں، قیامت کے دن ختم ہو جائیگی۔ اور قیامت کا دن بڑا ہولناک ہوگا۔ جس روز یہ دن آئے گا۔ اس دن لوگ سہمگیں اور دہشت زدہ ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائیں گے۔ ماں اور باپ کو اولاد کا ہوش نہیں رہے گا۔ نفسی نفسی کا دور ہوگا۔ انسان اپنے سوا سب کو اور سب کچھ فراموش کر دے گا۔ وہ پیکرِ اضطراب و اضطرار بنا ہوا ہوگا۔

(۷) قیامت کے دن آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ستارے جھڑ جائیں گے۔ دریا پھٹ جائیں گے۔ قبریں الٹ جائیں گی اور ———

(۸) قیامت کے دن انسان جان لے گا کہ اس نے کیا کیا تھا؟ اس کے عمل کی پونجی کیا ہے؟

اس طرح آپؐ لوگوں کو روزِ قیامت سے ڈراتے رہتے تھے۔ اور انہیں بتاتے تھے کہ روزِ قیامت یوم حساب بھی ہوگا۔ انسان نے جو کچھ کیا ہے۔ فردِ عمل اس کے سامنے ہوگی۔ اور جتنے بھی چھوٹے بڑے یا اچھے برے کام اس نے کئے ہیں۔ سب آنکھوں کے سامنے آ جائیں گے۔ کیونکہ انسان نے جو کچھ کیا ہے وہ فردِ عمل میں لکھا جاتا رہا ہے۔ اور وہی فردِ عمل

ایک کھلی ہوئی کتاب کی مانند اس کے سامنے ہوگی۔ وہ خود ہی اپنے حسنات وسیئات کا اندازہ کرلے گا۔ دوزخ اس کے سامنے بھڑک رہی ہوگی۔ اور باغ جنت کی شمیم انگیزیوں سے بھی واقف ہوگا۔ دوزخ کو دیکھ کر اس کا ہر بن مو بید لرزاں کی طرح کانپنے لگے گا۔ اور جنت کو دیکھ کر اس پر نشاط و سرخوشی اور اہتزار ومسرت کا عالم طاری ہو جائے گا۔ وہ دوزخ سے ڈرے گا۔ اور جنت کا آرزومند ہوگا۔ لیکن جو فرد عمل اس کے سامنے ہوگی۔ وہ اس کا فیصلہ کردے گی کہ اسے دوزخ میں جانا ہے یا جنت میں۔ اس پر رائی کے دانے برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔ برائیوں کا بدلہ اتنا ہی ملے گا۔ جنتی وہ ہوں گی۔ اور نیکیوں کا بدلہ کئی گنا ملے گا۔ برائیوں کے شمار کے وقت ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ البتہ میزان حسنات کا پلہ اگر بھاری ہوا تو برائیوں میں کمی ضرور کردی جائے گی۔ اس روز انسان اپنی آنکھوں سے سب کچھ اپنے بارے میں دیکھ لے گا۔ اور جان لے گا۔

اور اس روز سب سے ابتر حالت کافروں کی ہوگی۔ جب وہ اپنی فرد عمل دیکھیں گے تو کہیں گے:

یا ویلتنا مالھذا الکتاب
لایغادر صغیرۃ ولا
کبیرۃ الا احصاھا و
وجدوا ما عملوا حاضرا
ولا یظلم ربک احداہ

یعنی:
ہائے بدبختی، یہ کیسی کتاب ہے جس نے چھوٹی بڑی کوئی بات نہیں چھوڑی ہے بجز اس کے کہ اسے شمار میں لے لیا ہے۔ یہ کافر اس روز اپنے عمل کو اپنے سامنے موجود پائیں گے اور تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا

اور جب لوگوں کے عمل کے مطابق ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ تو اصحاب نعیم جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ جہاں وہ سدا رہیں گے۔ اور اصحاب جحیم دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے جہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ اگر یہ لوگ مشرک ہوں گے تو یہ ایک بے

اور دوزخ ان کے لیے تیار ہے۔ پھر وہ اسی راستے کے رہرو بن جائیں گے جو مشرکوں کا ہے اور اسی سلوک کے بھی سزاوار ٹھہریں گے۔ جو مشرکین کے ساتھ کیا جائے گا۔ پھر ان کا کوئی عمل قبول نہیں کیا جائے گا۔ نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہو گی۔ نہ انہیں مہلت دی جائے گی

اور یہ اہل طغیان و تمرد، اکثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اور جو کچھ آپ تلاوت کرتے تھے اس پر فقرے کسا کرتے تھے۔ وہ یہ مطالبہ بھی کرتے تھے کہ اگر آپ واقعی سچے ہیں۔ تو اپنے صدق پر کوئی مسکت دلیل لایئے۔

اس مطالبے کے جواب میں آپ قرآن کی وہ آیات تلاوت کرتے تھے جن میں اس تمسخر کا شافی جواب تھا۔ ان آیات کے بارے میں آپ قرآن کی زبان سے فرماتے تھے کہ یہ کلام الٰہی ہے جس کا مثل کوئی انسان نہیں پیش کر سکتا۔ یہ بات آپ تحدّی کے انداز میں کہتے تھے۔ اور ان تمسخر کرنے والوں سے کہتے تھے کہ اگر ان کے بس میں ہے تو اس قرآن کا جواب لائیں۔ اور واقعی وہ قرآن کا مثل پیش کرنے سے قاصر تھے اور یہ اس بات کی دلیل تھی کہ یہ کلام واقعی کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ یہ صرف خدا کا ہو سکتا ہے۔ نہ جس کا چربہ اڑایا جا سکتا ہے، نہ جس کی نقل کی جا سکتی ہے۔ نہ (اپنے انداز میں) جس کی تقلید کی جا سکتی ہے۔

آپ ایسے مواقع پر سورۂ اسرائیل کی یہ آیات تلاوت فرمایا کرتے تھے:

قل لئن اجتمعت الجن	یعنی:
والانس علی ان یاتوا	(اے محمدؐ) ان (کافروں) سے کہدیجیے کہ اگر جن و
بمثل هذا القرآن لا	انس جمع ہو کر کوشش کریں کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں
یاتون بمثله ولو کان	تو وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اگرچہ ایک
بعضهم لبعض ظهیرا ۰	دوسرے کی پشت پناہی اور مدد کر رہے
	ہوں"

اندازہ مدت تک وہاں مقیم رہیں گے۔ جس کا قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اللہ تعالےٰ ان دوزخیوں کو اگر چاہے تو معاف کر دے گا۔ جن سے معصیت (نہ کہ شرک کا) ارتکاب ہوا ہے۔ اور ایمان لانے کے بعد جن سے کچھ سیئات سرزد ہو گئے ہیں

قریش یہ ساری باتیں سنتے تھے اور پوری شدت و رعونت کے ساتھ ان سچی باتوں کو ماننے سے انکار کر دیتے تھے۔ جو شخص ان کے سامنے آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتا تھا اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے۔ کیونکہ اس تلاوت آیات قرآنی کے ذریعہ انہیں بتایا جاتا تھا کہ مشرکین پر اور ان کے مشرک آبا و اجداد پر ہمیشگی کا عذاب مسلّط ہوگا۔ اور یہ مشرک جو دعوتِ اسلام کا انکار کر رہے ہیں۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب اپنے جیسے دوسرے مشرکوں اور اپنے آباء و اجداد سے جہنم میں جا ملیں گے۔ اور اس عذابِ مقیم میں شریک ہو جائیں گے جو ان پر کیا جا رہا ہے البتہ اگر وہ دین آبا سے کنارہ کشی کر لیں۔ بت پرستی کا شعار ترک کر دیں اور صرف خدائے واحد کی عبادت کو اپنا وظیفہ حیات قرار دے لیں۔ اور کسی صورت اور کسی درجے میں بھی شرک کا ارتکاب نہ کریں۔ اور کسی کو خدا کا ساجھی نہ بنائیں اور اس بات پر ایمان لے آئیں کہ یہ محمد(ص) جو ان کے سامنے قرآن کی یہ آیتیں تلاوت کر رہا ہے۔ اللہ کا رسول ہے اور ان کے پاس حق اور بینات کے ساتھ آیا ہے۔ تو بیشک وہ عذابِ مقیم سے بچ جائیں گے۔

اور ———

اور صرف یہی نہیں کہ زبان سے اسلام کا کلمہ پڑھ لیا۔ خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اقرار کر لیا۔ اس اقرار کی تائید عمل سے ہونی چاہیے۔ اگر وہ سچے دل سے ایمان لاتے ہیں تو ان کی زندگی کو تعلیماتِ اسلامی کا پرتو ہونا چاہیے۔ نبی (ص) انہیں جس چیز سے روکے اس سے باز آجائیں۔ جس بات کا حکم دے اس کی تعمیل دل و جان سے کریں۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے۔ رسول کے امر و نہی کی پابندی نہیں کرتے تو اللہ ان کے عمل کو دیکھنے اور پرکھنے والا ہے

لیکن یہ بات ان کافروں کے ذہن و دماغ میں نہیں اترتی تھی کہ ایک انسان اور خدا کے مابین اس طرح وحی کا سلسلہ قائم ہو سکتا ہے اور اس میں خدا کی جانب سے ایسا کلام نازل ہوتا ہے جس کا مثل نہیں لایا جا سکتا۔ اور وہ ایسا ہے کہ تحدّی کے ساتھ ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کا مثل لا دکھائیں۔

لہذا وہ اپنے مطالبات کی نوعیت دوسری کر دیتے تھے۔ وہ مطالبہ کرتے تھے کہ یہ مثل والی بات تو جانے دی جائے اور ان کے سامنے ایسی نشانیاں لائی جائیں کہ وہ ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں۔

وہ آپ سے مطالبہ کرتے تھے کہ زمین پھٹے اور اس میں سے چشمہ ابل پڑے یا وہ کھجور یا انگور کا باغ پیدا کر کے (بطورِ معجزہ) دکھا دیں۔ جس کے درمیان سے نہریں بہہ رہی ہوں۔ یا ان کا (کافروں) پر آسمان ٹوٹ پڑے۔ یا اللہ کو اور فرشتوں کو بہ چشم خود دیکھ لیں یا آپ اپنے لیے ایک موتی محل (بطورِ معجزہ) تیار کر کے دکھا دیں یا آسمان پر چڑھ کر دکھا دیں۔ اور پھر وہاں سے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے اتریں۔

کفار کی اس تحدی اور ان مطالبات کے جواب میں اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا تھا کہ یہ بلیغ ترین جواب مرحمت فرمائیں:

سُبْحَانَ رَبِّيْ ، هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ٥

یعنی: سبحان اللہ! میں تو صرف ایک آدمی ہوں اور خدا کا رسول بھی۔

بعض کفار آپ کے سامنے بوسیدہ ہڈیاں لاتے تھے اور انہیں مَل دَل کر ہوا میں اڑا دیتے تھے اور اس کے بعد تمسخر اور مذاح کے لہجے میں گویا ہوتے تھے۔ کیا ان میں بھی کہ یہ گل چکی ہیں زندگی پیدا کی جا سکتی ہے؟

اس کا جواب بھی قرآن ہی سے دیتے تھے۔ سورہ یٰسین کی ان آیات سے:

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ۝ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُم ۚ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ۝ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَن يَقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

یعنی:

آپ (اے محمدؐ) جواب دے دیجیے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا۔ جس نے اول بار انہیں پیدا کیا ہے۔ اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے۔ وہ ایسا (قادر) ہے کہ ہرے درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کر دیتا ہے پھر تم اس سے اور آگ سلگاتے ہو۔ اور جس نے زمین و آسمان پیدا کئے ہیں کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے آدمیوں کو (دوبارہ) پیدا کر دے؟ ضرور وہ قادر ہے۔ اور وہ بڑا پیدا کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے۔ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا معمول یہ ہے کہ کہہ دیتا ہے "ہو جا!" پس وہ ہو جاتی ہے۔ تو اس کی پاک ذات ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہے اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے"!

اور یہ کفار جس چیز میں بہت زیادہ جھگڑتے تھے۔ بعث کا مسئلہ تھا یعنی مر کر دوبارہ زندہ ہونے کا۔ جیسا کہ قرآن مجید کی سورۃ اسرائیل میں وارد ہوا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے:

أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۝

یعنی:

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر کر ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا اور زندہ کئے جائیں گے؟

جواب بھی اسی سورۃ میں موجود تھا:

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ
حَدِيْدًا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا
يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ فَسَيَقُوْلُوْنَ
مَنْ يُّعِيْدُنَا ہ قُلِ الَّذِيْ
فطركم اول مرة ۔ فسينغضون
اِلَيْكَ رؤوسهم و يقولون
متى هو؟ قل عسى اَن
يكون قريبًا ہ يوم يدعوكم
فستجيبون بحمده وتظنون
ان لبثتم اِلَّا قليلًا ہ

یعنی:
آپ (جواب میں) فرما دیں کہ تم پتھر یا لوہا یا اور کوئی مخلوق ہو کر دیکھ لو جو تمہارے ذہن میں بہت ہی بعید ہو۔ اس پر سوال کریں گے وہ کون ہے جو ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟ آپ فرما دیں۔ وہ ہے جس نے تمہیں اول بار پیدا کیا تھا۔ اس پر آپ کے آگے سر ہلا ہلا کر کہیں گے کہ (اچھا بتلاؤ) یہ کب ہوگا؟ آپ فرما دیں کہ عجب نہیں تم میں ہی آ پہنچا ہو۔ یہ اس روز ہوگا جب اللہ تم کو پکارے گا اور تم (بالاضطرار) اس کی حمد کرتے ہوئے حکم کی تعمیل کرو گے اور تم یہ خیال کرو گے کہ تم بہت ہی کم رہے تھے۔

یہ لوگ جب چیزوں سے ڈرائے جاتے تھے ان میں:

: ایک تو قیامت تھی
: اس کے علاوہ بعث وحساب
: انہیں اس عذاب سے بھی ڈرایا جاتا تھا جو منکروں اور عصیاں شعاروں کے لیے تیار رکھا گیا تھا۔

اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں تھیں جن سے انہیں ڈرایا جاتا تھا:

: مثلاً انہیں اس بات سے ڈرایا جاتا تھا کہ کہیں ان پر بھی وہ عذاب نہ نازل ہو جو ان سے پہلے دوسری قوموں اور ملتوں پر نازل ہو چکا ہے۔ جن کے پاس

بینات لے کر رسول آئے اور ان رسولوں کو انہوں نے جھٹلایا۔ اور ان سے وہی باتیں اسی زبان میں کہیں جو اب قریش کی زبان پر جاری تھیں۔ مثلاً ان نبیوں سے کہا گیا

: تم پر جن یا آسیب کا سایہ ہے

: تم پر جادو کر دیا گیا ہے۔ اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ وہی جادو ہے جو تمہارے منہ سے بول رہا ہے

: ان نبیوں میں سے بعض قتل کر دیئے گئے

: بعض کو دھمکایا گیا کہ اگر وہ اپنی دعوت و تبلیغ سے باز نہ آئے تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔

اور ان کافروں پر جنہوں نے اپنے انبیاء کے ساتھ یہ حرکتیں روا رکھی تھیں۔ اسی زندگی میں عذاب عاجل نازل کیا گیا۔ جو پیش خیمہ تھا عذاب آجل کا جس سے (حساب کتاب کے بعد) انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوسری دنیا (عالم آخرت) میں دوچار رہنا تھا۔

ان کو وہ قصے بھی سنائے جاتے تھے جو طوفان نوح سے متعلق تھے۔ جس طوفان میں سرکش نافرمان اور طغیان سرشت لوگ غرق کر دیئے گئے تھے۔

انہیں اس طوفان باد کی خبر بھی دی جاتی تھی۔ جب انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی مخالفت کی تھی۔ اور اس طوفان میں ہلاک ہو گئے تھے۔

اور انہیں اس کڑک کی باتیں بھی بتائی جاتی تھیں۔ جس نے قوم ثمود کو غارت کر دیا تھا جنہوں نے صالح علیہ السلام کی نافرمانی کی تھی۔

اور انہیں قوم لوطؑ کا ماجرا بھی سنایا جاتا تھا۔ جب آسمان سے اس پر پتھر برسے تھے اور وہ مٹ گئی تھی۔

اور انہیں اہل مدین کے واقعات بھی بتائے جاتے تھے جب زمین کا طبقہ الٹ

جانے سے وہ تباہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے شعیب علیہ السلام کے احکام سے روگردانی کی تھی۔

اور انہیں تفصیل سے وہ قصہ بھی سنایا جاتا تھا جو فرعون اور قوم فرعون سے تعلق رکھتا تھا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی تھی

اور انہیں تاکید کی جاتی تھی کہ سیرِ دنیا کریں تاکہ بہ چشمِ خود دیکھ لیں کہ مفسد قوموں اور ملتوں کا حشر کیا ہوا؟

اور یہ سب کچھ بتا کر انہیں اس سے ڈرایا جاتا تھا کہ ان کا حشر بھی وہی نہ ہو جو ان سے پہلے کی قوموں اور ملتوں کا زشت کاری، عصیاں شعاری اور فساد انگیزیوں کے باعث ہو چکا ہے۔ جن پر طرح طرح کے عذاب دنیا میں نازل ہو چکے ہیں۔ اور آخرت میں جن کے لیے عذاب مقیم تیار ہے۔

ان کافروں اور مشرکوں پر یہ آیاتِ قرآنی تلاوت کی جاتی تھیں۔ کبھی یہ چپ چاپ سن لیتے اور زیادہ تر ایسا ہوتا کہ تمسخر پر اتر آتے۔ جنگ وجدال کے لیے آمادہ ہو جاتے اور سننے سمجھنے سے صاف صاف انکار کر دیتے۔

آپ انہیں قرآن کی وہ آیتیں سناتے جو خلق آدم سے متعلق تھیں۔ آدم و حوا کے قیامِ جنت، شجرِ محرمہ کے قریب جانے کی ممانعت، پھر شیطان کے بہکاوے میں دونوں کا آجانا، اور جنت سے نکالا جانا۔ یہ واقعات بھی قرآن سے سنائے جاتے تھے۔

اسی طرح انہیں وہ آسمانی قصے سنائے جاتے تھے۔ جن میں ابلیس کی نافرمانی اور اس پر اصرار، اور آدم کو سجدۂ تعظیمی سے ملائکہ کے طرزِ عمل کے برعکس انکار، پھر اس پر غضب خداوندی کا نزول اور اس کا یہ ادعا کہ وہ اولاد آدم میں برپا کرے گا اور اسے راہِ معصیت پر ڈالے گا۔ یہ سارے واقعات بتائے جاتے تھے

ان واقعات کے علاوہ بھی قرآن سے وعظ و پند اور تذکیر و نصیحت کے لیے انہیں باتیں بتائی جاتی تھیں۔ کہ شاید یہ بھٹکے ہوئے لوگ راہِ راست پر آجائیں۔

اس جماعت کثیر میں بہت کم لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس تذکیر پر کان دھرا۔ جن کے دل میں یہ آیتیں سن کر گداز اور رقت کی کیفیت پیدا ہوئی۔ جنہیں قرآن کی محبت اور برہان نے لاجواب اور بے بس کر دیا۔ اور گویا ان کی عقل کو سحر زدہ کر دیا۔ اور جنہوں نے حالات کے مطابق علی الاعلان یا چوری چھپے اسلام قبول کر لیا۔

جیسے حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ جب انہیں خبر ملی کہ ان کی بہن اور بہنوئی نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دعوتِ اسلام پر جنگ آزمائی کے لیے جا رہے تھے۔ بہن اور بہنوئی کے قبولِ اسلام کی خبر راستے میں ملی۔ یہ سنتے ہی تلملا اٹھے اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے سے پہلے بہن اور بہنوئی کا فیصلہ کر آئیں۔ سو سراپا شعلہ و آتش بنے ہوئے پہنچے۔ لیکن ہوا یہ کہ وہاں جا کر سورۂ طٰہٰ کی چند ابتدائی آیات سنیں۔ تو پتھر کا دل موم کا بن گیا۔ جس کی قساوت حد سے بڑھی ہوئی تھی وہ گداز و رقت کا پیکر بن گیا۔ اب وہ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن انہیں قتل کرنے کے لیے نہیں۔ بلکہ اللہ کی توحید اور محمدؐ کی رسالت پر اپنے ایمان کا اعلان کرنے۔

غرض اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور قریش کے مابین معاملات کا سلسلہ جاری تھا

جہاد ——— جس کا سلسلہ منقطع ہونے میں نہیں آتا تھا۔

جدال ——— جو مسلسل اور متواتر جاری تھا۔

ساتھ ہی ساتھ سلسلۂ وحی بھی جاری چلا آتا تھا۔ قرآن کی تلاوت بھی ہو رہی تھی۔ جو کچھ آپؐ پر اترتا تھا۔ وہ لوگوں کے کان تک پہنچایا بھی جاتا تھا۔

صحابہ کے اجتماعات بھی برابر جاری تھے۔ قبل از ہجرت حبشہ بھی اور اس کے بعد بھی جو صحابہ مکے میں رہ گئے تھے انہیں دین سکھایا جاتا تھا۔ قرآن سنایا جاتا تھا اور جس طرح امور دین میں ان کی ھدایت اور رہبری کی جاتی تھی۔ اسی طرح امور دنیا میں بھی ان کی رہنمائی اور ہدایت و نصیحت کا کام جاری تھا۔

اور ایک روز ایک خاص بات رونما ہوئی

یہ بہت ہی عجیب بات تھی۔

اس بات پر قریش نے تو حسب معمول تمسخر اڑایا ہی۔ بلکہ بعض ایسے قلوب بھی شک سے بھر گئے جو صدق دل سے ایمان لا چکے تھے۔

اور وہ عجیب بات یہ تھی کہ ایک صبح کو آپ نے خبر دی کہ گذشتہ رات آپؐ کو معراج حاصل ہوئی تھی۔ پھر آپؐ نے سورۃ اسریٰ کی یہ آیتیں تلاوت فرمائیں :۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ	یعنی :
لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ	وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندے (محمدؐ) کو شب
اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ	کے وقت مسجد حرام (مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ۔
بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ	(بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی
اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ	ہیں لے گیا تاکہ اسے ہم اپنے کچھ عجائبات قدرت
الۡبَصِیۡرُ ۝	دکھا دیں۔ بے شک وہ سمیع و بصیر ہے۔

(۵)

کھلی ہوئی بات ہے قریش اس بات کی تصدیق نہیں کر سکتے تھے کہ راتوں رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کعبہ سے بیت المقدس تک اس طرح ہو آئے کہ جب آپ تشریف لائے تو ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ رات باقی تھی۔

یہ قریش شام اور بیت المقدس کا سفر کیا کرتے تھے۔ یہ جانتے تھے۔ یہ مسافت کتنی دور و دراز ہے اس سے بھی واقف تھے۔ راستہ کیسا کٹھن اور دشوار گزار ہے پھر کس طرح مان لیتے کہ راتوں رات آپؐ مکے سے اٹھے اور بیت المقدس کی سیر کر کے واپس آ گئے؟

لیکن ——————

لیکن آپؐ نے صرف اپنے سفر ہی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ شام، قدس اور مسجد اقصیٰ کا منظر اور کیفیت بھی بیان فرمائی تھی۔ یہ لوگ بھی شام جا چکے تھے۔ قدس کو انہوں نے دیکھا تھا۔ مسجد اقصیٰ کی زیارت کی تھی جو کچھ انہوں نے محمد (ص) سے ان نبیوں کے بارے میں سُنا وہ غلط نہیں تھا۔ انکار بھی کرنا چاہتے تو کیسے کر دیتے؟

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے قلوب میں اضطراب پیدا ہوا۔ خلش پیدا ہوئی۔

یہ سوچنے لگے کہ آپؐ کو اور آپؐ کے دعویٰ کو کیسے جھٹلائیں؟ آخر سوچ بچار کے بعد انہوں نے آپؐ کو عاجز اور درماندہ کرنے کی صورت یہ نکالی کہ یہود کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور ان سے کہا کہ وہ کچھ ایسے سوالات تیار کر کے دیں جن کا جواب محمد (ص) سے نہ بن آئے یا کم از کم جن سے محمد (ص) کے صدق و کذب کا امتحان ہو جائے۔

راویانِ سیر کا بیان ہے کہ یہود نے قریش سے کہا کہ تم محمد (ص) سے پُوچھو:

"وہ کون لوگ تھے۔ جو اصحابِ کہف کہلاتے ہیں۔ اور ان کا معاملہ کیا تھا۔"

آپؐ سے یہ سوال کیا گیا۔ جواب آپؐ وحی سے دیتے تھے۔ لیکن نزولِ وحی میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ قریش اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ انہوں نے محمد (ص) کو لاجواب کر دیا۔

لیکن بہت جلد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے سامنے قصّہ اصحاب کہف تلاوت کیا۔ اور یہ قصہ بالکل وہی تھا۔ جس سے صرف یہود آشنا تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار مکہ بہت زیادہ تنگ دل ہو گئے۔ اور اس کا ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ آپؐ کے لیے تنگ ہو گیا۔ اور طرح طرح کی ناشائستہ اور ننگ انسانیت حرکتوں

پر اتر آئے ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ثبات و استقلال کی نعمت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ کیونکہ اسی نے آپؐ کو حق جبلی کے ساتھ مرتبۂ نبوت پر مامور کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ سورۂ کہف میں ارشاد فرماتا ہے :۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى
اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا
بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ اِنَّا
جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً
لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ
عَمَلًا ۝ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ صَعِيْدًا
جُرُزًا ۝

یعنی:

"(اور آپ جو ان پر اتنا غم کھاتے ہیں) تو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون (قرآنی) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دے دیں گے ہم نے زمین کی چیزوں کو اس کے لیے باعثِ رونق بنایا تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے ؟ اور ہم (ایک دن) زمین کی تمام چیزوں کو ایک صاف میدان (یعنی فنا) کر دیں گے۔"

بہر حال ان مایوس کن اور روح فرسا، اور دل شکن حالات اور ماحول کے باوجود آپؐ ان لوگوں کے مابین اس وقت تک مقیم رہے۔ جب تک اچھی طرح دین کے اصول ان کے سامنے پیش نہیں کر لیے اور ان پر واضح کر دیا :

: یہ کہ خدا ایک ہے۔ جس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

: یہ کہ شرک سب سے بڑا جرم اور ظلم ہے جس کا نتیجہ صرف عذاب مقیم ہی کی صورت میں بر آمد ہو سکتا ہے۔

: یہ کہ اللہ نے آپؐ کو اسی طرح رسول بنا کر بھیجا ہے۔ جس طرح اس سے پہلے دوسری قوموں اور ملتوں پر وہ رسول بھیجا کرتا رہا ہے۔

: یہ کہ ایمان اس وقت تک مستقیم نہیں ہوتا جب تک وہ دل کی گہرائیوں

میں نہ اتر جائے اور اللہ کی وحدت اور رسول ؐ کی سچائی پر
دل گواہی نہ دینے لگے اور اس کا ثبوت عمل سے نہ ہونے لگے۔

: یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عدل و احسان کا حکم دیا ہے' اس بات کا حکم دیا ہے کہ قرابت مندوں اور رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے' یتیموں کے ساتھ مہر و شفقت کا برتاؤ کیا جائے' مساکین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نیکی اور بھلائی کی جائے۔ والدین کی اطاعت کی جائے۔ البتہ کفر اور گناہ میں ان کی پیروی ہرگز نہ کی جائے

: یہ کہ اللہ تعالیٰ نے معصیت اور گناہ سے منع فرمایا ہے۔ لہذا اس سے کامل اجتناب کیا جائے۔

: بغیر کسی جائز سبب کے ہرگز کسی کو قتل نہ کیا جائے۔

: عار کے باعث لڑکیوں کو زندہ درگور نہ کیا جائے۔

: فقر و غربت کے باعث نومولود لڑکوں کی جان نہ لی جائے

: زنا سے بچا جائے

: کبر و غرور نہ اختیار کیا جائے۔

: جھوٹ ترک کر دیا جائے۔

: خرافات اور لغویات میں نہ شرکت کی جائے نہ ان کا ارتکاب کیا جائے۔

یہ ساری باتیں زور و قوت کے ساتھ آپ نے بیان کر دیں اور صاف صاف بتا دیا کہ اگر ایمان لاؤ گے، عمل صالح کرو گے اور خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرو گے تو تمہارے لیے اجر حسن کی خوشخبری ہے۔ اور اس خوشخبری کے ساتھ یہ ڈرا وا بھی دیا کہ اگر کفر اختیار کیا، معصیت کو اپنا شعار بنایا۔ تو پھر دنیا اور آخرت ہر جگہ عذاب شدید کا سامنا کرنا پڑیگا۔

۱۴

تاجدارِ یثرب

قریش سے آویزش، یہودیوں کا دھوکا، بدر، احد اور خندق کی جنگ

صلح حدیبیہ، معاہدے کے شرائط، منافقوں کی زشت کاری،

محمدؐ نے یثرب میں قدم رکھا!

یثرب کی زندگی ایک نئی زندگی کا آغاز ثابت ہوئی۔

دعوت و تبلیغ اسلام کا نیا راستہ کھل گیا، نئے دروازے کھل گئے۔

قبل از ہجرت بھی یثرب میں مسلمان موجود تھے۔ جو خدا پر اور اس کے رسولؐ پر ایمان لا چکے تھے۔ اور اسلام ان میں پھیل چکا تھا۔

یثرب میں مشرکین بھی تھے۔ ان کے قلوب اسلام سے ناآشنا تھے اور انہی کی کثرت تھی۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جنہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے قبولِ اسلام کی توفیق عطا فرمائی تھی جو صدق ایمان کی نعمت سے مالا مال تھے۔

ان میں وہ لوگ بھی تھے جو عواقب عناد سے اور ان کے نتائج سے واقف تھے۔ انہوں

غرض اللہ تعالیٰ کے احکام و آیات آپؐ نے بہت اچھی طرح بہت واضح طور پر واشگاف الفاظ میں بیان کر دیئے۔ اپنے اس ادائے فرض میں نہ کوتاہی کی، نہ مداہنت سے کام لیا، نہ کسی طرح کے لیت ولعل کو دخل دیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہجرت کا حکم دیا۔ یہ حکم اس وقت ملا جب ہر طرح کی تکلیفیں راہ حق و صداقت میں آپؐ جھیل چکے تھے۔ اللہ کا اور قوم کا حق پورے طور سے ادا کر چکے تھے۔ لیکن قوم کی طرف سے سرکشی اور طغیان کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور جو ایمان لائے وہ مٹھی بھر سے زیادہ نہ تھے۔

نے بظاہر اسلام قبول کر لیا، اپنے کفر کو چھپایا۔ اور منافقت کی زندگی بسر کرنے لگے۔

یہاں یہود بھی تھے۔ جو متوارث طور پر اپنے دین و مذہب کے علمبردار چلے آ رہے تھے۔ اور اب وہ اپنے اندر اتنی لچک پیدا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ یثرب کی اس نئی زندگی سے جس حد تک ممکن ہو توافق پیدا کر لیں اور یہاں جو مختلف گروہ آباد تھے ان سے ساز باز رکھ سکیں۔

یثرب میں آپؐ کی زندگی کسی معنیٰ میں بھی حیاتِ مکہ سے سہل اور آسان نہیں تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یثرب کی زندگی مکے کے مقابلے میں بہت زیادہ پر مشقت اور صبر آزما، تعب سے بھری ہوئی تھی تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا۔ لیکن آپؐ نے ان سب باتوں کا راضی بہ رضا ہو کر، صبر و شکر کے ساتھ استقبال کیا۔ آپؐ کی زبان اپنے رب کی حمد میں زمزمہ سنج تھی کہ یہاں بہر حال مکّے کے مقابلے میں امن حاصل تھا۔ پشت پناہوں کی ایک جماعت موجود تھی آسانی کے ساتھ تبلیغ و ارشاد، اور ہدایت و نصیحت، پیامِ رسالت اور حقِ خداوندی کو عام و خاص تک پہنچایا جا سکتا تھا۔

یثرب میں آپؐ نے مہاجرینِ مکہ اور انصارِ یثرب کے مابین مواخات (برادری) کا رشتہ قائم کیا۔ آپؐ نے ان دونوں کے مابین ایسا بعید الاثر اور قوی صلہ پیدا کیا۔ جو وسیع ترین معنوں میں بھائی چارے کے ہر مفہوم پر حاوی تھا۔

اس کے بعد آپؐ نے اپنے اور اپنے احلاف کے مابین ایک معاہدہ کیا۔ اس معاہدے کی بنا د و اساس یہ تھی کہ دشمن کے مقابلے میں متحدہ ہو جائیں گے اور ہر حالت میں ایک دوسرے کے معین و دمساز رہیں گے۔

اس کے بعد یثرب میں آپؐ اور آپؐ کے امتی عام اس سے کہ مہاجر ہوں یا انصار، بغیر کسی جھجک کے کھلے بندوں خدائے یکتا کی عبادت کرنے لگے۔ اب نہ انہیں اپنا دین

چھپانے کی ضرورت نہ تھی نہ کسی فتنے کا اندیشہ تھا۔

یثرب میں اسلام کی سب سے پہلی مسجد تعمیر ہوئی۔ اس مسجد میں خدائے بزرگ و برتر کی عبادت ہوتی تھی۔ یہاں مہاجر و انصار کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ اور ان مجالس میں آپؐ حاضرین کو دین قیم کی تعلیم دیتے تھے۔ انہیں آداب سکھاتے تھے۔ اور جو کچھ ان کے لیے بہتر اور موزوں سمجھتے تھے اس کا اذن و امر مرحمت فرماتے تھے۔ اور جو کچھ ان کے لیئے ناموزوں اور غیر مناسب خیال فرماتے تھے۔ اس سے منع کر دیتے تھے۔ اور اجتناب کی تاکید فرماتے تھے ان کے سامنے محاسنِ اخلاق کی وضاحت فرماتے تھے۔ خیر اعمال کی انہیں دعوت دیتے تھے۔ ان تمام باتوں کی تلقین فرماتے تھے جو مرد مومنؐ بزرگ کے شایانِ شان ہو۔ اس تلقین پر آپؐ خود بھی عمل پیرا ہوتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی عمل کی جانب متوجہ کرتے تھے اور جو باتیں ایک مرد مؤمنؐ بزرگ کے شایان شان نہ ہوں، ان سے دور اور مجتنب رہنے کی تاکید فرماتے تھے۔ اور یہ سارا کام پورے امن و آسائش اور عافیت کے ساتھ انجام پا رہا تھا۔

منافقین کے طور طریقوں سے اہلِ یثرب واقف نہ تھے۔ وہ اسے کافی سمجھتے تھے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں لہٰذا ان کی ایسی باتوں سے درگذر کر دیتے تھے۔ اور کسی طرح کا تعرض نہیں کرتے تھے۔ جو انہیں ناپسند اور نامرغوب ہوتی تھیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان کے مقامِ نفاق سے واقف کر دیا تھا۔

آپؐ اکثر اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے تھے:

"کسی کے دل میں جو کچھ ہے اس کی جستجو پر میں مامور نہیں کیا گیا ہوں۔"

لیکن با ایں ہمہ صورتِ احوال کیا تھی؟

امن و عافیت کی جنس اب بھی ناپید تھی۔ نیکی اور خوبی کے مقابلے میں قسوت اور تنگ دلی اب بھی کار فرما تھی۔

اب بھی دو شدید ترین دشمن ایسے تھے جن سے بار بار آپؐ کو اور آپؐ کے اصحاب کو سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور یہ دشمن حد درجہ خطرناک اور مہیب تھے۔

کون تھے یہ دونوں دشمن ؟

۱ــــ یہود، جو یثرب کے مستقل باشندے تھے۔

۲ــــ قریش، جو آپ کے یثرب چلے آنے سے تلملا گئے تھے۔

ان یہودیوں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا۔ آپؐ پر ایمان نہیں لائے تھے۔ آپؐ انہیں قبول اسلام پر مجبور بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ کی صرف یہ خواہش تھی کہ ان سے صلح قائم رہے۔ معاہدے پر عمل جاری رہے۔ حسن جوار کے تعلقات قائم رہیں، اور ضرورت کے وقت باہمی نصرت اور تعاون کا سلسلہ قائم رہے۔

لیکن یہود نے نہ معاہدہ خلوص کے ساتھ کیا تھا، نہ صلح پر سچے دل سے قائم تھے۔ انہوں نے ظاہر میں صلح کر رکھی تھی اور باطن میں غدر اور فریب کی گھات میں لگے رہتے تھے۔ لہذا انہوں نے صلح و معاہدے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ کھل کر اسلام کی تکذیب پر اتر آتے اور اس باب میں مجادلہ کرنے لگے۔ اور اس میں بھی حد سے تجاوز کر گئے۔

اور قــــریش ؟

آپؐ پوری حفاظت کے ساتھ قریش کے حدود و اقتدار و اختیار سے باہر نکل آئے۔ قریش کی تمنا اور آرزو یہ تھی کہ آپ کو قید کر لیں یا آپؐ کو قتل کر دیں یا پھر علی رؤوس الاشہاد (خاکم بدہن) آپ کو رسوا کر کے مکّے سے جلاوطن کر دیں۔ لیکن ان کی ساری تدبیریں پٹ پڑ گئیں۔ کیا کیا نہیں چاہتے تھے ؟ مگر کچھ بھی نہ کر سکے۔ ان کا فریب و غدر، جس پر انہیں ناز تھا رائگاں گیا۔ جیسا کہ سورۂ انفال میں اللہ تعالٰے نے ان کا ذکر فرمایا ہے :-

وَ اِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا	یعنی:
لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ	اس واقعہ کا بھی ذکر کیجیے کافر آپ کے بارے
یُخْرِجُوْکَ ؕ وَ یَمْکُرُوْنَ وَ	میں (بڑی بڑی) تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آیا
یَمْکُرُ اللّٰہُ ؕ وَ اللّٰہُ خَیْرُ	آپ کو قید کرلیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو
الْمٰکِرِیْنَ ۝	جلاوطن کر دیں اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے
	اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا۔ اور سب سے زیادہ
	محکم تدبیر کرنے والا اللہ ہے۔

جب آپؐ قریش کے پاس تھے۔ انہوں نے آپؐ کے خلاف تمام جتن کر ڈالے لیکن وہ آپ پر قدرت نہیں حاصل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان سے محفوظ رکھا۔ اور ان کے بدلے میں ایک دوسری قوم عطا فرمادی جس نے آپؐ کو پناہ دی، آپؐ کی پشت پناہی کی، ہر طرح سے آپؐ کی امداد و اعانت کی۔ اور قریش یہ سوچ کر جلے جا رہے تھے۔ کہ آپؐ یثرب میں امن و عافیت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ اب محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے ظلم کیا تھا، آپؐ کے اصحاب پر ظلم و جفا کے پہاڑ توڑے تھے اور یہ ممکن نہ تھا کہ موقع پاتے ہی یہ انتقام پر نہ اتر آئیں۔ اور جو کچھ یہ بھگت چکے تھے اس کا گن گن کر بدلہ نہ لیں۔ اب یثرب میں انہیں جو امن حاصل تھا اور جو آسائش میسر تھی اس کا اقتضا یہی ہو سکتا ہے کہ موقع پاتے ہی یہ جنگ پر آمادہ ہو جائیں۔ اور یہ کوئی معمولی خطرہ نہیں تھا جسے وہ نظر انداز کر دیتے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان وسائل کو قطع کر دیں جو ان کے خلاف بروئے کار لائے جا سکتے تھے۔ وہ ہر اس تدبیر پر عمل کر رہے تھے جو نتیجہ خیز اور نفع بخش ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ یثرب سے دور تھے۔ لیکن حیلہ جوئیوں سے باز نہیں آتے تھے۔ یہ یہودیوں کو آپؐ کے خلاف اکساتے تھے۔ کہ آپ کو اور آپؐ کے اصحاب کو مکے سے ہجرت کر جانے

کے بعد بھی امن اور چین کی زندگی نہ بسر کرنے دیں۔ اور جو لوگ ابھی تک مکے میں مقیم تھے اور ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ ان پر پہلے سے کہیں زیادہ قساوت و درندگی کے ساتھ ظلم کے پہاڑ توڑنے لگے۔

ان حالات میں یہ بات حیرت انگیز نہیں ہو سکتی کہ ابھی ہجرت کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ قریش کی طرف سے شر کا اظہار ہونے لگا۔ اور یہ بات واضح تر ہونے لگی کہ جنگ بہر حال ہو کر رہے گی۔ کیونکہ قریش آپؐ کے اعدِ عدو تھے۔ اور انہیں آپؐ کے یثرب میں مقیم ہونے سے سب سے زیادہ فکر اور اندیشہ اس بات کا تھا کہ اب یثرب کے راستے شام سے ان کی تجارت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اور ابھی ہجرت کو دوسرا سال نہیں گزرا تھا کہ جنگ کے شعلے بھڑکے، جو غزوۂ بدر کے نام سے تاریخ میں معروف ہیں۔

بدر کے میدان میں قریش لشکرِ گراں لے کر آئے تھے۔ محمدؐ اور ان کے ساتھی قلیل التعداد۔

لیکن یہ دونوں گروہ افکار و جذبات کے اعتبار سے کتنے مختلف تھے ایک دوسرے سے؟

ان میں سے ایک گروہ وہ تھا۔ جو جذبۂ ایمان سے سرشار تھا اور اپنے دین کی تائید و حمایت کے لیے کفن سر سے باندھ کر مرنے، مٹنے اور قتل ہونے کے لیے نکلا تھا۔ اسے یقین کامل تھا اگر کامیاب ہوا تو نعیم کامرانی سے بہرہ ور ہوگا۔ حیات دنیا میں سے اسے بہت کچھ حاصل ہو جائے گا۔ اور جہاد کی مشقت کا پورا پورا صلہ مل جائے گا۔ اور اگر قتل ہو گیا تو مرتبۂ شہادت پر فائز ہوگا۔ اور اس نعیم سے دوچار ہوگا جس کا نہ کوئی جواب ہے نہ مثال۔ وہ نعیم جس میں ہمیشگی اور ابدیت شامل ہوگی۔ جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ ہر طرح کے لوث اور ناپاکی سے جسکی تطہیر ہو چکی ہوگی۔

اور یہ دوسرا گروہ؟

یہ صرف اپنے مال و دولت اور کبر و غرور کے لیے برسرِ پیکار تھا۔

فریقین کی جنگ جاری تھی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت نازل ہوئی۔ اس نے اپنے نبیؐ اور مومنین کی مدد فرمائی۔ وہ فتحیاب ہوئے اور قریش کو ہزیمت منکرہ حاصل ہوئی۔ ان کے اشراف وصنادید قتل ہوئے اور سادات واکابر گرفتار ہوئے۔ بہت سا مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ ہارے ہوئے لوگ مکے پہنچے۔ بے شک ان کا کاروانِ تجارت ابوسفیان بچا لایا تھا۔ لیکن یہ رسوائی، ذلّت اور بدنامی کو اپنے جلو میں لے کر کے واپس آئے تھے۔ بھلا قریش کی اس سے بڑھ کر ذلت اور رسوائی کیا ہوسکتی ہے کہ جب جنگ کے میدان میں اترے تھے تو صنادید، اشراف، سادات، آبا، ابناء اور دوستوں کا جھُرمٹ ساتھ تھا۔ لیکن جب واپس آئے تو ان کی سر بریدہ لاشیں چھوڑ کر۔

اس واقعے کا بڑے اثر انگیز الفاظ میں اللہ تعالےٰ نے سورۃ انفال میں ذکر کیا ہے جنگ بدر کا ایک نتیجہ اور بھی رونما ہوا۔

عربوں کو آپؐ کی قوت وشوکت کا احساس ہوگیا۔ ان کے قلوب پر آپؐ کا رعب طاری ہوگیا۔

لیکن قریش اس شکست پر قانع نہیں ہوسکتے تھے۔ نہ اپنے سرداروں اور دوستوں کی دائمی جدائی پر صبر کرسکتے تھے۔ وہ انتقام کی آگ میں سلگ رہے تھے۔ انہوں نے اس ذلت آمیز ناکامی کا بدلہ لینے کا فیصلہ کرلیا اور اس مقصد کے لیے مال و دولت کے خزانے جمع کرنے لگے۔ کیونکہ اس غم میں کون تھا جو سیہ پوش نہ تھا اور کون تھا جو انتقام لینے پر تلا ہوا نہیں تھا۔

چنانچہ وہ پھر ایک لشکرِ گراں لے کر مدینے کی طرف بڑھے۔ وہ بدلہ لینے کے لیے آئے تھے۔ وہ ان لوگوں پر فتح حاصل کرنا چاہتے تھے جنہوں نے بدر کے میدان میں

انہیں شکست فاش دی تھی۔

جنگ شروع ہوئی۔

اور قریب تھا کہ اس مرتبہ بھی قریش پہلے کی طرح خائب و خاسر، ناکام و نامراد اور شکست خوردہ حالت میں رسوائی، ذلت اور نکبت کے عالم میں سر پہ پاؤں رکھ کر مکے کی طرف بھاگیں کہ پانسہ پلٹ گیا۔ بعض مسلمانوں نے مالِ غنیمت کی طمع میں عین اس وقت جب وہ فتح و کامرانی سے ہمکنار ہو رہے تھے اور کفار راہِ فرار اختیار کر رہے تھے، سارا کھیل بگاڑ دیا۔ جس جگہ انہیں نبی ؐ نے کھڑا کیا تھا اور جہاں سے جنبش نہ کرنے کی تاکید فرمائی تھی۔ مالِ غنیمت کی کشش نے انہیں وہاں سے ہٹا دیا۔ قریش فوراً پلٹ پڑے اور جیتی ہوئی بازی ہرتی نظر آنے لگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک طرح کی آزمائش تھی۔ ایک سبق تھا جو انہیں دیا گیا تھا۔ جس میں اس بات کا اشارہ تھا کہ اس آزمائش اور سبق سے آئندہ مواقع پر انہیں کس طرح منتفع ہونا چاہیئے۔ اور اس طرح کے مشکلات و مصائب کے مراحل پر انہیں کیا کرنا چاہیئے۔

لیکن مسلمانوں کی اس جلد بازی اور غلط کاری کا بہرحال یہ نتیجہ نکلا کہ جنگ احد میں انہیں سخت ترین مصیبت کے دور سے گذرنا پڑا۔ جنہیں قتل ہونا تھا وہ قتل ہوئے۔ جن کی قسمت میں زخمی ہونا تھا وہ مجروح ہوئے۔ بہتوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ بہت کم ایسے تھے جو ثابت قدم رہے۔ بس نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور چند آپؐ کے جاں نثار صحابہ، اس جنگ میں خود نبی اکرمؐ بھی زخمی ہوئے اور آپ کے عم محترم حضرت حمزہؓ مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔ علاوہ ازیں اور بھی بہت سے صحابہ نے جام شہادت نوش کیا اور ابوسفیان کا جو قائد قریش تھا حوصلہ اتنا بڑھ گیا کہ بے ساختہ پکار اٹھا:

اعلی هبل،

اور نعرہ لگایا۔ ہم نے بدر کا بدلہ لے لیا۔
آپؐ کے اشارے پر ابو سفیان کو عمرؓ نے جواب دیا
اللہ اعلیٰ و اجل

گو اس جنگ میں مسلمان شکست سے دوچار ہوئے تھے جو ایک طرح کی آزمائش تھی اللہ کی طرف سے مسلمانوں کی۔ اور گو اس جنگ میں آپؐ کو اور دوسرے صحابہ کو جراحتیں پہنچی تھیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شکست قبول کرنے سے انکار کر دیا جس طرح بدر میں قریش نے قبول کر لی تھی

آپؐ نے اپنے اصحاب میں سے ان لوگوں کو جو کوچ کی استطاعت رکھتے تھے۔ حکم دیا کہ قریش کا تعاقب کریں۔ اور وہ ان کے سر پر پہنچ گئے۔ اپنی قلت تعداد اور دشمن کی کثرت سے وہ ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئے بالآخر ابتلا، کے بادل چھنٹ گئے۔ اور وہ کامیاب و کامران مدینے واپس آئے۔

اللہ تعالیٰ نے واقعۂ احد کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کی جلد بازی۔ اصول جنگ سے روگردانی، مالِ غنیمت کی حرص اور اپنے نبی ؐ کی نافرمانی کا بیان فرمایا ہے۔ اور ان سب کو معاف فرمایا ہے اور نبی ؐ کو ہدایت کی کہ وہ بھی معاف کر دیں۔ اور ان کے لیے طلبِ مغفرت کریں۔ اور مشاورات سے کام لیا کریں۔ اور بتایا کہ جن لوگوں کو اس جنگ میں انہوں نے کھو دیا ہے وہ اللہ کے ہاں زندہ ہیں۔ اور وہاں انہیں ہر طرح کی نعمتیں حاصل ہیں۔ اور یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں کو ایک مرتبہ پھر آزمائش سے دوچار ہونا پڑے گا جس میں انہیں جان مال کی قربانی دینا پڑے گی۔ اور ان اذیتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جو مشرکین اور یہود سے انہیں پہنچنے والی ہیں۔

سورۃ آلِ عمران میں یہ ساری باتیں حسن و خوبی کے ساتھ بیان فرمائی گئی ہیں۔

قریش اس جنگ میں جیت کر بھی گویا ہارے تھے۔ اور مسلمان ہار کر بھی گویا جیت میں رہے تھے۔ قریش کے سر میں یہ سودا سما گیا تھا کہ فتح کامل حاصل کریں۔ چنانچہ وہ ایک دوسری جنگ کی تیاریاں کرنے لگے

یہ جنگی تیاریاں زور شور سے شروع ہوگئیں۔ قریش نے دوسرے قبائل کو حلیف بنانا شروع کر دیا۔ یہود سے پیمانِ دوستی استوار کر لیا۔ انہیں یقین تھا۔ یہود کو ساتھ ملا کر وہ نبیؐ اور اصحاب نبیؐ کی شوکت کا خاتمہ کر دیں گے۔ ان کے لیے ضروری اور لابدی تھا کہ یا تو مدینے کو ویران کر دیں۔ ورنہ مکے کی ویرانی کے لیے تیار رہیں۔

چنانچہ قریش فوجی مہمات لے کر نکلنے لگے۔ ان کے ساتھ قبائل نجد بھی تھے۔ اور یہود کی دوستی بھی ان کے لیے امیدوں اور آرزؤں کا مرکز تھی۔ وہ مدینے پر حملہ آور ہوتے جس کا ذکر اللہ تعالٰے نے سورۃ احزاب میں فرمایا ہے۔ اور یہ جنگ بھی غزوۂ احزاب کے نام سے معروف و مشہور ہے

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوگیا تھا اور مسلمانوں نے محسوس کر لیا تھا کہ قریش نے ان کے ساتھیوں، حلیفوں اور اہل نجد نے مدینے پر چڑھائی اور اس پر تاخت و تاراج کا فیصلہ اور تیاری کر لی ہے۔

چنانچہ اس بارے میں مشورہ کیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا گیا کہ خندق کھودیں تاکہ مشرکین مدینہ تک نہ پہنچ سکیں۔

آپؐ نے صحابہ کو خندق کھودنے کا حکم دیا اور خود بھی عملی طور پر اس کام میں شرکت فرمائی۔ جس طرح اس سے پہلے تعمیر مسجد کے سلسلے میں دست مبارک سے اس طرح اینٹیں چنی تھیں جس طرح دوسرے صحابہ یہ کام کر رہے تھے۔ آج پھر گویا آپ بھی انہی کی طرح اور انہی میں سے ایک تھے۔ آپ بھی اتنا ہی بوجھ اور اتنی ہی تکلیف و مشقت

اٹھا رہے۔ اور برداشت کر رہے تھے جنہیں دوسرے لوگ آپؐ کا ثبات و استقلال دیکھ کر صحابہ کی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی اور وہ بھی صبر و برداشت کے خوگر ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ خندق کھودنے کا مرحلہ انجام تک پہنچ گیا۔

قریش اپنے حامیوں، دوستوں اور حلیفوں کو لے کر بڑھے۔ ان میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو خطۂ زیریں سے آ رہے تھے۔ یہ قریش اور ان کے ہم عناں تھے۔ دوسرے وہ جو بالائی خطے سے آ رہے تھے۔ یہ اہل نجد تھے جو قریش کے حلیف بن گئے تھے اور اہل غطفان!

مسلمانوں نے دشمنوں کے اس لشکر گراں کو دیکھا جو بہت زیادہ تھا۔ وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ یہود معاہدہ توڑ چکے ہیں اور دہوکا دے کر مسلمانوں سے کٹ چکے ہیں اور جو معاہدہ کر چکے تھے۔ اسے توڑ کر اب مسلمانوں کے بجائے قریش کے حلیف، ہم عنان اور ہم سفر بن چکے ہیں۔ اب نہ انہیں قول و قرار کا پاس ہے نہ جوار کا۔

ساتھ ہی ساتھ مسلمان اس حقیقت سے بھی ناواقف نہیں تھے کہ ان کے مابین ایک اور گروہ بھی دشمنوں کا موجود ہے۔ اور یہ منافقین ہیں۔ یہ اگرچہ علی الاعلان قریش کے ساتھ نہیں تھے۔ لیکن ان کی دلی آرزو یہ تھی کہ مسلمان شکست یاب ہوں۔ اور ذلت و رسوائی سے دوچار ہوں۔ انہوں نے بہرحال مسلمانوں کی مدد کرنے اور ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب میں اس موقع کا بڑے سحر طراز انداز میں ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ صورت حالات اس لیے پیش آئی تھی کہ اس کے بعد مسلمان حسن انعام اور عظیم نعمت سے مالامال ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا	یعنی:
نعمت اللهِ عَلَيْكُمْ اِذ	اے ایمان والو اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد
جاءتكم جُنُود فَاَرْسَلْنَا	کرو جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے پھر

عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ
تَرَوْهَا ط وَكَانَ اللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ اِذْ
جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ
مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ
زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ
الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ
بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ
ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا
زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ وَاِذْ
يَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا
وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ
اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَاِذْ قَالَتْ
طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ
يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ
فَارْجِعُوْا ج وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ
مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ
بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ط وَمَا هِيَ
بِعَوْرَةٍ ج اِنْ يُّرِيْدُوْنَ
اِلَّا فِرَارًا ۝

ہم نے ان پر ایک آندھی بھیجی اور ایسی
فوج بھیجی جو تم کو دکھائی نہ دیتی تھی۔ اور
اللہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ جب کہ
وہ لوگ تم پر چڑھ آئے تھے اوپر کیطرف
سے بھی اور نیچے کی طرف سے بھی۔ اور
جب کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور
تم لوگ اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان
کر رہے تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کا
امتحان کیا گیا اور سخت زغے میں ڈالے
گئے۔ اور جب کہ منافقین اور وہ لوگ
جن کے دلوں میں مرض ہے یوں کہہ رہے
تھے کہ ہم سے تو اللہ اور اس کے رسول نے
محض دھوکے ہی کا وعدہ کر رکھا ہے۔
اور جب کہ ان میں سے بعض لوگوں نے
کہا کہ اے یثرب کے لوگو تمہارے لیے
ٹھہرنے کا موقع نہیں سو لوٹ چلو۔ اور
بعض لوگ ان میں نبی سے اجازت مانگتے
تھے۔ کہتے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔
حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں ہیں۔ یہ محض
بھاگنا ہی چاہتے ہیں۔!

اگرچہ ابھی مسلمانوں میں اور دشمنوں کے اس لشکر کثیر میں باقاعدہ جنگ کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ صرف مسلمانوں اور مشرکوں کے بعض افراد کے درمیان وقتاً فوقتاً مبارزت ہوتی رہتی تھی۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمان سخت ترین خطرے، مصیبت اور بلائے عظیم میں گرفتار تھے۔ یہ مسلمانوں کے ایمان کے امتحان کا وقت تھا۔ ان کے ثبات و استقلال کے امتحان کا وقت تھا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدہ کیا تھا اس پر اعتماد کے امتحان کا وقت تھا اور مصیبت اور خطرے پر صبر و شکر کے امتحان کا وقت تھا۔

قریش اور ان کے حلیف اس کی تاب و تواں رکھتے تھے کہ اس جنگ کو جتنا چاہیں طول دیں۔ وہ جتنی مدت تک چاہتے خیمہ زن رہ سکتے تھے۔ انہوں نے ایک طرح سے مسلمانوں کو حصار میں لے لیا تھا

اور یہودیوں کا قبیلہ بنو قریظہ بھی موقع سے خوب فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ کون لڑ رہا ہے اور کیوں لڑ رہا ہے؟

لیکن اللہ مسلمانوں کی نصرت کا فیصلہ فرما چکا تھا۔ اس نے نبیؐ کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ قریش اور یہود کے درمیان پھوٹ ڈلوا دی جائے

اور اس کام کو ایک شخص نے خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام بھی دے ڈالا

اس نے یہود کو باور کرایا کہ قریش جب کامیاب ہو جائیں گے اور طاقت حاصل کریں گے تو غداری کریں گے اور دھوکا دیں گے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس وقت تک قریش کا ساتھ نہ دیا جائے۔ جب تک وہ یرغمال دینے پر رضامند نہ ہو جائیں۔ تاکہ اگر وہ بدعہدی اور غداری کریں تو یرغمال سے انتقام لیا جائے

اور قریش کو یہ سمجھایا کہ یہود ناقابل اعتبار ہیں۔ ان کی نیت ٹھیک نہیں۔ یہ سن کر قریش شک و شبہ میں مبتلا ہو گئے اور سوچ میں پڑ گئے۔

اب صورت یہ ہوئی کہ قریش یہود سے شرکت جنگ کا مطالبہ کرتے تھے۔

اور یہود قریش سے یرغمال کی شرط پر شریک جنگ ہونے کا وعدہ کرتے تھے ——
—— قریش کو یقین ہوگیا واقعی یہود کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔

اسی اثنا میں کہ یہ کشمکش یہود اور قریش کے درمیان جاری تھی کہ ایک رات زور کا طوفان باد آیا جس سے چراغ بجھ گئے، ہانڈیاں الٹ گئیں، خیمے اکھڑ گئے، اس ناگہانی طوفان نے انہیں سراسیمہ اور حواس باختہ کر دیا، دہشت اور اضطراب کی کیفیت ان پر طاری ہوگئی۔ ایک دوسرے کا پہچاننا مشکل ہوگیا۔ یہاں تک کہ صبح ہوتے ہی ابوسفیان کجاوے پر جا بیٹھا اور ساتھیوں کو مکے واپس چلنے کا حکم دیا۔

یہ سارے گروہ جو ابوسفیان کے اکسانے سے مدینے پر چڑھ آئے تھے خود اسی کے کہنے سے پراگندہ اور منتشر ہو گئے

قریش مکے میں واپس آگئے اور ان کے حلیف دشت و صحرا میں۔

اس زبردست ناکامی کے بعد قریش نے براہِ راست تو کوئی حملہ مدینے پر نہیں کیا۔ لیکن جزیرہ عرب میں آپؐ کے خلاف پروپیگنڈا جاری رکھا۔ اور نجد و حجاز کے مشرکین کو اکسانے اور ابھارنے کی سعی و جہد میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کو ان حالات کے باعث ایک گھڑی بھی راحت اور اطمینان کی میسر نہیں تھی۔ وقتاً فوقتاً ان کے پاس کبھی اس قبیلے کی کبھی اس قبیلے کی تاخت و تاراج کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ چاہے وہ قریب کے رہنے والے ہوں یا دور کے۔ ان کے مقابلے کو کبھی بہ نفس نفیس آپؐ خود تشریف لے جاتے، کبھی کسی کو بھیج دیتے

یہاں تک کہ ہجرت کا چھٹا سال شروع ہوا۔ آپؐ صحابہ کی ایک جماعت

کے ساتھ مکے روانہ ہوئے۔ مقصد جنگ و جدال نہ تھا۔ صرف عمرہ کرنا مقصود تھا۔ جیسے عرب کے لوگ عام طور پر حج اور عمرے کے لیے جایا کرتے تھے۔

لیکن ابھی آپ مقام حدیبیہ تک پہنچے تھے کہ قریش کو آپؐ کی آمد کی اطلاع مل گئی۔ انہوں نے آپؐ کو مکے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ دونوں کے درمیان بات چیت سفیروں کے ذریعہ شروع ہوئی۔ آپؐ نے اپنی اور صحابہ کی طرف سے یقین دلایا کہ ہمارا مقصد صرف عمرہ ہے۔

لیکن اس یقین دہانی کے باوجود قریش نے آپؐ کو مکے میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اور قتال و جدال کی دھمکی دینے لگے۔ بلکہ اس کی تیاری بھی شروع کر دی۔

اس کے بعد صلح ہو گئی۔ جو "صلح حدیبیہ" کے نام سے معروف ہے۔ یہی وہ چیز ہے۔ جس سے اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کے ایمان کا امتحان لیا تھا۔ اور جس سے بعض خیار مسلمین کے قلوب میں بھی زلزلہ برپا ہو گیا تھا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی یہ شرط تسلیم کر لی تھی کہ اس سال مکے میں داخل نہیں ہوں گے۔ اور قریش نے یہ مان لیا تھا کہ آئندہ سال آنے کی اجازت ہو گی۔ مگر اس شرط پر کہ غیر مسلح آئیں گے۔ صرف میان میں رکھی ہوئی تلوار ساتھ لائی جا سکتی ہے۔

یہ بات مسلمانوں پر گراں گزری

عمرؓ نے نبی سے سوال کیا ؟

کیا ہم حق پر نہیں ہیں ؟

آپؐ نے جواب دیا۔

"ہاں ہم حق پر ہیں ۔"

عمرؓ نے پھر سوال کیا۔

"کیا یہ قریش اہل باطل نہیں ہیں؟"

نبیؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"ہاں ہیں"۔

عمرؓ نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

"پھر ہم اپنے دین کے بارے میں کیوں دب رہے ہیں؟"

آپؐ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

"میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ اور وہ مجھے ہرگز ضائع نہیں کرے گا"

عمرؓ نے یہی سوال ابوبکرؓ سے دہرایا۔ ابوبکرؓ نے بھی وہی جواب دیا۔ کہ نبیؐ نے دیا تھا۔

جب عہدنامہ صلح مرتب ہوگیا۔ آپؐ نے صحابہ کو حکم دیا کہ احرام اتار دیں لیکن صحابہ نے تعمیل حکم میں سرگرمی نہیں دکھائی۔ اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس بات پر آپؐ بہت ملول ہوئے۔ لیکن آپؐ نے جامۂ احرام اتار دیا۔ اور آپؐ کی دیکھا دیکھی صحابہ نے بھی ایسا ہی کیا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ فتح میں فرمایا:۔

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا	یعنی:
لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ	بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا
مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَ	فتح دی تاکہ اللہ آپ کی سب اگلی
يُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَيَهۡدِيَكَ	پچھلی خطائیں معاف کر دے اور آپ پر

صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَّيَنْصُرَكَ
اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۝ هُوَ
الَّذِیٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ
فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ
لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ
اِيْمَانِهِمْ ط وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَ
كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝
لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ
الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ
وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ
فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ وَّيُعَذِّبَ
الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَ
الْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ
الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ط
عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ج وَ
غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ
وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ط وَسَآءَتْ
مَصِيْرًا ۝ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ

اپنے احسانات کی تکمیل کر دے اور آپ
کو سیدھے راستے پر لے چلے۔ اور اللہ
آپ کو ایسا غلبہ دے جس میں عزت ہی
عزت ہو۔ وہ خدا ایسا ہے جس نے مسلمانوں
کے دلوں میں سکینہ پیدا کیا ہے۔ تاکہ ان
کے پہلے ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور
زیادہ ہو اور آسمان و زمین کا سب لشکر
اللہ ہی کا ہے۔ اور (مصلحتوں کا) بڑا جاننے
والا اور بڑی حکمت والا ہے۔ تاکہ اللہ تعالےٰ
مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو ایسی
بہشت میں داخل کرے۔ جن کے نیچے
نہریں جاری ہوں گی۔ جن میں وہ ہمیشہ
رہیں گے اور تاکہ ان کے گناہ دور کر دے
اور یہ اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے
اور تاکہ اللہ تعالےٰ منافق مردوں اور
منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور
مشرک عورتوں کو عذاب دے۔ جو اللہ
کے ساتھ بدظنی رکھتے ہیں۔ ان پر بُرا وقت
پڑنے والا ہے اور آخرت میں اللہ تعالےٰ
ان پر غضب ناک ہوگا اور ان کو رحمت سے
دور کر دے گا۔ ان کے لیے اس نے دوزخ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَكَانَ	تیار کر رکھی ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے
اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ہ	اور آسمان و زمین کا سب لشکر اللہ ہی کا
	ہے۔ اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے،

راویوں کا بیان ہے کہ جب یہ سورۃ تلاوت کی گئی تو بعض مسلمانوں نے آپؐ سے سوال کیا:

"کیا یہ (صلح حدیبیہ) ہماری فتح ہے"؟

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

"ہاں، بے شک"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان رضؓ کو حدیبیہ سے سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تھا۔ ان کی واپسی میں تاخیر ہوئی۔ مشہور یہ ہوا کہ قریش نے انہیں ہلاک کر ڈالا ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے موت پر بیعت لینے کے لیئے دست مبارک بڑھایا۔ جملہ صحابہ نے فوراً بیعت کرلی۔ کسی نے چون وچرا سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے سورۃ فتح میں اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے:۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ	یعنی:
اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ	بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے خوش ہوا جبکہ
فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ	یہ لوگ درخت کے نیچے آپ (کے ہاتھ پر)
السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ	بیعت کر رہے تھے۔ اور ان کے دلوں میں
فَتْحًا قَرِيْبًا ہ وَّمَغَانِمَ	جو کچھ تھا خدا کو وہ بھی معلوم تھا، پس اللہ تعالیٰ
كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ط وَكَانَ	نے ان میں اطمینان پیدا کر دیا اور ان کو ایک
اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ہ	لگتے ہاتھ فتح دے دی (خیبر کی فتح) اور (اس

فتح میں) بہت سی غنیمتیں بھی (دیں) جن کو یہ
لوگ لے رہے ہیں اور اور اللہ تعالے بڑا
زبردست حکمت والا ہے۔"

عہدنامہ حدیبیہ کی رو سے طے پایا:۔

: فریقین میں دس سال تک صلح رہے گی۔

: اہل عرب میں سے جو چاہے قریش سے معاہدہ دوستی کرلے۔ جو چاہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

: اصحاب نبی ؐ میں سے جو شخص قریش کے پاس بھاگ کر جائے گا۔ وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

: اور قریش مکہ کے مسلمانوں میں سے جو راہِ فرار اختیار کر کے نبی ؐ کے پاس آجائے گا۔ وہ قریش کو واپس کر دیا جائے گا

: سال آئندہ بہ ارادہ عمرہ نبی ؐ و اصحاب نبی ؐ جب مکے میں آئیں گے۔ تو قریش مکہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ مسلمان اپنے ساتھ کوئی ہتھیار نہیں لائیں گے، سوا نیام کی ہوئی تلواروں کے۔

: مسلمان تین دن سے زیادہ مکے میں قیام نہیں کریں گے

یہ تھے وہ شروط جن پر معاہدہ قائم تھا۔
مسلمانوں کے ایک گروہ پر یہ معاہدہ گراں تھا۔ انہوں نے اس پر غور نہیں کیا تھا کہ اس معاہدے کے ماتحت گو بعض پہلو بعض اعتبارات سے گراں ہیں۔ لیکن ان عربوں کو حلیف بنانے کی پوری آزادی حاصل ہے جن کا قریش سے کوئی معاہدہ اسطرح کا نہ ہو

اور اس معاہدہ کا ایک پہلو اور بھی تھا :

یہ کہ کچھ عرصہ کیلیے امن حاصل ہو گیا۔ جس میں سکون و اطمینان کے ساتھ وہ زندگی بسر کر سکتے اور اپنی جمعیت کو مضبوط کر سکتے تھے اور یہی وہ فتح قریب تھی جس کی بشارت اللہ تعالےٰ نے دی تھی ۔ اور جس کے نتیجے میں بکثرت مال غنیمت انہیں حاصل ہوا تھا۔

بہر حال بات کوئی بھی ہو آخر کار مسلمانوں کا دل خوش ہو گیا اور انہوں نے جان لیا کہ ناخوشی اور رنج کا اظہار کر کے انہوں نے جلد بازی سے کام لیا تھا۔ اگر وہ ذرا تامّل سے کام لیتے تو محسوس کر لیتے کہ اس میں ان کے لیے بھلائی تھی ۔

لیکن اللہ اور اس کے نبی ؐ نے انہیں اس لغزش سے معاف کر دیا ۔

۱۵

مسلمان اور یہود

داعیٔ اسلام سے یہود کی دشمنی، قرآن میں یہود کا ذکر۔

مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر قریش کی عداوت و خصومت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تو مدینے (یثرب) میں یہود موجود تھے جو عداوت و خصومت میں کسی طرح قریش سے کم نہ تھے۔ یہ مدینے میں آپ کے اور مسلمانوں کے پڑوسی تھے۔ لیکن اچھے پڑوسی نہیں تھے۔ ان کا کفر بہت شدید تھا۔ اور مکر، کفر سے بھی زیادہ شدید تھا۔ مدینے کے منافقوں سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ انہیں نفاق پر اکساتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان میں اور منافقوں میں اسلام سے پہلے کے معاہدات اور تعلقات تھے، ان کے کفر میں برابر اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ان کے طغیان اور سرکشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ یہ اہل کتاب تھے۔ تورات کی تلاوت کرتے تھے یا اگر یہ نہیں تو ان کے احبار اسے پڑھا کرتے تھے۔ انہیں اس پر ناز تھا کہ بت پرستوں اور خدا ناآشنا ان قبیلوں کے ہجوم میں وہی تنہا صاحب دین و مذہب ہیں۔ اور اس دین میں مسلمانوں سے سبقت رکھتے ہیں، شئونِ نبوت سے واقف ہیں۔ یہ لوگ موسیٰؑ کی تعظیم کرتے تھے اور کہتے تھے، کہ مسلمان بھی ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ یہ لوگ قرآن سنتے تھے تب بھی تعظیم موسیٰؑ کے بارے میں

آیات سنا کرتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ راہِ راست پر تھے۔ جس طرح نصاریٰ کے مقابلے میں اپنے آپ کو راہِ راست پر سمجھا کرتے تھے۔ یہ اصحابِ جدال تھے اور ان کی خوئے جدال کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ اصحاب عناد تھے اور ان کی خوئے عناد سکون و قرار سے محروم تھی۔ یہ حق و صداقت کے خلاف جری بھی بہت زیادہ تھے اور باطل سے انہیں گہرا قلبی لگاؤ تھا۔ یہ جانتے تھے مسلمان تورات کو اصل عبرانی زبان میں نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ لہٰذا حسبِ مرضی تحریف کرتے رہتے تھے نہ اسے یہ معیوب سمجھتے تھے، نہ عواقب و نتائج کی انہیں پرواہ تھی۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے طرح طرح کی باتیں پوچھا کرتے تھے پھر جب حسب وحی الٰہی آپ جواب صحیح دیتے تھے تو چکرا جاتے تھے انکے جذبۂ عناد و خصومت میں اور زیادہ اضافہ ہوجاتا تھا

یہ پاسِ عہد کے خوگر بھی نہیں تھے۔ معاہدے کرتے اس لیے تھے کہ جب چاہیں توڑ دیں جھوٹ بھی بے دھڑک بولتے تھے۔ مسلمانوں میں سے کوئی بھی ان سے مامون نہیں تھا۔ نہ ان کے قول سے نہ ان کے عمل سے ——— !

کچھ عرصہ تک تو یہ یہودی اپنے غدر و فریب کو چھپاتے رہے لیکن بہت جلد بے نقاب ہوگئے۔ اپنے عمل سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ ان کا جوار قطعاً غیر مامون تھا۔

یہودیوں کے ایک گروہ ——— بنو نضیر ——— نے فیصلہ کر لیا کہ آپؐ کو قتل کر دیں گے۔ طریقہ وہی اختیار کیا گیا جو ان کا معمول تھا۔ یعنی مکر اور فریب۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی فریب کاری سے مطلع کر دیا۔ پھر آپؐ نے انہیں جلاوطن کر دیا اور مدینے سے باہر نکال دیا۔

ایک دوسرے یہودی گروہ ——— بنو قینقاع ——— نے بھی بدعہدی اور غدر و فریب کا مظاہرہ کیا۔ یہ بھی مدینہ سے جلاوطن کر دیئے گئے اور اسلحہ کے سوا ان کی دوسری غیر منقولہ چیزیں ضبط کر لی گئیں۔

یہودیوں کے ایک اور گروہ نے جنگِ احزاب کے موقع پر نہ صرف خلاف عہد مسلمانوں کی کوئی مدد نہیں کی، بلکہ قریش سے ساز باز کر کے مل گئے

آخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں تک کہ یہ حکم کا فیصلہ مان لینے پر رضامند ہو کر باہر نکل آئے۔ ان کے حکم سعد بن معاذ رض بنائے گئے۔ جنہوں نے فیصلہ کیا۔ کہ قابلِ جنگ مرد قتل کر دیے جائیں۔ مال و زر ضبط کر لیا جائے۔ بچوں اور عورتوں کو اسیرِ جنگ بنا لیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد رض کا یہ حکم نافذ کر دیا۔

مذکورہ بالا یہودی قبیلے ——— بنو قریظہ ——— کے ساتھ جو ماجرا گزرا، سورۂ احزاب میں اللہ تعالےٰ نے بایں الفاظ اس کا ذکر کیا ہے:۔

وَ اَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ	یعنی:
مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ	اور جن اہل کتاب نے ان کی مدد کی تھی۔ انہیں
صَیَاصِیْهِمْ وَ قَذَفَ فِیْ	ان کے قلعوں سے نیچے اتار دیا۔ اور ان کے
قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا	دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیا۔ بعض کو تم
تَقْتُلُوْنَ وَ تَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًاؕ	قتل کرنے لگے بعض کو تم نے قید کر لیا اور ان
وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ	کے گھروں، ان کی زمین اور ان کے مالوں کا
دِیَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ	تم کو مالک بنا دیا۔ اور ایسی زمین کا بھی جس پر
اَرْضًا لَّمْ تَطَـٔوْهَاؕ وَ كَانَ	تم نے قدم نہیں رکھا۔ اور اللہ تعالےٰ ہر چیز پر
اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًاؕ	پوری قدرت رکھتا ہے۔

خیبر اور وادی القریٰ میں جو یہود رہتے تھے یہ زیادہ طاقتور اور زیادہ مال دار تھے۔ واقعہ حدیبیہ کے بعد اللہ نے اپنے رسولؐ کو ان پر قابو دے دیا۔ یہی وہ فتح قریب تھی جس کا سورۃ فتح میں وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ ان سے مقابلہ ہوا اور آپؐ اس وقت تک واپس نہیں آئے جب تک انہیں شکست فاش نہ دے لی۔ ان کے قلعے فتح ہو گئے۔ ان کی زمین مالِ غنیمت بن گئی اور ان سے طے یہ پایا کہ یہ بدستور کاشتکاری کرتے ہیں۔ پیداوار کا نصف مسلمانوں کا اور بقیہ نصف ان کا۔ اپنی زمین پر یہ کام اب بھی کرتے تھے۔ اسی کے سہارے ان کا آذوقہ قائم تھا۔ لیکن قوت سے محروم ہو چکے تھے۔ مکر و کید کرنے کا دم اب ان میں نہیں رہ گیا تھا۔

اللہ نے اپنے نبیؐ اور اس کے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ اہل کتاب کے ساتھ بطریق احسن مجادلہ کیا کریں۔ اور ان سے کہیں ہم اس پر ایمان لائے جس کا نزول ہم پر اور تم پر ہوا ہے۔ ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں۔

اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے ساتھ رفق اور جدال رفیق کی تاکید عام ہے۔ البتہ استثنار صرف ان لوگوں کا ہے جو ظالم ہوں اور ان کا ظلم واضح ہو۔ چنانچہ سورہ عنکبوت میں وارد ہوا ہے:۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ	یعنی:
اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ	تم اہل کتاب کے ساتھ بجز مہذب طریقوں
اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ	کے مباحثہ مت کرو۔ ہاں جو ان میں زیادتی کریں
وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ	اور یوں کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے
اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ	ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور ان کتابوں پر بھی
وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ	جو تم پر نازل ہوئیں۔ اور ہمارا تمہارا معبود ایک ہے

وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ اور ہم تو اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے اور یہاں مستقل طور پر اقامت گزیں ہوئے۔ اور مہاجرین وانصار کے درمیان زندگی بسر کرنے لگے۔ تو آپ نے یہود کے ساتھ کسی طرح کا معاندانہ برتاؤ نہیں کیا۔ نہ اُن کے ساتھ کسی طرح کی بدسلوکی کا برتاؤ کیا۔ بلکہ ان کے ساتھ تمام تر اور یکسر رفیق و مدارا کا برتاؤ فرمایا اور کوشش کی کہ مسلمان اور یہودیوں کے مابین حسن جوار، تعاون اور وقتِ خطر امداد و استمداد کے صلات و تعلقات قائم ہوجائیں۔

یہود نے بھی اس فراخ دلانہ برتاؤ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ لیکن بہت جلد وہ اپنی سرشت پر آگئے۔ اور مسلمانوں کے مقابلے میں قریش کے ہم عناں اور ہم نوا ہوگئے۔ اور ظلم وجفا کا مظاہرہ کرنے لگے۔ گویا خود اپنے طرزِ عمل سے آیاتِ بالا کے استثنائی حدود میں داخل ہوگئے۔ چنانچہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان مستقل اور متواتر جدال و پیکار کی صورت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ قرآن کریم میں بکثرت اس سلسلے میں آیات کریمہ نازل ہوئیں۔

قرآن میں ان کے جو اوصاف و خصائل بیان ہوئے ہیں۔ یہ ہیں:

: انبیاء کے مقابلے میں ان کا طرزِ عمل ہمیشہ کفر و جحود اور انکار و اعراض کا رہا ہے

: اس کفر و جحود کی پاداش میں اللہ تعالےٰ کے عقاب و عتاب کے سزاوار ٹھہرے

: کذب و افتراء کو انہوں نے اپنی سرشت اور فطرت بنالیا تھا۔

: کتاب الٰہی کو یہ اپنے خیالات اور مرضی کے مطابق ڈھال لینے کے عادی رہے ہیں۔

: تحریف کرتے ہیں۔

: نفاق کے عادی ہیں

: اللہ کی طرف سے بار بار انہیں نصیحت اور زجر و توبیخ کی گئی کہ لوگوں کو نیکی اور خیر کی تعلیم دیتے ہیں اور خود اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہیں۔

: انہیں یاد دلایا گیا اور بار بار یاد دلایا گیا کہ اللہ نے انہیں آل فرعون سے نجات دی۔ جنہوں نے ان پر طرح طرح کے عذاب توڑ رکھے تھے۔ ان کے لڑکوں کو ذبح کر دیتے تھے۔ عورتوں کی بے آبروئی کرتے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے آل فرعون کو غرق کر دیا گیا۔

: اللہ کی نعمتوں کی انہوں نے قدر نہیں کی۔ اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔ بچھڑا پوجنے لگے۔

: بار بار انہیں یہ بھی یاد دلایا گیا کہ ارض مقدس کے داخلے کی صورت میں جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے خاص کر دیا تھا۔ انہوں نے بزدلی، اور کم حوصلگی کا ثبوت دیا اور موسیٰؑ سے صاف صاف کہدیا:

اذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ○

یعنی: آپ اور آپ کا رب جائیں اور جنگ کریں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔

: ان سے جو گناہ سرزد ہوئے تھے تکذیب رسل جس طرح یہ کرتے رہے تھے۔ انبیاء کو انہوں نے جس طرح قتل کیا تھا۔ اور اس سلسلے میں طرح طرح کی سزاؤں اور عقاب الٰہی کے جس طرح یہ مورد بنے تھے۔ سب باتیں شمار کرائی گئیں۔

: اپنے لیے جن خلافِ حقیقت خصائص کے مدعی تھے ان کی تائید کی گئی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہ دوزخ میں گئے بھی تو بس چند روز کے لیے۔ اللہ نے اپنے نبیؐ

کو حکم دیا کہ ان سے پوچھے :۔

"کیا تم نے سزا سے بچ جانے کا خدا سے کوئی معاہدہ کر رکھا ہے"۔

: اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی ؐ کو حکم دیا کہ ان سے کہے کہ اگر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں عالمِ آخرت صرف تمہارے ہی لیے ہے تو زندہ کیوں ہو ؟ مرنے کی آرزو کیوں نہیں کرتے "۔

: پھر اللہ تعالےٰ نے مؤکد طور پہ فرمایا کہ یہ ہرگز موت کی آرزو نہیں کرسکتے کیونکہ اپنے سیئات سے بخوبی واقف ہیں۔

: جب یہ کہتے ہیں کہ دوزخ میں چند دن سے زیادہ نہیں رہیں گے۔ یا عالمِ آخرت ان کے لیے خاص ہے تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔

: اللہ تعالےٰ نے بتایا کہ یہ تو زندگی کے بڑے حریص ہیں۔ ان میں سے کسی کو اگر ہزار برس کی عمر مل جائے تو اور خوش ہوگا۔

غرض یہود کے ان عادات و خصائل کی طرف قرآن نے بار بار اشارہ کیا ہے اور انہیں سختی کے ساتھ ٹوکا ہے۔ اور ملامت کی ہے کہ ان کی ساری تاریخ جحود، غدر اور کفر سے بھرپور ہے۔

تحویل قبلہ کا معاملہ یہود پر سے پہلی مرتبہ رفق و مدار کا ہاتھ اٹھا لینے کا واقعہ تھا۔ یہود سے انحراف کی خاطر آپ کی خواہش تھی کہ نمازمیں مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے مسجد حرام ہو۔ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ میں اسی ذیل میں ارشاد ہوا ہے :۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ

یعنی :

ہم آپ کے منہ کا (یہ) بار بار اٹھنا آسمان کی طرف

قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ
حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ
شَطْرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ
مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝

دیکھ رہے ہیں۔اس لیے ہم آپ کو اس قبلے کی
طرف متوجہ کر دیں گے جس کے لیے آپ کی مرضی
ہے (تو) پھر اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (کعبہ)
کی طرف کر لیا کیجیے اور تم سب لوگ جہاں کہیں
بھی موجود ہو اپنے چہروں کو اسی (مسجد حرام)
کی طرف کیا کرو۔ اور یہ اہل کتاب بھی یقیناً
جانتے ہیں کہ یہ (حکم) بالکل ٹھیک ہے (اور)
ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے اور اللہ
ان کی کارروائیوں سے بے خبر نہیں ہے۔

پھر اسی سورۃ میں ارشاد فرمایا:۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا
تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا اَنْتَ
بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَ مَا
بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ
وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ
الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ
الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا

یعنی:

اور اگر آپ (ان) اہل کتاب کے سامنے تمام
(دنیا بھر کی) دلیلیں پیش کر دیں تب بھی یہ (کبھی)
آپ کے قبلے کو قبول نہ کریں اور آپ بھی ان کے
قبلے کو قبول نہیں کر سکتے۔ پھر موافقت کی کیا
صورت۔ اور ان کا کوئی (فریق) بھی دوسرے
(فریق) کے قبلے کو قبول نہیں کرتا اور اگر ان کے ان
نفسانی خیالات کو اختیار کر لیں (اور وہ بھی) آپ
کے پاس علم (وحی) آئے پیچھے تو یقیناً آپ
ظالموں میں شمار ہونے لگیں گے۔ جن لوگوں کو

يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

ہم نے کتاب (تورات و انجیل) دی وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور بعض ان میں سے امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اخفا کرتے ہیں

پھر اس کے بعد اسی سورۃ میں وضاحت فرمائی کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ انسان اپنا منہ مشرق و مغرب کی طرف کرلے بلکہ نیکی عبادت ہے۔ دوسرے کمالات سے جن کا ذکر اس آیت میں فرمایا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ

یعنی:

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی، لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتب (سماوی) پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتے داروں کو اور یتیموں اور محتاجوں کو اور (بے خرچ) مسافروں کو اور سوال کرنیوالوں کو اور غلام آزاد کرانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کرلیں اور وہ لوگ مستقل مزاج ہوں تنگ دستی میں اور بیماری

الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ٥

ہیں۔ یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی کہے جا سکتے ہیں۔

اور اس کے بعد جب مدینے سے یہود نکل گئے اور خیبر ان سے پاک ہوگیا اور وادی القریٰ میں ان کا ٹھکانا نہ رہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے مابین جدال کا سلسلہ بھی کم ہوگیا۔ اور قرآن میں بھی ان کا ذکر قدرے قلیل آنے لگا۔ کیونکہ اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہ گئی تھی اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ یہ دنیا میں ذلیل اور آخرت میں رسوا ہوں گے۔

(۱۶)

مُسلمان اور نصاریٰ

○

یہود اور نصاریٰ میں فرق، نجران کے عیسائیوں سے مباہلہ، جنگِ موتہ کا محرک

جزیرہ عرب میں نصاریٰ کو کسی طرح کی امتیازی یا خصوصی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ نجران میں ان کی ایک جماعت آباد تھی۔ جزیرہ عرب میں ان کے افراد و اشخاص یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین جدال متصل کی صورت قائم نہیں تھی۔

قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ از روئے مودت مسلمانوں سے قریب ترین عیسائی ہیں سورۃ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ	یعنی:
عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا	تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت
الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا	رکھنے والے آپ ان یہود اور ان مشرکین کو
وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً	پائیں گے اور ان میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی
لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ	رکھنے کے قریب تر ان لوگوں کو پائیں گے جو

قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ط
ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ
قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّ
اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ٥
وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ
اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى
اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ
مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا
فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ٥
وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ
وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ لا وَ
نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا
مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ٥
فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ ٥ وَذٰلِكَ
جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ٥

اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ یہ اس سبب سے کہ
ان میں سے بہت سے علم دوست عالم
ہیں اور بہت سے تارک الدنیا درویش ہیں۔
اور اس سبب سے ہے کہ لوگ متکبر نہیں ہیں
اور جب کہ وہ اسے سنتے ہیں جو رسول خدا
کی طرف بھیجا گیا ہے۔ تو آپ ان کی آنکھیں
آنسوؤں سے بہتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ اس سبب
سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ یوں کہتے
ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے
پس ہمیں بھی ان کے بیچ لکھ لیجیے جو تصدیق
کرتے ہیں۔ اور ہمیں کونسا عذر ہے کہ ہم
اللہ تعالے پر اور جو حق ہم تک پہنچا ہے۔
اس پر ایمان نہ لائیں اور اس بات کی امید
رکھیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک لوگوں کی معیت
میں داخل کرے گا۔ سو انہیں اللہ تعالے
ان کے قول کی پاداش میں ایسے باغ دینگے
جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ ان میں
ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور نیکوکاروں کی یہی
پاداش ہے اور جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری
آیات کو جھوٹا کہتے رہے۔ وہ لوگ دوزخ
والے ہیں۔

قرآن کریم میں اس موضوع پر جو کچھ وارد ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

: عیسیٰ بن مریمؑ کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے۔ وہ روح جسے اللہ نے مریم میں ڈالا تھا۔

: سورۃ آل عمران اور سورۃ مریمؑ میں اللہ نے اخبار ملائکہ کا ذکر فرمایا ہے جو انہوں نے مریم تک ولادت مسیح کے سلسلہ میں پہنچائے تھے۔

: اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنے معجزات کے ساتھ خاص فرمایا ہے۔ جو کسی اور رسول کو نہیں دیئے گئے۔

: ان کی ایک خصوصیت احیاء موتیٰ یعنی مردوں کو زندہ کر دینا بیان کی ہے

: ایک اور صفت مبروص واکمہ کو چنگا کر دینے کی بیان فرمائی ہے۔

: ایک اور خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ مٹی سان کر پرند کی شکل میں تبدیل کر دیتے اور اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ پرند بن جاتا تھا۔

: ان پر اور ان کے اصحاب پر آسمان سے خوانِ نعمت اتارا تھا۔

: گہوارے میں لوگوں سے بات کرنے کی خصوصیت آپ کو عطا فرمائی تھی۔

: انہیں بنی اسرائیل کی طرف بھیجا کہ ایمان باللہ کی دعوت دیں حق الہٰی کو ادا کرنے کا امر فرمائیں۔ اور جن سیئات و آثام میں انہوں نے اپنے آپ کو لت پت کر لیا ہے۔ ان کے دائرے سے باہر نکل آئیں۔

: ازراہ امتحان جو شدید پابندیاں پہلے عاید کی گئی تھیں۔ ان میں تخفیف کر دی گئی۔

: لیکن یہود نے انہیں جھٹلایا، اذیت دی، قتل کرنے اور پھانسی دینے

کی تدبیریں کیں۔ لیکن نہ انہیں پھانسی دے سکے نہ قتل کر سکے۔ بلکہ مغالطے میں پڑ گئے۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں اپنے پاس اٹھا لیا۔

یہود غضب الٰہی کے مورد اس لیے بھی بنے کہ یہود نے حضرت مریمؑ پر تہمت لگائی تھی۔ اور ان پر بہتانِ عظیم باندھا تھا اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ انہوں نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔ لیکن "کلمۃ اللہ" کو بھلا کون قتل کر سکتا تھا؟ اور "روح من اللہ" کو کیونکر پھانسی دی جا سکتی تھی؟ چنانچہ ذیل میں اللہ تعالےٰ سورۃ نساء میں فرماتا ہے:

وَّ بِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى	یعنی:
مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝	اور ان کے کفر کی وجہ سے اور (حضرت مریمؑ پر)
وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ	ان کے بڑا بھاری بہتان دھرنے کی وجہ سے
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ	اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے
اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ	مسیح عیسیٰ بن مریم کو جو کہ رسول اللہ ہیں قتل کر
وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَ	دیا۔ حالانکہ نہ انہوں نے ان کو قتل کیا۔ نہ سولی
اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ	پر چڑھایا۔ لیکن ان کو اشتباہ آ گیا اور جو لوگ
لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ	ان کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں۔ وہ غلط
بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ	خیال میں ہیں۔ ان کے پاس اس امر پر کوئی دلیل
الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝	نہیں بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے اور انہوں
بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَ	نے یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا۔ بلکہ انہیں خدا
كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝	نے اپنی طرف اٹھا لیا ہے اور اللہ بڑا زبردست
وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	حکمت والا ہے۔ اور کوئی شخص اہل کتاب کا

إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۔

نہیں رہتا۔ مگر وہ عیسیٰ علیہ السلام کی اپنے مرنے سے پہلے ضرور تصدیق کر لیتا ہے اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نصاریٰ کی دو اہم ترین باتوں پر نہایت سخت انداز میں نکیر کی ہے۔ جن میں سے ایک مسیح کو خدا کا مثل ماننا اور ان کی عبادت کرنا ہے۔

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

یعنی:

بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عین مسیح ابن مریم ہے آپ یوں پوچھئے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو یہ بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ حضرت مسیح ابن مریم کو اور ان کی والدہ کو اور جتنے زمین میں ہیں ان سب کو ہلاک کرنا چاہے تو کوئی ایسا شخص ہے جو خدا سے انہیں ذرا بھی بچا سکے اور اللہ ہی کے لیے خاص ہے حکومت آسمانوں پر اور زمین پر اور جتنی چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں۔ اور وہ جس چیز کو چاہے پیدا کرے۔ اور اللہ کو ہر چیز پر پوری قدرت حاصل ہے۔

اسی سورۃ میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا

یعنی:

اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ	بیشک وہ لوگ کافر ہو چکے ہیں جنہوں نے یہ کہا
مَرْیَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِیْحُ	کہ اللہ عین مسیح ابن مریم ہے حالانکہ مسیح نے خود
یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اعْبُدُوا	کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ کی عبادت کرو
اللّٰہَ رَبِّیْ وَ رَبَّکُمْ ؕ اِنَّہٗ	جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے بیشک
مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ	جو شخص اللہ کے ساتھ شریک قرار دے گا۔
حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ	سو اس پر اللہ جنت حرام کر دے گا۔ اور
وَ مَاْوٰىہُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ	اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ایسے ظالموں کا
مِنْ اَنْصَارٍ ۝	کوئی مددگار نہ ہوگا

آیات بالا سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے :

: مسیح کو عبادت نصاریٰ سے بری فرمایا ہے،

: فرمایا ہے کہ مسیح کی دعوت بنی اسرائیل کو یہ تھی کہ خدا کی عبادت کریں۔ جو سب کا رب ہے

: شرک سے منع فرمایا ہے۔

اسی سورۃ کی دوسری آیات میں اور زیادہ وضاحت و صراحت کے ساتھ فرمایا ہے :

وَ اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ	یعنی:
مَرْیَمَ ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ	وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب اللہ کہے گا اے
اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰھَیْنِ	عیسٰی ابن مریم کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا
مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَکَ	کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی علاوہ خدا کے معبود
مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا	قرار دو (عیسٰی عرض کریں گے کہ (توبہ توبہ) میں تو

لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ ط اِنْ كُنْتُ
قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ط تَعْلَمُ
مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا
فِیْ نَفْسِكَ ط اِنَّكَ اَنْتَ
عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ہ مَا قُلْتُ
لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ
اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ
وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا
مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ
كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ
وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ
شَهِیْدٌ ہ

آپ کو شریک سے منزہ سمجھتا ہوں۔ مجھے کسی طرح زیبا نہ تھا کہ ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہ تھا۔ اگر میں نے کہا ہوگا تو تجھے اس کا علم ہوگا تُو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتا ہے اور میں تیرے علم میں جو کچھ ہے اسے نہیں جانتا۔ تمام غیبوں کا جاننے والا تو ہی ہے۔ میں نے تو ان سے اور کچھ نہیں کہا۔ مگر صرف وہی جو تو نے مجھ سے کہنے کو فرمایا تھا کہ تم اللہ کی بندگی اختیار کرو۔ جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ہے اور میں ان پر مطلع رہا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دی تو پھر تُو ان پر مطلع رہا۔ اور تو ہر چیز کی پوری خبر رکھتا ہے۔

❖

دوسری بات جس پر اللہ تعالےٰ نے نصاریٰ کی سخت پکڑ کی ہے۔ وہ ہے تثلیث ان کا قول تھا کہ:

"اللہ تین معبودوں میں سے ایک ہے۔"

چنانچہ سورۃ مائدہ میں فرمایا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا
اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ م وَ
مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ ط وَاِنْ لَّمْ یَنْتَهُوْا

یعنی:

بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ بجز ایک معبود کے کوئی معبود نہیں اور اگر یہ لوگ اپنے ان اقوال سے باز نہ آئے تو جو لوگ ان میں کافر رہیں گے ان پر

عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اَفَلَا
يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ
يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ
مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ
خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ
وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا
يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ
كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ
ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

دردناک عذاب واقع ہوگا۔ کیا پھر بھی خدا کے
سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے
حالاں کہ وہ بڑا مغفرت کرنے والا
بڑی رحمت کرنے والا ہے۔ مسیح ابن مریم
کچھ بھی نہیں، ایک پیغمبر ہیں۔ جن سے
پہلے اور بھی پیغمبر گزر چکے ہیں۔ اور
ان کی والدہ ایک ولی بی بی ہیں۔
دونوں کھانا کھایا کرتے ہیں۔ دیکھئے
تو ہم کیوں کر دلائل ان سے بیان
کر رہے ہیں۔ پھر دیکھیے وہ الٹے کدھر
جا رہے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور نصاریٰ کے مابین جہاں تک ہم جانتے ہیں کوئی جدال نہیں تھا سوا اس صورت کے جب نجران کے نصاریٰ کا وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے سورۂ آل عمران میں اس جدال کی طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی بھی وہی مثال ہے جو آدم کی تھی۔ جن کی تخلیق مٹی سے "کُنْ فَیَکُوْن" کی صورت میں ہوئی تھی۔

ارشاد خداوندی کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا اپنے اندر کوئی غرابت نہیں رکھتا۔ اللہ نے آدم کو خاک سے پیدا کیا۔ یعنی بن ماں باپ کے پس جو ہستی اس پر قدرت رکھتی ہے کہ بن ماں باپ کے کسی انسان کو پیدا کر دے۔ وہ صرف بن باپ کا

کیوں نہیں پیدا کر سکتی؟

پھر نصاریٰ سے آپؐ کو مباہلے کا حکم ملا۔ اور مباہلے کی صفت بھی بیان کر دی:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ	یعنی:
بَعْدِ مَاجَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ	پس جو شخص آپ سے عیسیٰؑ کے باب میں
فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا	(اب بھی) حجت کرے آپ کے پاس علم (قطعی)
وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَ	آنے کے بعد تو آپ فرما دیں کہ آجاؤ ہم (اور تم)
نِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَ	بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو، اپنی
اَنْفُسَكُمْ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ	عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو۔ اپنے تنوں کو
فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى	اور تمہارے تنوں کو پھر ہم (سب مل کر) خوب
الْكٰذِبِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ	دل سے دعا کریں اس طور پر کہ خدا لعنت بھیجے
الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ	ان پر جو (اس بحث میں) ناحق پر ہوں۔ بیشک
اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ	یہ (جو کچھ مذکور ہوا) وہی ہے سچی بات اور
لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ فَاِنْ	کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں، بجز اللہ کے اور
تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ	بیشک وہی غلبے والا اور حکمت والا ہے پھر (بھی)
بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝	اگر سرتابی کریں تو بیشک خدا خوب جاننے والا
	ہے فسادیوں کو۔

پھر آپ کو حکم ملا کہ اہل کتاب ——— یہود و نصاریٰ ——— کو ایک ایسے کلمے کی طرف بلائیں جو مسلمانوں میں اور ان میں مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ خدائے واحد کی عبادت کی جائے۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، نہ اللہ کے سوا کسی کو رب بنایا جائے۔

پھر آپ ؐ کو اللہ تعالےٰ نے حکم دیا کہ اگر اس دعوت کو قبول نہ کریں تو آپ ؐ اور آپؐ کے اصحابؓ اعلان کریں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا مذہب صرف خدائے واحد کی پرستش ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کی سورۃ آل عمران میں ارشاد ہوا:

قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا	یعنی:
إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا	آپ فرمادیں کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی
وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا	بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان
اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا	(مسلم ہونے میں) برابر ہے یہ کہ بجز اللہ تعالےٰ کے
وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا	کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو
أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط فَإِنْ	شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے
تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا	کو رب نہ قرار دے خدا کو چھوڑ کر پھر اگر وہ لوگ
مُسْلِمُوْنَ ٥	(حق سے) اعراض کریں تو تم لوگ کہدو کہ تم (ہمارے
	اس اقرار کے) گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔

راویوں کا بیان ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے مباہلہ قبول نہیں کیا جس کی انہیں یہ حکم الٰہی دعوت دی گئی تھی۔ اور اپنے بلاد میں واپس چلے گئے۔ گویا انہوں نے آپ ؐ کی بات کا وزن محسوس کر لیا۔ اور اپنی جان کو مباہلہ قبول کر کے خطرے میں نہیں ڈالا۔

جزیرہ عرب میں آپؐ کے اور نصاریٰ کے مابین کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ البتہ ایک روز مسلمانوں کے گوش سے یہ بات ٹکرائی کہ نصاریٰ نے عرب شام کی سرزمین پر مسلمانوں سے جنگ کے لیے تیار ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شام کے نصاریٰ نے عرب کے نصاریٰ کے مقابلے میں بھی

صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مضمرات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ وہ جنگ پر اس لیے تیار ہوئے تھے کہ انہیں یہ بات کسی طرح گوارا نہیں تھی کہ جزیرۂ عرب میں ایک ایسی حکومت قائم ہو جائے جو بازنطینی شہنشاہیت کے لیے خطرۂ عظیم ثابت ہو سکے۔ اور غالباً یہی چیز تھی جس سے عہدہ برا ہونے کے لیے آپؐ نے "موتہ" کے میدان میں جو حدود شام وجزیرۂ عربیہ پر قائم تھا ایک جیش روانہ فرمایا۔ جس میں اسلام کے تین علمبردار یکے بعد دیگرے شہید ہوئے۔ اور شاید صورت حال بہت نازک ہو جاتی اگر خالد بن ولید ——————— رحمتہ اللہ ——————— کی حربی مہارت نے پانسہ نہ پلٹ دیا ہوتا۔

◎

مسلمان اور منافقین

منافقین کی طرف سے ایذا رسانی، مکر و کید، دروغ و فریب، غداری اور بے وفائی،

منافقین کا مرقع آیاتِ قرآنی کی روشنی میں

منافقین کا معاملہ حد درجہ پیچیدہ اور نازک تھا۔

مدینے میں آپؐ کے ورود فرما ہونے کے وقت سے لے کر اس دنیا سے تشریف لے جانے وقت تک ان کے شر و بلا، کا سلسلہ پوری یک رنگی، تسلسل اور شدت کیساتھ جاری رہا۔

منافقین کا معاملہ حد درجہ کٹھن اور نازک تھا۔ لیکن ایک اعتبار سے یہود اور مشرکین کے مقابلے میں ہلکا بھی تھا۔ کیونکہ ان میں اور مسلمانوں میں نہ کوئی باقاعدہ جنگ ہوئی۔ نہ خونریزی کی نوبت آئی۔ پھر ایک اور اعتبار سے دیکھیے تو منافقین کا معاملہ مشرکین و یہود سے کہیں زیادہ سخت و شدید بھی تھا۔ اس لیے کہ انہوں نے آپ کی دعوت کا انکار نہیں کیا۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے نہیں بچھائے۔ آپ سے نت نئے معجزات نہیں طلب کئے بلکہ اسلام قبول کرلیا۔

——— اسلام قبول کر لیا اور کفر کو دل کے سیہ خانے میں مخفی رکھا۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب نبیؐ سے عداوت صریحہ کا کبھی برملا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ مودت اور محبت کا اظہار کیا البتہ ان کا دل ان کے خلاف بغض و عداوت کا نشیمن تھا ——— سخت ترین عداوت اور سخت ترین دشمنی ۔

اور کوئی شبہ نہیں کہ وہ کفر صریح سے بہت زیادہ خطرناک تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام مشرکوں اور یہودیوں کی شرانگیزیوں، عداوت اور مخاصمت سے بخوبی واقف تھے کیونکہ ان کی کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہ تھی اور اس واقفیت کا نتیجہ یہ تھا کہ ان سے محتاط رہتے تھے اپنی جان کے معاملے میں بھی اور اپنے دین

اس کے برعکس منافقین کا بغض ان کے نہاں خانہ قلب میں جاگزیں تھا۔ ان کے حقد وحسد کی خبر صرف وحی الہٰی کے ذریعے ہوا کرتی تھی۔

با ایں ہمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے یہ حکم ملا تھا کہ ایک خدا کی پرستش نہ کرنے والے سرکشوں اور شرارت پسندوں سے اس وقت تک مقاتلہ کریں جب تک وہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

کا اقرار نہ کر لیں اور اس اقرار کے بعد ان کی جان کو امان مل جاتی تھی۔ اور ان کا مال محفوظ ہو جاتا تھا۔ بشرطیکہ سوسائٹی کا کوئی جرم ان سے سرزد نہ ہو مثلاً چوری، قتل عمد وغیرہ

اور منافقوں کا یہ حال تھا کہ وہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

کا باقاعدہ اعلان کرتے تھے اور اس اقرار کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کی جان کو امان مل جاتی تھی اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یا مسلمانوں کو انہیں قتل کرنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ ان کا کفر وجحود بھی کم درجے کا تھا۔ کیونکہ وہ ڈھکا چھپا تھا یعنی دل میں کفر۔ اس چیز نے انہیں بہت سی سہولتیں

دے دی تھیں۔ ان کا عالم یہ تھا کہ سب کے سامنے اظہارِ اسلام کرتے اور جب آپس میں مل بیٹھتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کرام کا مذاق اڑاتے اور تہذیب و شائستگی سے گری ہوئی باتیں کرتے۔ مکر و کید کی گھاتیں سوچتے۔ مشرکین اور یہود سے ربط و دوستی قائم رکھتے۔ جب بھی موقعہ ملتا تو آپ صؐ کے اور صحابہ کے بارے میں ناسزا کلمات اور الفاظ استعمال کرتے۔

اور منافقین کی اس ذہنیت اور طرزِ عمل کا اصل سبب حسد تھا۔

آپؐ کی کامیابی اور مسلمانوں کا عروج دیکھ کر وہ حسد کی آگ میں جلے جا رہے تھے۔

ہجرت نبی ؐ سے پیشتر مدینے کے عرب آپس میں متحد اور متفق نہ تھے۔

اعرابِ مدینہ دو جماعتوں میں منقسم تھے —— اور دونوں ایک دوسرے کے دشمن جانی۔

یہ دونوں عربی قبیلے تھے ان کی اصل یمنی قحطانی تھی۔ ان کی منافقت اتنی بڑھی کہ اس نے خصومت دائمی کی صورت اختیار کر لی اور آگ کے شعلے مستقل طور پر بھڑکنے لگے

عہد جاہلیت کے تاریک دور میں اوس و خزرج میں جنگ شروع ہوئی۔ اس تسلسل کے ساتھ کہ ایک عرصۂ دراز تک سلسلۂ جنگ قائم رہا۔ اور اگر یہ مسلمان نہ ہو جاتے تو شاید لڑتے لڑتے ختم ہو جاتے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و ہدایت اور اسلام کے طفیل ان کی خصومت ختم ہو گئی اور جنگ کا سلسلہ بند ہو گیا۔ ان میں ایک قبیلے —— اور یہ قبیلہ اوس تھا —— میں ایک شخص نے اتنی شان حاصل کر لی تھی اور اتنے بلند مرتبے پر پہنچ گیا تھا کہ لوگوں نے طے کر لیا تھا کہ اس کے سر پر تاج ملوکیت رکھ دیں گے

جب اسلام آیا۔ آپؐ اور صحابہ یثرب پہنچے۔ تو اس شخص کا سارا دبدبہ ختم ہو گیا۔ اور یہ صرف یکے از اہل اوس رہ گیا۔ اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا گھروندا برباد ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں اور دوستوں نے جو خوابِ شیریں دیکھا تھا۔ وہ خواب بے تعبیر ثابت ہوا۔

پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ یہ شخص —— عبداللہ بن ابی بن سلول —— جو اس باختہ ہو گیا۔ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے خرمنِ توقعات پر بجلی گر پڑی۔ مدینے میں رسول کا آنا اس کے لیے پیامِ مرگ ثابت ہوا۔ ان کی مشیخت اور چودھراہٹ کا پوچھنے والا چند انہی جیسے لوگوں کے سوا کوئی نہ رہ گیا۔ اوس اور خزرج کا حلقۂ کفر سے نکل کر دائرہ اسلام میں آجانا اس کے لیے یوں اور زیادہ ناقابلِ برداشت اور تکلیف دہ تھا۔ کہ اس کے سر پر جو تاجِ ملوکیت رکھا جانے والا تھا۔ وہ یوں ہی رکھا کا رکھا رہ گیا۔ اب ان کی عقیدت اور محبت کا مرکز ذاتِ رسالت مآبؐ تھی۔ اور ان کی سرگرمیوں کا محور اسلام اور صرف اسلام۔

اور یہ بات بھی حیرت آفریں نہیں کہ یہ شخص اور اس کے ساتھی حسد اور بغض کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ کو دیکھ کر ان کا خون کھولنے لگتا تھا۔

اور یہ بات بھی موجبِ حیرت نہیں ہو سکتی کہ یہ شخص اپنے ساتھیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔

اسلام لانے کا سبب یہ تھا کہ یہ لوگ تابِ مقاومت سے محروم تھے۔ اپنی پوری قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ اسلام اوس اور خزرج کے ہر گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ ان کے بس میں نہ تھا کہ اس دین کو مدینے سے خارج کر دیں اور نہ ان کے بس میں یہ تھا کہ کفر پر قائم رہیں۔ اور اس کا اعلان کرتے رہیں۔ کیونکہ اس صورت میں ان کے جان و مال کی خیر نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کے دروازے اسلام کے لیے نہیں کھولے لیکن

ان میں یہ جرأت بھی نہیں تھی کہ کفر کا اعلان کریں ۔ یہ تذبذب کے عالم میں تھے نہ ادھر تھے ، نہ اُدھر ، اللہ تعالیٰ نے ان کا وصف سورۃ نساء کی آیاتِ ذیل میں بیان فرمایا ہے :۔

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ	یعنی
اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ	بلاشبہ منافق لوگ چال بازی کرتے ہیں اللہ
إِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ	ہے حالانکہ اللہ اس چال کی سزا انہیں دینے والا
قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ	ہے اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت
النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ	ہی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں ۔ صرف آدمیوں
اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ۝ مُذَبْذَبِيْنَ	کو دکھلاتے ہیں اور اللہ کا ذکر بھی نہیں کرتے مگر
بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ	بہت ہی مختصر معلق ہو رہے ہیں دونوں کے درمیان
وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ	میں نہ ادھر نہ ادھر اور جسے اللہ گمراہی میں ڈال دے
يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ	ایسے شخص کے لیے کوئی سبیل نہ پاؤ گے ۔
سَبِيْلًا ۝	

یہ منافق مسلمانوں کو ایذا دیتے تھے ۔ مگر ایک دوسرے انداز سے ۔

یہ صلح کے زمانے میں باعثِ خطر تھے ۔ آپ کو اور مسلمانوں کو اندازہ تھا کہ یہ صرف زبان سے اسلام کا اقرار کرتے ہیں اور ان کے دل کی گہرائی میں کفر کے سوا کچھ نہیں ہے ۔

علاوہ ازیں مسلمان ان کی مکروہ اور دل آزار باتیں سنتے تھے اور ایسا اکثر ہوتا تھا ۔ لیکن ان کے ساتھ بدسلوکی نہیں کر سکتے تھے ۔ کیونکہ کلمۂ توحید کے باعث ان کی جان کو بھی امان تھی اور مال بھی محفوظ تھا ——— کلمۂ توحید جو ان کی زبان پر جاری تھا ۔ لیکن جس کے لیے ان کے دل کے دروازے پر تالے پڑے ہوئے تھے ۔

اور اگر ان میں سے کوئی اپنے جذبۂ کفر و بغض سے مجبور ہو کر اپنے قول و عمل سے کوئی

ایسی بات کر گذرنا جو اس کا خون حلال کر دیتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اسے معاف کر دیتے۔ آپؐ کے پروانۂ عفو کے بعد کون تھا جو اس پر ہاتھ ڈال سکتا۔ جیسا کہ غزوۂ بنی مصطلق میں عبد اللہ بن ابی بن سلول کے ساتھ ماجرا گزرا تھا۔ اس شخص نے جو کچھ کہا وہ قرآن کے الفاظ میں یہ تھا:

لئن رجعنا الی المدینۃ	یعنی:
لیخرجن الاعز منہا الاذل	ہم مدینے پہنچ لیں تو (دیکھنا) اصحاب عزوجاہ ذلیل اور پست (مسلمانوں کو) نکال کر رہیں گے۔
	(وہاں سے)

گویا ان کا فیصلہ یہ تھا کہ مدینے پہنچ کر ہم مسلمانوں سے جنگ کریں گے اور اپنے دوستوں ——— کافروں ——— سے پوری پوری امداد و اعانت حاصل کریں گے۔

عبد اللہ بن ابی کی یہ بات آں حضرت ؐ کے سمع مبارک تک پہنچی۔ عمرؓ نے اجازت طلب کی کہ اس شخص کی گردن اڑا دی جائے کیونکہ اس نے صراحت کے ساتھ مسلمانوں سے عداوت اور جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔

لیکن آپ ؐ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ آپ اسے پسند نہیں کرتے کہ لوگ یہ چرچا کریں کہ محمد (ص) اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں ——— یہ حدیث بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے۔

منافقین کا ذکر اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں کئی جگہ کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ بقر میں ان کی شرارت نفس کا ذکر فرمایا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ	یعنی:
اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ	لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں
الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝	ہم ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر حالانکہ

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ
اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ
اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝

وہ بالکل ایمان والے نہیں (بلکہ) چال بازی
کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان
لا چکے ہیں اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چال
بازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے اور وہ اس
کا شعور نہیں رکھتے ۔ ان کے دلوں میں بڑا مرض
ہے ۔ سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے ان کے مرض کو
اور ان کے لیے سزائے دردناک ہے اس پر جیسے
کہ جھوٹ بولا کرتے تھے

پھر اسی سورۃ میں منافقین کے عناد اور کبر و غرور کا ذکر فرمایا ہے :

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا
فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ
مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ
الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا
يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ
قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ
السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ
السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

یعنی :

جب ان سے کہا جاتا ہے زمین میں فساد مت
کرو تو کہتے ہیں ہم تو مصلح ہیں یاد رکھو بے شک
یہی لوگ مفسد ہیں لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے ۔
اور جب ان سے کہا جاتا ہے تم بھی ایسا ہی
ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ ۔ تو
کہتے ہیں کیا ہم ان بیوقوفوں کی طرح ایمان لے
آئیں ؟ یاد رکھو یہی بیوقوف ہیں لیکن اس کا
علم نہیں رکھتے ۔

پھر اسی سورۃ میں منافقین کی ذلت نفوس اور اضطرار و مخادعت کا ذکر فرمایا ہے :-

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
قَالُوْا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى
شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَكُمْ
اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ٥
اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ
فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔

یعنی:
اور یہ منافق جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے
ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں
پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے
ہیں بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف استہزاء
کیا کرتے ہیں۔ اللہ ان کے ساتھ استہزاء کرتا ہے۔
اور ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے انہیں کہ اپنی سرکشی میں
حیران اور سرگرداں ہو رہے ہیں۔

پھر اسی سورۃ میں ان منافقوں کی ان اصحاب تجارت سے تشبیہ دی ہے جو گراں بہا چیزیں خرچ کر کے نکما مال خریدتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا
الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا
رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا
كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ٥

یعنی:
یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے گمراہی لے لی بجائے
ہدایت کے تو سودمند نہ ہوئی ان کی یہ تجارت
اور نہ یہ ٹھیک طریقے پر چلے۔

آگے چل کر اور زیادہ بلاغت کے ساتھ منافقین کے بارے میں فرمایا ہے:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ
نَارًا، فَلَمَّا اَضَآءَتْ مَا
حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ
وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا

یعنی:
ان کی حالت اس شخص سے مشابہ ہے جس نے
کہیں آگ جلائی ہو۔ پھر جب روشن کر دیا اس
آگ نے گرد واگرد کی سب چیزوں کو ایسی حالت

يُبْصِرُوْنَ ۝ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ
فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝

میں سلب کر لیا ہو۔ اللہ نے ان کی روشنی کو اور
چھوڑ دیا ہے انہیں اندھیرے میں کچھ دیکھتے اور
بھالتے نہ ہوں، بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں،
سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے۔

پھر خوف وامن، اور یاس وامید کے مابین منافقین کی سرگشتگی اور اضطراب کا مرقع پیش کرتے ہوئے قرآن نہایت بدیع مثال دیتا ہے:

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ
ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ج
يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ
اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ
حَذَرَ الْمَوْتِ ط وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ
بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ
يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ط كُلَّمَآ
اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ قلا وَ
اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ط
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ
بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ط
اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ ع
قَدِيْرٌ ۝

یعنی:
یا ان منافقوں کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے
بارش ہو۔ اس میں تاریکی بھی ہو اور رعد وبرق بھی
جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں وہ ٹھونسے
لیتے ہیں اپنے کانوں میں انگلیاں کڑک کے سبب
اندیشۂ مرگ سے۔ اور خدا تعالیٰ احاطے میں لیے ہوئے
ہے کافروں کو۔ برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے
ابھی اس نے بینائی لی۔ جہاں ذرا بجلی کی چمک نظر
آئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا اور جب
تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور اگر
اللہ تعالیٰ ارادہ کر لیتا تو ان کے گوش وچشم سب
سلب کر لیتا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر
ہے۔

سورۂ نساء میں اللہ تعالےٰ نے منافقین کے تذبذب، اسلام قبول کرنا، پھر کفر اختیار کر لینا۔ پھر مسلمان ہو جانا۔ پھر کافر بن جانا اور اس باب میں سرگشتہ رہنا کہ کون سا راستہ اختیار کیا جائے اور اس طرح کے دوسرے اقدام و عمل پر روشنی ڈالی ہے

یہ اور اس طرح کے دوسرے عادات بیان کرنے کے بعد اپنے نبی کو حکم دیا ہے کہ وہ منافقین کو عذاب الیم کی بشارت دے دیں۔ اور اعلان کر دیں کہ ان کا ٹھکانا جہنم کے آخری حصے میں ہوگا۔

ارشاد ہوتا ہے :-

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۝ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ط اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ	یعنی: جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ ایسوں کو ہرگز نہ بخشے گا اور نہ انہیں راستہ دکھائے گا۔ منافقین کو خوشخبری سنا دیجیے اس امر کی کہ ان کے واسطے بڑی دردناک سزا ہے۔ جن کی یہ حالت ہے کہ کافروں کو دوست بناتے ہیں۔ مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا ان کے پاس معزز رہنا چاہتے ہیں۔ سو اعزاز تو سارا خدا کے قبضے میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے پاس یہ فرمان بھیج چکا ہے کہ جب احکام الٰہیہ کے ساتھ استہزاء اور کفر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے ساتھ

. اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا
وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا
تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى
يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ
اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ اِنَّ
اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ
الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا
نِ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ
فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ
مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ
مَّعَكُمْ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ
نَصِيْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ
عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ
بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ
اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَ
اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ
قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ

مت بیٹھو۔ جب تک وہ کوئی دوسری
بات نہ شروع کر دیں کہ اس
حالت میں تم بھی ان ہی جیسے ہو
جاؤ گے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کافروں
اور منافقوں کو دوزخ میں جمع
کر دے گا۔ وہ ایسے ہیں کہ تم پر
افتاد پڑنے کے منتظر رہتے ہیں۔
پھر اگر تمہاری فتح من جانب
اللہ ہوگئی تو باتیں بناتے ہیں۔ کہ
کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے ؟
اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل گیا
تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تم پر
غالب نہ آنے لگے تھے ؟ اور کیا ہم
نے تم کو مسلمانوں سے بچا نہیں لیا؟
سو اللہ تعالیٰ تمہارا اور ان کا قیامت
میں عملی فیصلہ فرما دے گا اور ہرگز
اللہ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلے
میں غالب نہیں کرے گا۔ بلا شبہ
منافق چال بازی کرتے ہیں اللہ سے
حالانکہ اللہ اس چال کی سزا انہیں
دینے والا ہے۔ اور جب نماز کو کھڑے

النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ
اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ہ مُذَبْذَبِيْنَ
بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ
وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ط وَمَنْ
يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ
سَبِيْلًا ہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ
اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ
اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا
لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ہ
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ
الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج وَلَنْ
تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ہ اِلَّا
الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا
وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا
دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ط وَسَوْفَ
يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ
اَجْرًا عَظِيْمًا ہ مَا يَفْعَلُ
اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ
وَاٰمَنْتُمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ

ہوتے ہیں۔ صرف آدمیوں کو دکھلاتے
ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی نہیں کرتے
مگر بہت ہی مختصر۔ معلق ہو رہے ہیں
دونوں کے درمیان میں نہ ادھر نہ ادھر
اور جسے خدا گمراہی میں ڈال دے۔
ایسے شخص کے لیے کوئی سبیل نہ
پاؤ گے۔ اے ایمان والو تم مومنین
کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت
بناؤ کیا تم یوں چاہتے ہو کہ اپنے
اوپر اللہ تعالیٰ کی حجت صریح قائم
کرو؟ بلاشبہ منافقین دوزخ کے
سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے
اور تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ
پائے گا۔ لیکن جو لوگ توبہ کر لیں اور
اصلاح کر لیں اور اللہ پر اعتبار
رکھیں اور اپنے دین کو صرف اللہ
کے لیے کر لیں تو یہ لوگ مومنین
کے ساتھ ہوں گے اور مومنین کو
اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے گا اور
اے منافقو! خدا تمہیں سزا دے کر
کیا کرے گا؟ اگر تم سپاس گذاری کرو

شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝ اور ایمان لے آؤ اور اللہ بڑا قدر کرنے والا جاننے والا ہے۔

آیاتِ بالا میں منافقین کا جو مرقع نظر کے سامنے آیا ہے اس سے ان کی ذہنیت اور اطوار کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے اور انہیں عذابِ الیم کی بشارت دی جاتی ہے اور اس کے بعد امید و آرزو سے انہیں نوازا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ توبہ کریں، اصلاح کرلیں۔ اللہ پر بھروسہ کریں، دین کے لیے مخلص ہو جائیں تو پھر وہ اور مسلمان ایک ہیں اور مسلمانوں کے لیے اجرِ عظیم ہے۔ یعنی اس اجرِ عظیم میں ان کا حصہ بھی ہوگا۔

صلح اور امن کے زمانے میں منافق ایک خطرہ تھے ہی۔ لیکن جنگ کے زمانے میں تو وہ سر پر لٹکتی ہوئی تلوار بن جاتے تھے۔ ایسے مواقع پر وہ، کمزوری، برائی اور فتورِ ہمت کا پیکر بن جاتے تھے۔

وہ اپنے مسلمان رشتے داروں، پڑوسیوں اور دوستوں میں خوف اور بزدلی پھیلانے کی کوشش کرتے تھے۔

اور عین اس وقت جب ایک فوج دشمن سے برسرِ پیکار ہو اس میں دوں ہمتی، بےحوصلگی اور بزدلی پیدا کرنے کی سعی و کوشش سے بڑا خطرہ بھی کوئی ہو سکتا ہے؟

چنانچہ جنگ احزاب کے موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ساتھ میدان میں پہنچے۔ سامنے ایک لشکر گراں دشمن کا دیکھا تو گھبرا گئے اور کہہ اٹھے:

مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ   یعنی:

اِلَّا غُرُوْرًا ۝   اللہ نے اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ

کیا تھا وہ محض فریب تھا۔

اس طرح انہوں نے مسلمانوں میں شک پیدا کرنے اور ان کی ہمت توڑنے کی کوشش کی۔

اسی طرح ان میں سے بعض لوگوں نے کہا:

"اے اہلِ یثرب یہاں تمہاری جگہ نہیں، واپس چلو"

اس طرح انہوں نے مسلمانوں کو فرار پر آمادہ کرنا چاہا۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ آپ ؐ کو اور مہاجرین کو دشمن سے لڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔

اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ آپؐ کے پاس آئے اور اذنِ رخصت طلب کرنے لگے۔ کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ لیکن یہ محض عذر لنگ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا۔

وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِن يُرِيدُونَ	یعنی:
إِلَّا فِرَارًا ۝	ان کے گھر غیر محفوظ نہیں ہیں یہ تو فرار کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔

منافقین کے کید و مکر اور جُبن و بزدلی کے علاوہ ایک اور صفت کی طرف بھی قرآن نے سورۂ احزاب میں اشارہ کیا ہے:

أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَإِذَا جَاءَ	یعنی:
الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنظُرُونَ	تمہارے حق میں بخیلی لیے ہوئے سو جب
إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ	خوف پیش آتا ہے تو ان کو دیکھتے ہو کہ وہ آپؐ
كَالَّذِي يُغْشَىٰ عَلَيْهِ	کی طرف اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی
مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَإِذَا ذَهَبَ	آنکھیں چکرائی جاتی ہیں۔ جیسے کسی پر موت کی
الْخَوْفُ سَلَقُوكُم بِأَلْسِنَةٍ	بیہوشی طاری ہو۔ پھر جب وہ خوف دور

حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ط اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ط وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝

ہوجاتا ہے تو تم کو تیز تیز زبانوں سے طعنے دیتے ہیں۔ مال لیے ہوئے ۔ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام اعمال بے کار کر رکھے ہیں ۔ اور یہ بات اس کے لیے بالکل آسان ہے ۔

غزوہ تبوک کے موقعہ پر منافقین کی کجی قلب وعمل اور زیادہ تلخ صورت میں نمودار ہوئی ۔

غزوہ تبوک جہاں مسلمانوں کے لیے مایہ ابتلاء و آزمائش اور صعوبت وسفر ثابت ہوا ۔ وہاں جملہ منافقین کے لیے بھی باعث محن ثابت ہوا

یہ بہار کا موسم تھا ۔ پھل پک رہے تھے اور چنے جا رہے تھے یہ تنگی اور پریشانی کا وقت تھا ۔ سرمایہ ناپید اور ضروریات شدید ۔ اور تبوک جیسے دور دراز مقام پر جنگ ، آپ ؐ نے فرمان صادر کر دیا تھا ۔ اس کے عواقب نظروں سے اوجھل تھے ۔

اس جنگ کو کامیابی کے مرحلے تک پہنچانے کے لیے ساز و سامان کی ضرورت تھی ۔ روپے کی صورت میں بھی اور اسلحہ کی صورت میں بھی مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ اس مقصد کے لیے وہ جان و مال کا ایثار کریں اور مقاصد جنگ کے لیے جتنی مالی قربانی کر سکتے ہوں کر گزریں جو لوگ سچے اور مخلص تھے انہوں نے اس دعوت پر لبیک کہا ۔ عثمان رض نے اس جنگ میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ سچے مسلمانوں نے اس جنگ کو کامیاب بنانے کے لیے جو کچھ امکان میں تھا اس سے دریغ نہیں کیا ۔ جن جنگ آزماؤں کو تہی دستی نے بے بال و پر بنا رکھا تھا ان کی امداد و اعانت کی ۔ آپ ؐ کی خدمت میں ایک جماعت حاضر ہوئی جو جذبہ شہادت سے سرشار تھی ۔ ان میں کا ہر فرد میدان جنگ کی طرف جانے کے لیے

بیغزار تھا۔ لیکن زادِ راہ اور ساز وسامان جنگ سے تہی دامن تھا۔ اس گروہ نے آپؐ سے استدعا کی کہ سرو سامان بہم پہنچایا جائے تاکہ دل کی حسرت نکل سکے لیکن آپؐ کے پاس تھا کیا، جو عطا فرماتے۔ معذرت کردی اور یہ لوگ بادیدۂ گریاں اور باقلب بریاں واپس گئے۔ جیسا کہ سورۃ توبہ میں اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ
اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى
الْاَرْضِ ط اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ج فَمَا
مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي
الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ اِلَّا
تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا
غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ ع
قَدِيْرٌ ۝ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ
نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ
اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ
اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا
تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ج

یعنی:

اے ایمان والو! تم لوگوں کو کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جہاد) کے لیے نکلو تو تم زمین سے لگے جاتے ہو۔ کیا تم نے آخرت کے عوض دنیوی زندگی پر قناعت کرلی؟ سو دنیوی زندگی کا تمتع تو آخرت کے مقابلے میں (کچھ بھی نہیں) بہت قلیل ہے اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تعالےٰ انہیں سخت سزا دے گا۔ اور تمہارے بدلے دوسری قوم پیدا کر دے گا اور تم اللہ کے دین کو ضرر نہ پہنچا سکو گے۔ اور اللہ تعالےٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔ اگر تم رسولؐ کی مدد نہ کرو گے۔ تو اللہ آپؐ کی مدد اس وقت کرچکا ہے جب آپ کو کافروں نے جلاوطن کردیا تھا۔ جب دو میں سے ایک آپ تھے جس وقت کہ دونوں غار میں تھے۔ جب آپ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے کہ تم (کچھ) غم نہ کرو یقیناً اللہ

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ	ہمارے ساتھ ہے سو اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ
عَلَيْهِ وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ	(کے قلب) پر اپنی تسلی نازل فرمائی اور آپ
تَرَوْهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ	کو ایسے لشکروں سے قوت دی جنہیں تم لوگوں
الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ط	نے نہیں دیکھا اور اللہ نے کافروں کی بات
وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ط	(اور تدبیر) نیچی کردی اور اللہ ہی کا بول بالا
وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ اِنْفِرُوْا	ہے۔ اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔
خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا	نکل پڑو (خواہ) تھوڑے سامان سے (خواہ
بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ	زیادہ سامان سے اور اللہ کی راہ میں اپنے
سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ	مال اور جان سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝	بہتر ہے۔ اگر تم یقین رکھتے ہو (تو دیر مت کرو)

تو جب صورت حالات یہ تھی کہ یہ جہاد خود مسلمانوں کے لیے حد درجہ روح فرسا اور گراں تھا تو منافقوں کا جو حال نہ ہوتا کم تھا۔ یہ منافقین رضائے الٰہی کے لیے تو جہاد کرتے نہیں تھے اس لیے کہ ان کے دل ایمان نہیں لائے تھے۔ نہ عشق نبی ؐ سے سرشار ہو کر سربکف میدان میں آتے تھے۔ اس لیے کہ انہیں نبیؐ سے ذرا بھی محبت نہیں تھی۔ نہ یہ دین میں مخلص تھے۔ کیونکہ انہوں نے عمق قلب سے دین کو قبول ہی نہیں کیا تھا۔ ان کی شرکت جہاد کا مقصد صرف مال غنیمت تھا یا صرف عدم شرکت کے تلخ اور ناگوار نتائج سے بچنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی سورۃ میں فرمایا ہے:۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّ	یعنی:
سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ	اگر کچھ لگتے ہاتھ ملنے والا ہوتا اور سفر بھی معمولی
وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ	سا ہوتا تو یہ (منافق) لوگ ضرور آپ ؐ کے

الشُّقَّةُ ؕ وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ؏	ساتھ ہو لیتے لیکن انہیں تو مسافت ہی دور و دراز معلوم ہونے لگی اور ابھی خدا کی قسم کھا جائیں گے کہ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم ضرور آپ کے ساتھ چلتے۔ یہ لوگ (جھوٹ بول بول کر) اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں۔

یہ منافقین سفر جہاد پر نکلتے ہوئے یہ کہتے تھے اور عذر لنگ پیش کرتے تھے۔ مگر اللہ نے اپنے نبی ؐ کو خبر دے دی کہ یہ جھوٹے ہیں۔ اگر سچے ہوتے تو نہ جانے کی اجازت دینے میں قباحت نہ تھی۔ آپؐ نے انہیں ساتھ نہ چلنے کی اجازت دے دی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات معاف کر دی۔ مگر عتاب کے رنگ میں سوال کیا:

لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ؏	یعنی: آپؐ نے ان (منافقوں) کو اس قدر جلد اجازت کیوں دے دی تھی؟ جب تک کہ آپ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہو جاتے تو جھوٹوں کو معلوم نہ کر لیتے

لیکن با ایں ہمہ اللہ تعالیٰ جہاد کے لیے ان کے خروج کو پسند نہیں فرماتا۔ بلکہ ان کا تخلف ہی گوارا تھا۔ کیونکہ اس کے علم میں وہ بات تھی جس سے مسلمان ناآشنا تھے۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا اگر یہ منافقین مسلمانوں کے ساتھ نکلیں گے تو یہ شر انگیزیاں کریں گے، کید و خیانت کا مظاہرہ کریں گے۔ فتنے برپا کریں گے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مومنوں کو ان کے رازِ درونِ پردہ

سے آشنا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ اسی سورۃ میں فرماتا ہے:۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝

یعنی:

اور اگر وہ (منافقین) غزوے میں چلنے کا ارادہ کرتے تو اس کی کچھ تیاری تو کرتے۔ اس لیے ان کو توفیق نہیں دی اور (بحکم تکوینی) یوں کہہ دیا گیا کہ اپاہج لوگوں کے ساتھ تم بھی یہاں دھرے رہو۔ اگر یہ (منافقین) تمہارے ساتھ شامل ہو جاتے تو سوا اس کے کہ اور دونا فساد کرتے اور کیا ہوتا؟ اور تمہارے درمیان فتنہ پردازی کی فکر میں دوڑے دوڑے پھرتے اور (اب بھی) تم میں ان کے کچھ جاسوس موجود ہیں۔ اور ان ظالموں سے خدا خوب سمجھے گا۔ انہوں نے پہلے بھی فتنہ پردازی کی تھی (یعنی جنگِ احد وغیرہ میں) اور آپؐ کے لیے کارروائیوں کی الٹ پھیر کرتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ سچا وعدہ آگیا۔ (اور اس کا آنا یہ ہے کہ) اللہ کا حکم غالب رہا اور ان کو ناگوار ہی گزرتا رہا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو یہ بھی بتا دیا کہ یہ منافقین جب صدق نہیں پاتے تو آپؐ کی تقسیم پر طعن و لعن کرتے ہیں چنانچہ اسی سورۃ میں ارشاد ہوا

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝

یعنی : اور ان (منافقین میں) بعض وہ لوگ ہیں جو صدقات (تقسیم کرنے کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں۔ سو اگر ان کو مل جائے تو راضی ہو جاتے ہیں اور اگر ان صدقات میں سے نہیں ملتا تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے لیے بہتر ہوتا اگر اس پر راضی رہتے جو کچھ انہیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے اور یوں کہتے ہم کو اللہ کافی ہے آئندہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم کو اور دے گا اور اس کا رسول دیگا ہم (دل سے) اللہ ہی کی طرف راغب ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم صدقات انہی مواضع میں خرچ کرتے تھے جو اللہ نے متعین کر دیئے ہیں جو مومن صادق تھے وہ اس تقسیم پر راضی تھے اور اسے عین برحق سمجھتے تھے لیکن منافقین کے دل میں روگ تھا۔ وہ مال صدقات و زکوٰۃ میں سب سے بڑھ چڑھ کر اپنا حق سمجھتے تھے اور جب نہیں پاتے تھے تو طنز و توہین پر اتر آتے تھے۔ اسی طرح یہ ان لوگوں پر بھی طعن کیا کرتے تھے۔ جو اپنے ذاتی مال میں سے کار خیر پر خرچ کرتے تھے اور اسے ریائی قرار دیتے تھے اور کہتے تھے۔ اللہ ان کے صدقات سے بے نیاز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ ساری باتیں تصریح کے ساتھ بیان فرمائی ہیں۔ اور ان کی ایک اور عادت بد کا بھی ذکر کیا ہے وہ یہ کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دیا کرتے تھے۔ اور ڈرایا ہے کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دیتے ہیں ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔ چنانچہ اسی سورۃ میں فرمایا :-

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ
النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ
قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ
يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ
لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ
يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

یعنی:
اور ان (منافقین میں) بعض ایسے ہیں کہ نبیؐ
کو ایذائیں پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپؐ ہر
بات کان دھر کر سُن لیتے ہیں آپ کہہ دیں کہ
نبی کان دھر کر وہی بات سنتا ہے جو تمہارے
حق میں خیر ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں
اور مومنین پر یقین کرتے ہیں اور آپ ان لوگوں
کے حال پر مہربانی فرماتے ہیں جو تم میں ایمان کا
اظہار کرتے ہیں اور جو لوگ رسولؐ کو ایذائیں
پہنچاتے ہیں ان لوگوں کے لیے دردناک سزا ہے

اور منافقین کے سوءِ اعمال اور ذلتِ نفس کے مختلف پہلو ضروری تفصیل سے بیان کر چکنے کے بعد اللہ تبارک وتعالےٰ نے ان پر اپنے غضبِ عظیم کا اظہار فرمایا ہے:۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ
مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ
وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى
الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

یعنی:
آپؐ ان (منافقین) کے لیے استغفار کریں یا
نہ کریں۔ یا ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار
کریں۔ خدا ہرگز ان کی مغفرت نہیں کریگا اس لیے
کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کا
انکار کیا۔ اور خدا فاسق لوگوں کو راہ یاب
نہیں کرتا۔

محدثین کا ـــــــ اور ان میں بخاری و مسلم بھی شامل ہیں ـــــــ قول ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول جب مرا تو اس کا بیٹا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا[1]۔ باپ کی خبر مرگ سنائی اور نماز جنازہ پڑھانے کی استدعا کی آپؐ نے اس کی یہ استدعا قبول فرمائی۔ اس موقع پر عمرؓ موجود تھے۔ انہوں نے آپؐ کو یہ آیت یاد دلائی اور اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ آپؐ نے فرمایا، میرے رب نے مجھے اس بات میں اختیار دیا ہے۔ پھر آپؐ نے نماز جنازہ پڑھادی۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے نہی وارد ہوئی کہ نہ آپ منافقین کی نماز جنازہ پڑھا سکتے ہیں۔ نہ ان کی قبروں پر برائے دفن کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ارشاد ہوا:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ	یعنی:
مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰی	ان (منافقین) میں سے جب کوئی مر جائے
قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا	تو آپؐ ہرگز اس کی نماز (جنازہ) نہ پڑھایئے
بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا	نہ اس کی قبر پر (بغرض دفن) قیام کریں۔ ان
وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۰﴾	لوگوں نے اللہ کا اور اس کے رسول کا انکار
	کیا اور اس حالت میں مرے کہ فاسق تھے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بھی منع فرمادیا کہ مدینے واپس آنے کے بعد ان کا کوئی عذر قبول فرمائیں۔ کیونکہ ان کی سرشت واضح ہو چکی ہے۔ سورۂ توبہ میں فرمایا:

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا	یعنی:
رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ	یہ (منافقین) تمہارے سامنے عذر پیش کریں
لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ	گے جب تم ان کے پاس (مدینے) واپس جاؤگے

---

[1] یہ ایک جلیل القدر صحابی تھے جن کے اخلاص کی آں حضرتؐ قدر فرماتے تھے۔ (رئیس احمد جعفری)

لَكُمْ قَدْ نَبَّأَنَا اللّٰهُ
مِنْ أَخْبَارِكُمْ ۚ وَسَيَرَى
اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ
تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ
وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا
كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

(سو اے محمد) آپ صاف کہدیں کہ یہ عذرمت پیش کرو۔ ہم کبھی تم کو سچا نہ سمجھیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو تمہاری خبر دے چکا ہے اور آئندہ بھی اللہ اور اس کا رسولؐ تمہاری کارگذاری دیکھ لیں گے پھر ایسے کے پاس لوٹائے جاؤگے جو پوشیدہ اور ظاہر جاننے والا ہے۔ پھر وہ تم کو بتلادے گا۔ جو کچھ تم کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس سے بھی منع فرما دیا کہ آپ منافقین کو ساتھ لے کر چلیں یا انہیں دشمن سے قتال و جدال میں شریک کریں۔ فرمایا

فَإِن رَّجَعَكَ اللّٰهُ إِلَىٰ طَائِفَةٍ
مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ
لِلْخُرُوجِ فَقُل لَّن تَخْرُجُوا
مَعِيَ أَبَدًا وَلَن تُقَاتِلُوا
مَعِيَ عَدُوًّا ۖ إِنَّكُمْ رَضِيتُم
بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا
مَعَ الْخَالِفِينَ ۝

یعنی: اگر خدا آپ کو (اس سفر سے مدینے کو صحیح و سالم) ان کے کسی گروہ کی طرف واپس لائے۔ پھر یہ لوگ کسی جہاد میں چلنے کی اجازت مانگیں تو آپ یوں کہہ دیں کہ تم میرے ساتھ کبھی بھی نہیں چلو گے نہ میرے ہمراہ آکر کسی دشمن (دین) سے لڑو گے تم نے پہلے بھی بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا تو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہو جو (واقعی) پیچھے رہ جانے کے لائق ہی ہیں۔

غرض یہ تھی مدینے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، کیا یہ یکسر جہاد نہ تھی؟

آپؐ کی جنگ بھی کتنی ہمہ پہلو تھی۔ آپؐ نے مشرکین قریش اور مشرکین عرب سے جہاد کیا آپؐ نے مدینے کے اندر اور مدینے سے باہر یہود سے جہاد کیا۔ پھر منافقین سے جہاد کیا جو اپنے آپ کو دوست اور وفادار ظاہر کرتے تھے۔ مگر حقیقتہً مشرکین اور یہود کے دوست اور وفادار تھے۔ اور منافقین کے ساتھ آپؐ کا یہ جہاد صرف صبر پر مبنی تھا۔

منافقین سے معرکہ آرائی کی اس "طویل مختصر" گفتگو کے بعد ہم پھر مشرکین کے ساتھ آپؐ کے جہاد کو زیر بحث لاتے ہیں۔

(۱۸)

قریش کی عہد شکنی ۞ فتح مکّہ ۞ ابوسفیان کو امان

○

ہوازن کے قبیلے سے جنگ، حلیمہ دائی کا رشتہ، عفو عام،

◎

وفات کی پیش گوئی، علامت وفات، مسلمانوں کا اضطراب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے مابین جو معاہدۂ صلح یوم حدیبیہ پر ہوا تھا۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو جہاد سے فرصت نہیں دی۔ نہ انہیں کامل طور پر اطمینان و عافیت کی دولت میسر آئی۔ بلاشبہ اس معاہدے کی رو سے مسلمان قریش کی ایذا رسانی سے بچ گئے تھے۔ اور قریش کو بھی مسلمانوں سے کوئی خطرہ نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن قریش نے دیانت داری سے اس معاہدے پر عمل نہیں کیا۔ وہ قبائل عرب کو برابر بھڑکاتے اور اکساتے رہے۔

امر واقعہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے یعنی مشرکین عرب کے مابین جہاد کا سلسلہ تسلسل اور شدت کے ساتھ جاری رہا۔ آں حضرتؐ کی کوشش یہ تھی کہ اسلام زیادہ سے زیادہ پھیلے اور مشرکوں کی یہ خواہش تھی کہ اسلام کو پھیلنے پھولنے کے ذرا بھی مواقع میسر نہ آئیں۔ اور

اس سلسلے میں جو کچھ بھی ان کے بس میں تھا اس سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ مدینے پر تاخت و تاراج کا سلسلہ بھی جاری تھا اور غارت گری کی تیاریاں بھی کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے لیے ناگزیر تھا کہ جب ان پر غارت گری ہو تو اسے روکیں۔ اور جب تاخت و تاراج کی تیاریاں ہوں تو ان میں رکاوٹ پیدا کریں۔

اہل بادیہ مکر و غدر کے پیکر تھے۔ وہ زر و مال کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ قریش کی فریب کاریاں انہیں اور زیادہ اس راستے پر رہروی کے لیے مجبور کر رہی تھیں۔

ان لوگوں کی چالیں بھی عجیب تھیں

کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتا اور اسلام قبول کر لیتا۔ اور کہتا میری قوم پیچھے رہ گئی ہے۔ اس نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے۔ اسے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو اسے قرآن پڑھائیں، دین سکھائیں اور مسئلے مسائل بتائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس استدعا کو قبول فرما لیتے اور چند صحابہ کو ساتھ کر دیتے۔ مدینے سے باہر نکلتے ہی ان کا مکر و غدر ظاہر ہو جاتا اور ان صحابہ پر جو آپ نے ساتھ کئے تھے یہ حملہ آور ہو جاتے۔ بعض کو قتل کر دیتے۔ بعض کو گرفتار کر کے قیدی بنا لیتے۔ اس طرح وہ قریش کا تقرب حاصل کرتے۔ اور ان قیدیوں کو ان کے حوالے کر کے رقومات حاصل کرتے جیسا کہ یوم رجیع کے موقع پر لحیان کا واقعہ ہوا تھا۔ کہ آپ نے ان کی استدعا پر چند اخیار صحابہ ساتھ کر دیے اور انہوں نے مدینے سے باہر جا کر ان میں سے بعض کو قتل کر دیا۔ بقیہ کو گرفتار کر کے قریش کے حوالے کر دیا جنہیں انہوں نے قتل کر دیا۔

اس طرح کے واقعات ایک آدھ مرتبہ نہیں بلکہ کئی بار ہوئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اور صحابہ کرام کی زندگی اس طرح تمام تر جہاد و اضطرار کی نذر ہو رہی تھی۔ مجبور ہو کر کبھی آپ ان شرارت پسندوں کی سرکوبی کے لیے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں (سرایا) بھیجتے۔ کبھی بہ نفس نفیس ان اغراض کے ماتحت باہر نکلتے جن کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے

ان تمام باتوں سے بالا اور ماوراء یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھیے کہ قریش نے جو معاہدہ کیا تھا۔ ان خفیہ علانیہ سازشوں اور شرارتوں کے بعد بھی اس پر قائم نہیں رہے تھے۔ بہت جلد انھوں نے اس معاھدے کو توڑ ڈالا، اور خزاعہ پر جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے حملہ کر دیا اس کا لازمی نتیجہ آپ کے اور قریش کے مابین جنگ کی صورت میں نکل سکتا تھا۔

قریش نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حلفاء پر قریش کی اس دراز دستی سے برہم ہیں اور خیال فرماتے ہیں کہ اس حادثے کے بعد معاہدے کا وجود باقی نہیں رہا۔ چنانچہ انھوں نے ابوسفیان کو مدینے بھیجا کہ وہ ٹوہ لے اور کوشش کرے کہ معاہدہ قائم رہے۔ لیکن ابوسفیان ناکام و خاسر مدینے سے مکے واپس آ گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ہجرت کے آٹھویں سال وہ مکے کی طرف ایک جیش گراں لے کر بڑھے۔ قوت و کثرت تعداد کے اعتبار سے مسلمانوں کا کوئی لشکر اس سے پہلے اس شان کا مرتب نہیں ہوا تھا۔

مکہ جب قریب رہ گیا تو ابوسفیان ٹوہ لینے کے لیے آیا اور مسلمانوں کا یہ دبدبہ دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ وہ عباس بن عبد المطلب کو لے کر آں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ راستے بھر عباس اسے قبولِ اسلام کی ترغیب دیتے رہے یہاں تک کہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو گئے۔ ابوسفیان نے آپ کے سامنے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کا اقرار کر لیا۔ مگر اس باب میں تردد کا اظہار کیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن آخر الامر اس کی شہادت بھی دے دی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جان بخشی کی اور تمام لوگوں کی جان بخشی کی جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ گزین ہو جائیں یا مسجد حرام میں داخل ہو جائیں یا جو اپنے گھر میں بیٹھ کر دروازہ بند کر لیں۔

ابوسفیان یہ اماں نامہ لے کر مکے واپس آیا۔

اب اہل مکہ کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا کہ اسے قبول کریں۔ چنانچہ کچھ لوگ

ابوسفیان کے گھر میں پناہ گزین ہوگئے ، ایک گروہ مسجد حرام میں داخل ہوگیا۔ ایک جماعت ایسی تھی جو اس عرصے میں دروازہ بند کر کے خانہ نشین ہوگئی۔

آں حضرت کا کوکبۂ جلال مکے میں داخل ہوا۔

آپ نے ممانعت فرما دی کہ مقاتلہ بند کر دیا جائے۔ بجز ان لوگوں کے جو خود جنگ پر آمادہ ہوں۔ اس حکم کی تعمیل خالد بن ولید —— رحمہ اللہ —— کے سوا سب نے کی۔ خالد ذرا درشت مزاج تھے۔ جو ان کے سامنے آیا تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ آپ کو جب یہ خبر پہنچی تو خالد کے فعل سے آپ نے براءت کا اظہار کیا۔ اور اپنے بعض صحابہ کو قتل و خون رکوانے کے لیے بھیجا

اس کے بعد آپؐ اور مسلمان مکے میں داخل ہوگئے۔

آپؐ مسجد حرام میں تشریف لائے اور وہاں جو بت تھے انہیں گراتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے :

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ‏ یعنی :

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ‏ حق آیا ، اور باطل روپوش ہوگیا۔

پھر آپؐ نے بلال کو حکم دیا انہوں نے سقفِ مکہ پر کھڑے ہو کر اذان دی۔

اس موقعہ پر قریش آ آ کر جمع ہونے لگے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا :

"اے گروہ قریش ! تمہارا کیا خیال ہے۔ آج میں تم سے کیا سلوک کروں گا"

قریش نے جواب میں عرض کیا :

" آپؐ شریف بھائی اور شریف بھائی کے لڑکے ہیں" !

آپؐ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا :

" میں تم سے وہی کہوں گا جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا :

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ‏ یعنی

اذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ ‏ جاؤ تم آزاد ہو !

• قریش نے اس اعلان کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ ان اسلام قبول کرنے والوں میں وہ بھی تھے جنہوں نے رضا و رغبت سے اسلام قبول کیا تھا۔ اور وہ بھی تھے جن کے لیے قبول اسلام کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا

مکہ فتح ہو گیا۔

اسلام مکے میں داخل ہو گیا! ——— مظفر، منصور، غالب، فاتح!

قریش نے اسلام کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیا۔ خواہ بہ رضا و رغبت یا بہ جبر و اکراہ،

لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ م کے صحابہ نے اپنے اس بچھڑے ہوئے وطن کو پھر سے وطن نہیں بنایا۔ انہوں نے وطنیت کے لیے اسی سرزمین کو ترجیح دی جہاں وہ ہجرت کر کے گئے تھے۔ وہ مدینے سے اگر مکے کے سفر پر نکلتے تھے تو مسافر کی طرح، اس نیت کے ساتھ کہ بہت جلد پھر اس دیار ہجرت میں واپس آ جائیں گے۔

رواۃ کا بیان ہے کہ سعد بن ابی وقاص مکے میں بیمار پڑے اور حالت اتنی نازک ہو گئی کہ وصیت پر مجبور ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا۔ انہوں نے ان کے لیے دعا کی۔ سعد کو دھڑکا یہ لگا تھا کہ مدینے کے بجائے کہیں موت مکے میں نہ آ جائے۔

اصحاب نبیؐ میں سے جن لوگوں نے ہجرت کی تھی، ان سب کا یہی حال تھا۔ وہ مکے میں آتے تھے، مگر مقیم بن کر نہیں، مسافر کی طرح، اگرچہ ان کا قیام اپنے اہل خاندان کے مابین رہتا تھا۔ مگر وہ نمازیں قصر کرتے تھے۔ اور اس پر اتنی سختی سے عامل تھے کہ جب عثمان رضی اللہ عنہ نے بہ مقام منیٰ اپنے عہد خلافت میں حج کے موقعے پر قصر کے بجائے پوری نماز ادا کی تو سخت اعتراض کیا۔ اس لیے کہ وہ انہیں مسافر سمجھتے تھے۔ جس پر قصر واجب ہے۔ کیونکہ گو ان کے اہل و عیال مکے میں تھے۔ لیکن ان کا دار اقامت مدینے میں تھا۔ نہ کہ کوئی اور شہر۔

فتح مکہ کے بعد ابھی آپ صلعم مدینے تشریف نہیں لے گئے تھے کہ اطلاع ملی کہ "ہوازن" قبیلے کے لوگ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ یہ سن کر آپ صلعم وہ لشکر لے کر جو آپؐ کے ساتھ مدینے سے آیا تھا اور مکے کے اصحاب قریش کو لے کر اور ان لوگوں کو لے کر جو فتح کے بعد اسلام لائے تھے۔ ہوازن سے مقابلے کے لیے بڑھے۔

"حنین" کے مقام پر جنگ برپا ہوئی۔

یہ جنگ مسلمانوں کے لیے حد درجہ ابتلاء و آزمائش اور امتحان ثابت ہوئی۔ نو مسلموں نے ثبات قدم کا مظاہرہ نہ کیا۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے مسلمان بھی راہ فرار اختیار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک ایسا موقعہ آیا کہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خچر پر تنہا رہ گئے جس کی لگام عباسؓ تھامے ہوئے تھے۔ آپ صلعم اپنے اصحاب کو دوبارہ شریک جنگ ہونے کی دعوت دے رہے تھے اور فرما رہے تھے:

اَنَا النَّبِی لَاکَذِب اَنَا ابن عَبد المُطَلِبْ۔

آپ کی یہ صدا سُن کر انصار میدان جہاد میں جان دینے کے لیے تیزی سے پلٹ پڑے اور ان کے بعد دوسرے مسلمان بھی۔

آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فتح مبین مرحمت فرمائی اور مشرکین کو ہزیمت منکرہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے بہت سے آدمی قتل ہو گئے۔ بہت سے گرفتار ہوئے اور قیدی بنا لیے گئے۔ ان قیدیوں میں وہ بھی تھے۔ عورتیں بھی اور بچے بھی۔

لیکن شکست فاش اٹھانے کے بعد ہوازن آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض گزار ہوئے کہ ان کے قیدیوں کو از راہِ احسان و کرم رہائی بخشی جائے کیونکہ وہ آپؐ کے رشتے دار ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ حلیمہ جنہوں نے آپ کو دودھ پلایا تھا اسی قبیلے کی تھیں۔

آپؐ نے ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جو بنو عبدالمطلب کے پاس تھے۔ دوسروں کے لیے فرمایا کہ جب کل نماز پڑھانے آپ تشریف لائیں تو یہ سوال اٹھایا جائے اور اپنا رشتہ آپ صلعم

سے بیان کیا جائے۔

چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ آپ ؐ نے مسلمانوں سے سفارش کی کہ ہوازن کے قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ اس سفارش کو مسلمانوں نے بہ سروچشم قبول کر لیا اور ہوازن کے جتنے قیدی تھے، آن کی آن میں رہا کر دیے گئے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری جنگ طائف کی تھی، جب آپؐ نے اپنے لشکر کے ساتھ طائف کا محاصرہ کر لیا۔

لیکن بہت جلد یہ محاصرہ اٹھا کر آپؐ مدینے واپس آگئے۔ ثقیف نے وفد بھیج کر صلح کی درخواست کی۔ آپؐ نے یہ استدعا قبول فرمائی، بایں شرط کہ یہ لوگ اسلام قبول کر لیں، شرک کو یکسر ترک کر دیں اور شرک کے جملہ آثار و علائم مٹا دیں۔

اس وقت سے اسلام تیزی کے ساتھ جزیرہ عرب میں پھیلنا شروع ہو گیا۔ اہل عرب کے وفد پر وفد آنے لگے، جو اپنی اور اپنی قوم کی خبر قبولِ اسلام لے کر آتے تھے، آپ ان کے اس اعلان اسلام کو قبول فرما لیتے تھے۔ انہیں امورِ دین سکھاتے تھے اور اکثر ایسا ہوتا کہ ان کے ساتھ کچھ صحابہ کو کر دیتے جو وہاں جا کر انہیں شرائعِ اسلام کی تعلیم دیتے۔

اس طرح بہت جلد سارے جزیرہ عرب میں اسلام پھیل گیا۔

اسلام کا آغاز کن مصائب کے ساتھ ہوا تھا اور انتہا کن کامیابیوں اور کامرانیوں کی حامل تھی مکے کی زندگی یکسر امتحان و ابتلا تھی۔ اور اب مدینے کی زندگی تمام تر عروج و فروغ سے عبارت تھی۔

اس مختصر ترین مدت میں یہ انقلابِ عظیم، اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی فوق الانسان قوت اسلام کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ جس نے پورے عرب کو مجتمع کر دیا۔ عربوں کو ایک قوم بنا دیا۔ ان میں

اُتلاف اور تعاون کا جذبہ پیدا کر دیا جو مبنی تھا نیکی اور تقویٰ پر نہ کہ اثم و عدوان پر۔ حالانکہ قبول اسلام سے پہلے یہ ایک دوسرے کے بدترین دشمن رہ چکے تھے۔ ان کی خصومت ایک مستقل تاریخ رکھتی ہے ان کی حرب و پیکار کا سلسلہ نطق و کلام سے دائمی طور پر، اور سیف و سنان سے اکثر و بیشتر جاری رہتا تھا۔

اسلام نے ان عربوں کے اخلاق و عادات یکسر بدل ڈالے۔ ان کے سنن موروثہ میں تغیر پیدا کر دیا۔

پہلے یہ غدار، مکار، عہد شکن اور بے وفا تھے۔ اب ان میں وفا، پاس عہد، پابندیٔ قول اور شرافت کا جوہر پیدا ہو گیا۔

پہلے یہ خائن تھے اب امین بن گئے

پہلے یہ سنگدل، جفا پیشہ، بد اطوار اور سرکش تھے۔ اب یہ مطیع، رقیق القلب، رحیم و کریم اور خوش خلق بن گئے۔

یہ سب کچھ، یہ بہت کچھ، صرف ایک چوتھائی صدی کے اندر واقع ہو گیا۔ بلکہ اس سے بھی کم میں ——— صرف ۲۳ سال کے اندر!

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت و نبوت کے ۱۳ سال مکے میں گزارے۔ اس مدت میں اسلام پھیلا، مگر قدرے قلیل اور دس سال مدینے میں گزارے اور اس مختصر ترین مدت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ ؐ کے دستِ مبارک پر یہ معجزہ کبریٰ ظاہر کر دیا۔

اب عرب بالکل جدید بن چکے تھے۔ ان میں کوئی پرانی چیز (برائی) باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ ایک بہت بڑی اور عظیم و جلیل امت بن گئے تھے ——— ایسی امت جس نے صرف نصف صدی کے اندر اپنے جزیرے کے حدود سے نکل کر تاریخ کا دھارا بدل دیا، زمین کا رخ بدل دیا۔

اس ساری مدت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی معجزے کا سوا قرآن کے دعویٰ نہیں کیا۔

بے شک قرآن معجزہ ہے۔لیکن کیسا معجزہ۔ وہ الفاظ و معانی اور نظم و ترتیب الفاظ کے لحاظ سے بھی ایسا معجزہ ہے کہ کوئی عرب اس کا مثل و جواب نہ تیار کر سکا۔ اور اس اعتبار سے بھی معجزہ ہے کہ اس نے جو کچھ کہا۔ وہ ہو کر رہا۔ اور وفات نبی ؐ سے لے کر قیامت تک اس کا صدقِ عظیم و جلیل قائم رہے گا۔ سورۃ نور میں اللہ نے بلا شبہ سچ فرمایا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ص وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ
خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ
لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ط وَ
مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥

یعنی:
تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالےٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین کی حکومت عطا کرے گا۔ جیسے ان سے پہلے (اہل ہدایت کو) حکومت دی تھی اور جس (دین) کو (اللہ نے) ان کے لیے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اس کو ان کے (نفع آخرت کے) لیے قوت دے گا۔ اور ان کے خوف کو مبدل بہ امن کر دے گا۔ بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں۔ اور میرے ساتھ کسی طرح کا شرک نہ کریں۔ اور جو شخص (بعد ظہور) اس وعدے کے کفر کرے گا۔ تو یہ لوگ فاسق ہیں۔

اسی طرح سورہ حشر میں فرمایا سچے خدا نے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ
عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا
مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

یعنی:
اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر اتارتے تو (اے مخاطب) تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ٥

دب جانا اور پھٹ جانا۔ اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں کہ تاکہ وہ سوچیں

بالآخر قلوب عرب میں قرآن گھر کر گیا۔ ان کے ضمیر میں نفوذ کر گیا۔ انہوں نے **اس کو ہضم کر لیا** اسلام نے انہیں غلامی سے نجات دلائی۔

یہ غلامی تھی شہوات کی، اسلام نے انہیں پاک کیا۔ اس ناپاکی سے جو معصیت اور لغزش کی ناپاکی تھی۔ وہ منتفرق تھے۔ اسلام نے ان میں وحدت پیدا کردی۔ وہ ذلیل تھے اسلام نے انہیں سربلند کردیا اور ان کے قلوب کو نور سے بھر دیا۔ وہ دنیا میں پھیل گئے اور اللہ کا نور پھیلانے لگے ــــــــ جہاں بھی انہیں موقع ملا، جہاں بھی ان کے قدم پہنچے۔

اسلام کی طرف عربوں کا میلان و اذعان اس وقت اور بڑھ گیا۔ جب ۹ ہجری میں آنحضرتؐ کے حکم سے ابوبکرؓ نے لوگوں کو حج کرایا۔

اسی حج کے موقعہ پر آں حضرت نے علیؓ کو بھیجا کہ ابوبکر سے ملحق ہو جائیں اور لوگوں کو قرآن کے احکام سنا دیں۔ جو سورۃ توبہ میں نازل ہوئے تھے۔ جن کی رُو سے اسلام قوی سے قوی تر ہوتا چلا گیا۔ اور سارا جزیرہ عرب کفر و شرک سے پاک ہو کر اسلام کے زیر نگین آگیا۔ سورۃ توبہ کی ان آیات میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے مشرکین سے برآءت کا اظہار کیا تھا۔ اور مشرکین کو بیت کعبہ میں داخل ہونے یا طوافِ عریاں کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ اس کے علاوہ اور احکام بھی تھے۔ سورۃ توبہ کی وہ آیتیں یہ ہیں؛

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ فَسِيْحُوْا فِى

یعنی: اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین (کے عہد) سے دست برداری

الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ
اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی
اللّٰهِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِی
الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَ اَذَانٌ مِّنَ
اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ
يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ
اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ
وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ
خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ
فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی
اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ
عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ
ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا
وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ
اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ
اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِيْنَ ۝ فَاِذَا انْسَلَخَ
الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا
الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ
وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ

ہے۔ جن سے تم نے (بلاتعین مدت) عہد
کر رکھا تھا۔ سو تم اس سرزمین میں چار
مہینے چل پھر لو اور یہ بھی جان لو کہ تم خدا کو
عاجز نہیں کر سکتے۔ بیشک خدا کافروں کو
آخرت میں رسوا کرے گا۔ اور اللہ اور رسول
کی طرف سے حج اکبر کی تاریخوں میں عام لوگوں
کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس
کا رسول دونوں دست بردار ہوتے ہیں ان
مشرکین (کو امن دینے) سے۔ پھر اگر تم (کفر سے)
توبہ کر لو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم نے (اسلام
سے) اعراض کیا تو یہ سمجھ لو کہ تم خدا کو عاجز
نہیں کر سکو گے اور ان کافروں کو ایک دردناک
سزا کی خبر سنا دیجیے ہاں مگر وہ مشرکین مستثنیٰ ہیں
جن سے تم نے عہد لیا پھر انہوں نے تمہارے
ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلے
میں کسی کی مدد کی۔ سو ان کے معاہدے کو
ان کی مدت (مقررہ) تک پورا کر دو۔ بیشک
اللہ (بدعہدوں سے) احتیاط رکھنے والوں کو
پسند کرتا ہے۔ سو جب اشہر حرم گذر جائیں
تو (اس وقت) ان مشرکین کو جہاں چاہو جہاں
پاؤ انہیں پکڑ لو اور سر گھات کی جگہ ان کے

وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ
فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ
اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا
سَبِيْلَهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ٥ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ
الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ
فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ
اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ط
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ٥
كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ
عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ
رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ
عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ج فَمَا
اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا
لَهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ٥
كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ
لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا
ذِمَّةً ط يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ
وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ج وَاَكْثَرُهُمْ
فٰسِقُوْنَ ٥ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا

لیے بیٹھو۔ پھر اگر توبہ کریں، نماز پڑھنے لگیں اور زکات دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو بیشک خدا بڑا مغفرت کرنے والا اور بڑا رحیم ہے۔ اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے پناہ مانگے آپؐ سے، تو آپؐ اسے پناہ دیں۔ تاکہ وہ کلام الٰہی سن لے۔ پھر اسے اس کی جائے امن میں پہنچا دیں۔ یہ حکم اس واسطے ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو پوری طرح خبر نہیں رکھتے۔ ان مشرکین (قریش) کا عہد اللہ کے نزدیک اور اس کے رسولؐ کے نزدیک کس طرح قابل رعایت رہے گا؟ مگر جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک عہد لیا ہے سو جب تک یہ لوگ تم سے سیدھی طرح رہیں تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ (بدعہدی سے) احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ کیونکر نہ مارے کافروں کو۔ اگر غالب آئیں تو نہ پاس قرابت کریں نہ قول و قرار کا لحاظ۔ یہ لوگ تمہیں اپنی زبانی باتوں سے راضی کر رہے ہیں۔ اور ان کے دل (ان باتوں کو) نہیں مانتے اور ان میں زیادہ تر

عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَا
يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا
وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝ فَاِنْ
تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ
اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ
فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ
نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ
دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ
الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ
لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝
اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا
اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ
الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ
اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ
فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَاتِلُوْهُمْ
يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ

فاسق ہیں۔ انہوں نے احکام الٰہیہ کے عوض
(دنیا کی) متاع ناپائیدار کو اختیار کر رکھا ہے
سو یہ لوگ اللہ کے رستے سے ہٹے ہوئے ہیں
اور یقیناً ان کا یہ عمل بہت ہی بُرا ہے یہ لوگ
کسی مسلمان کے بارے میں نہ قرابت کا پاس
کریں نہ قول و قرار کا۔ اور یہ لوگ حد سے تجاوز
کرنے والے لوگ ہیں، سو اگر یہ لوگ توبہ کریں
اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے
دینی بھائی ہو جائیں گے اور ہم سمجھدار لوگوں کے
لیے احکام کو خوب تفصیل سے بیان کرتے ہیں
اور اگر وہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسمیں
توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعن کریں تو
تم لوگ اس قصد سے کہ یہ باز آ جائیں ان ائمہ
کفر سے لڑو۔ کیونکہ اب ان کی قسمیں (قائم)
نہیں رہیں۔ تم ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے
جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور رسول
کے جلاوطن کر دینے کی تجویز کی۔ اور انہوں نے
تم سے چھیڑ میں پہل کی۔ کیا ان سے ڈرتے
ہو؟ سو اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ سزاوار ہے
کہ اس سے ڈرو۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ ان
سے لڑو، اللہ کا وعدہ ہے ان کو تمہارے

وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ
عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ
قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ
غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ط وَيَتُوْبُ
اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ اَمْ حَسِبْتُمْ
اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ
اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ
وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ
وَلِيْجَةً ط وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ
اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ
شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ
بِالْكُفْرِ ط اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ ج وَفِى النَّارِ
هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ
مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ
وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى

ہاتھوں سزا دے گا اور ذلیل و خوار کرے
گا۔ اور تم کو ان پر غالب کرے گا۔ اور بہت
سے مسلمانوں کے قلوب کو شفا دے گا۔ اور
ان کے قلوب کے غیظ و غضب کو دور کر
دیگا۔ اور جس پر چاہے گا توجہ بھی فرمائے گا۔
اور اللہ تعالیٰ بڑا علم والا اور بڑا حکمت
والا ہے۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ یونہی چھوڑے
جاؤ گے، حالانکہ ہنوز اللہ نے (ظاہر طور
پر) ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے
تم میں سے جہاد کیا۔ اور اللہ اور رسول ؐ
اور مؤمنین کے سوا کسی کو خصوصیت کا دوست
نہ بنایا ہو۔ اور اللہ کو سب خبر ہے تمہارے
کاموں کی۔ مشرکین کی یہ لیاقت ہی نہیں کہ
اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں۔ جس حالت
میں کہ وہ خود اپنے اوپر کفر کا اقرار کر رہے
ہیں۔ ان کے سب اعمال اکارت ہیں
اور دوزخ میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔
ہاں اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام
ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان
لائیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں
اور بجز اللہ کے کسی سے نہ ڈریں۔ سو ایسے

اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ	لوگوں کی نسبت توقع ہے کہ اپنے مقصود
الْمُهْتَدِيْنَ ۝	تک پہنچ جائیں گے ۔

اس کے بعد مسجد حرام سے دور رکھنے کے سلسلے میں اللہ عز وجل نے اور زیادہ سختی کے ساتھ جس سال ابوبکرؓ نے لوگوں کو حج کرایا ۔ ممانعت فرمادی ۔ اسی سورۃ میں ارشاد ہوا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا	یعنی :
الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا	اے ایمان والو ! مشرک لوگ نرے ناپاک
يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ	ہیں سو یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام
بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَاِنْ	کے پاس نہ آنے پائیں اور اگر تم کو مفلسی
خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ	کا اندیشہ ہو تو خدا تم کو اپنے فضل سے اگر
يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ	چاہے گا، ان کا محتاج نہ رکھے گا ۔ بیشک
اِنْ شَآءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ	اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا، بڑا حکمت
حَكِيْمٌ ۝	والا ہے ۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وداع کیا ۔

اس حج کے موقع پر نہ کوئی مشرک آسکا، نہ طواف عریاں کرسکا ۔

اس حج کے موقع پر آپ نے وہ مشہور خطبہ دیا تھا جسے بجا طور پر آپ کی وصیت قرار دیا جاسکتا ہے ہر امر اور نہی کے بعد بار بار آپ کی زبان مبارک پر یہ جملہ آتا تھا :

اَلا ھل بلغت ، اللھم اشھد	کیا میں نے یہ بات تم سب تک پہنچادی
	ــــــــ اے اللہ گواہ رہنا ۔

آپ نے فرائض رسالت اکمل طور پر انجام دے لیے ۔ جو امانت آپ کو سونپی گئی تھی

اسے بہت اچھی طرح آپ نے ادا کر دیا۔

اثنائے حج وداع میں سورۂ مائدہ کی یہ آیتیں آپ ؐ پر نازل ہوئی:

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا	یعنی:
مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ	آج کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے،
اخْشَوْنِ ط اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ	ان سے خوف زدہ مت ہو، مجھ سے ڈرو
لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ	آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل
نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ	کر دیا۔ تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور
دِیْنًا	تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔

اور ٹھیک اسی وقت سبھوں کے سچے نے محسوس کر لیا کہ رسالت کا دور ختم ہوا۔ اور دنیا کی مہم اتمام تک پہنچ گئی اور نعیم مقیم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بہرہ ور ہونے یعنی اس دنیا سے کنارہ کشی کرنے کا وقت آ گیا۔ جب حج وداع کے موقع پر بمقام منیٰ یہ آیتیں نازل ہوئیں:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ہ وَ	یعنی:
رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ	اے محمدؐ! جب خدا کی مدد اور مکے کی فتح امع
دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ہ فَسَبِّحْ	اپنے آثار کے) آ پہنچے (یعنی واقع ہو جائے) آپ
بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ط اِنَّهٗ	لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل
کَانَ تَوَّابًا ہ	ہونے دیکھ لیں تو اپنے رب کی تسبیح و تحمید کر
	اور اس سے استغفار کی درخواست کریں، وہ بڑا
	توبہ قبول کرنے والا ہے۔

ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے صحابہ سے فرمایا:

"اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا کہ وہ دنیا کی رعنائیوں اور قرب الٰہی کی

نعمتوں میں سے جو چاہے اختیار کرلے۔ اس نے قربِ الٰہی کو پسند کرلیا۔"

(بخاری و مسلم)

اس بات میں سفرِ آخرت کی طرف اشارہ تھا۔ مگر صحابہ نہیں سمجھے البتہ ابوبکرؓ تاڑ گئے انہوں نے کہا:

ہمارے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، ہم آپؐ کا فدیہ بن جائیں گے۔"

ابوبکرؓ کی یہ بات سن کر لوگ متعجب ہوگئے۔ اور اس کی کنہ اس وقت تک نہیں سمجھ سکے۔ جب تک آپؐ نے دنیا کو چھوڑ کر اللہ کو اختیار نہیں کرلیا۔ اور رفیقِ اعلیٰ سے نہیں جاملے۔

اس واقعے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپؐ کا مزاج ناساز ہوا۔ اور بیتِ عائشہؓ میں آپؐ بسترِ علالت پر دراز ہوگئے۔ جب مرض میں ذرا تخفیف ہوتی تو آپؐ نماز کے لیے تشریف لے جاتے لیکن جب مرض نے زیادہ شدت اختیار کرلی تو آپؐ نے حکم دیا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں۔

اور اسی مہینے میں جب آپؐ ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تھے، یعنی ربیع الاول میں آپؐ نے وفات پائی ——— ہجرت کے پورے دس سال بعد۔

وفاتِ نبیؐ کی خبر سن کر لوگ شک میں پڑ گئے۔ انہیں یقین نہیں آیا کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ عمرؓ کی حالت سب سے زیادہ غیر تھی۔ وہ اس کی جان کے درپے ہوجاتے جو کہتا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ اس موقعہ پر ابوبکرؓ نے سورۃ آل عمران کی یہ آیتیں تلاوت کیں:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ	یعنی:
خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ	محمدؐ ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گذر
أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ	چکے ہیں اگر وہ مرجائیں یا (راہِ اسلام میں) قتل
عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ	ہوجائیں تو کیا تم پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے جو
يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ	پچھلے پاؤں پلٹ جائیگا۔ وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکیگا
اللَّهَ شَيْئًا سَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝	اور اللہ تعالیٰ شکر گزار بندوں کو جزا دے گا۔

ان آیات کریمہ کے سنتے ہی مسلمانوں کے ہوش وحواس بجا ہو گئے اور وہ حق کی طرف پلٹ پڑے اور اس حقیقت کو مان لینے پر مجبور ہو گئے۔ جسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اور وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا وہ قول دہراتے لگے۔ جو اس نے اپنے نبی سے کہا تھا :

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ ۝

(۱۹)

مسئلۂ خلافت

○

انصار اور مہاجرین کا اختلاف، بیعت ابوبکر، اہل بیت کا سکوت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابھی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی کہ مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا جو ان کی وحدت ملی کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ فوراً ہی یہ طے ہو جانا چاہیے کہ سیاست ملی اور تدبیر امور میں کون آپؐ کا جانشین ہو گا؟

انصار کا خیال تھا کہ خلافت ان میں ہونی چاہیے اور نستوہن وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہی زمام کار ہاتھ میں لیں۔ اس لیے کہ مدینے کے اصل باشندے وہی تھے۔ مہاجرین کی حیثیت صرف مہمان کی تھی۔ جو گذشتہ دس سال سے یہاں رہ رہے تھے۔ ورنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ کے ساتھ جو ہجرت کر کے آئے تھے انہیں اور جنہوں نے بعد میں ہجرت کی ان کو ٹھکانا دینے والا انصار کے سوا کون تھا۔ ہاں انصار ہی تھے جنہوں نے نبیؐ اور دین کے راستے میں تمام کٹھنائیاں جھیلیں، لڑائیاں لڑیں، جہاد کیا اور ہر طرح کے مصائب برداشت کیے۔ لہٰذا تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خلیفۂ نبیؐ بننے کے مستحق اور سزاوار وہی ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر وفات نبیؐ کے فوراً بعد وہ مجتمع ہوئے اور فیصلہ

کر لیا کہ ایک شخص کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لیں۔ چنانچہ قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کا نام بھی اس منصب کے لیے پیش کر دیا گیا۔

یہ بات جیسے ہی مہاجرین تک پہنچی، فوراً ابو بکر، عمر اور ابو عبیدہ بن الجراح انصار کے پاس پہنچے کہ انہیں اپنا فیصلہ بدلنے پر آمادہ کریں۔ کچھ دیر تک بات چیت ہوئی۔ جس نے تلخی اور بدمزگی کی صورت اختیار کر لی۔

آخر انصار کی طرف سے تجویز پیش ہوئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو، ایک مہاجرین میں سے۔ ابو بکر نے یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا اور کہا:

"ہم امیر ہیں اور تم وزیر ———— !"

اور دلیل یہ دی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں سے تھے، پس واجب اور ضروری ہے کہ ولایت امر اس شخص کے ہاتھ میں ہو جو آپ سے قرابت رکھتا ہو۔

ابو بکر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی سنائی کہ ائمہ قریش میں سے ہوں گے۔

انصار نے یہ بات مان لی۔ انہیں یہ گراں گزرا کہ اللہ اور رسولؐ کے لیے انہوں نے تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائی تھیں، ان کا معاوضہ خلافت کی صورت میں لیں۔

اس کے بعد عمر نے ابو بکر کا نام پیش کیا اور فوراً ہی دستِ بیعت بڑھا دیا۔ انصار نے بھی بیعت کر لی۔ البتہ سعد بن عبادہ نہ ابو بکر کے دلائل سے مطمئن ہوئے، نہ انہوں نے بیعت کی۔ بلکہ انصار اور مہاجرین دونوں سے دل برداشتہ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ یہاں تک کہ شام میں ایک تیر لگا اور انتقال کر گئے۔ یہ پتہ نہ چل سکا، کس نے تیر مارا تھا؟

غرض تمام مسلمانوں نے ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور ان کی خلافت باقاعدہ قائم ہو گئی لیکن ابھی ایک اور اختلاف باقی تھا۔

اور یہ اختلاف ابو بکر پر انصار کے اختلاف سے زیادہ شاق تھا۔

یہ اختلاف تھا ابو بکر اور فاطمۃ الزہرا کے مابین۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں

فاطمہؓ ابوبکرؓ کے پاس اپنے والد کی میراث طلب کرنے تشریف لائیں۔ابوبکرؓ نے انکار کردیا اور کہا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا :۔

"ہم گروہِ انبیاء کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی۔جو کچھ ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔"

اس کے بعد ابوبکرؓ نے کہاکہ وہ کبھی بھی قولِ رسولؐ کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔

اس بات پر فاطمہ خفا ہوگئیں۔ان کے رفیقِ حیات علیؓ بھی ان کے ساتھ تھے۔اس لیے حضرت علی کی بیعت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر فوراً نہیں ہوئی۔

حضرت فاطمہؓ باپؐ کے بعد صرف چھ مہینے زندہ رہیں۔ان کی وفات کے بعد علی نے ابوبکر کی بیعت کرلی۔

کہاجاتا ہے کہ بنو ہاشم خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔لیکن انہوں نے فتنہ برپا کرنے سے گریز کیا، اور یہ بھی پسند نہیں کیا کہ اسلام میں اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا کریں۔چنانچہ انہوں نے بلاتامل مسلمانوں کی رائے عامہ یعنی اجماع المسلمین کے سامنے سرتسلیم خم کردیا۔

(۲۰)

مُرتدین سے جنگ

مسیلمہ کذاب اور دوسرے مدعیان نبوت سے مسلمانوں کی رزم آرائی

بہرحال حالات کچھ بھی تھے۔ ابوبکر کی بیعت اتمام کو پہنچی اور صحیح مان لی گئی۔ اگرچہ اس میں مسلمانوں کے مشورے کو دخل نہیں تھا۔ چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"ابوبکر کی بیعت جلد بازی سے ہوئی۔ لیکن اس جلد بازی کے شر سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بچا لیا۔"

لیکن ابوبکر کو ایک ایسے اختلاف سے دوچار ہونا پڑا کہ اس کا شر اسلام کو ضرور اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ اگر خدا خود اس کا حافظ اور نگہبان نہ ہوتا۔

اس اختلاف کے موقعہ پر ابوبکر نے بڑے استقلال اور ثباتِ قدم کا ثبوت دیا اور مہاجرین انصار اور نومسلموں میں ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا۔

یوں کہنا چاہیے کہ عرب ابوبکر پر ٹوٹ پڑے اور بس چلتا تو ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ ان میں سے بعض نے کہا:

"ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے۔"

ان لوگوں کا خیال تھا زکات کا ادا کرنا ان کے لیے موجب تحقیر و ذلت ہے۔

لیکن ابوبکر نے یہ بات نہیں مانی۔ انہوں نے نہایت سختی کے ساتھ کہا۔ لوگ جو کچھ رسول اللہ کے زمانے میں دیتے تھے وہ اب بھی ادا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے فرمایا:

"یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ نے ان دونوں میں فرق نہیں کیا ہے۔ بلکہ متعدد مقامات پر دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ قرآن کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہیں"

اس پر عمر نے ابوبکر سے کہا:

"آپ ان عربوں سے مقاتلہ کرنے کی وجہ جواز کیا رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک مقاتلہ کروں جب تک وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا اقرار نہ کرلیں۔ اور جب یہ کہہ دیں تو ان کی جان و مال محفوظ ہے۔ مجھ سے سوا حق خداوندی کے اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے""

ابوبکر کا نظریہ دوسرا تھا۔

وہ سمجھتے تھے کہ صرف زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہہ دینا ایمان نہیں ہے نہ اسلام ہے واجب ہے کہ زبان کا ترجمان دل ہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو حکم دیا ہے اس کی پابندی کی جائے۔ اور جس سے روکا ہے اس سے باز رہا جائے اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے زکات ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ پس جو اس حکم سے روگردانی کرتا ہے وہ کفر کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کا انتواء جحود (سرکشی) ہے اور کفار جاحدین کے ساتھ قتال ضروری ہے۔

اس حادثے کے علاوہ ایک اور حادثہ بھی رونما ہوا۔

عرب میں بعض لوگ ایسے ابھرے جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور لوگوں کے سامنے اس کلام کی تلاوت کرنے لگے جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وحی الٰہی ہے۔

یمن میں اسود عنسی ظاہر ہوا، یمامہ کے قبیلۂ بنو عبس سے مسیلمہ کذاب اٹھا۔ بنی اسد میں سے طلحہ نے ظہور کیا۔ بنی تمیم کے قبیلے سے ایک عورت سجاح مدعیۂ نبوت بن کر نمودار ہوئی۔ ایک خلق کثیر ان نبیوں کے ساتھ ہو گئی جس کے دل میں ابھی ایمان جاگزیں نہیں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ حجرات کی اس آیۂ کریمہ میں بالکل سچ فرمایا تھا ان لوگوں کے لیے:

قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ	یعنی:
قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ	یہ اجڈ عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے
قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ	آپؐ فرما دیں کہ تم ایمان تو نہیں لائے۔ لیکن
الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ	یوں کہو کہ ہم (مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہو گئے ہیں
اِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل
لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ	نہیں ہوا۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ
شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ	کا کہنا مان لو تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال میں ذرا
رَّحِيْمٌ ○	کمی نہیں کرے گا۔ بیشک اللہ بڑا مغفرت کرنیوالا
	(اور) بڑا رحیم ہے۔

مہاجرین و انصار میں سے اور ان لوگوں میں سے جو اسلام پر استقامت رکھتے تھے کسی کو بھی اس باب میں شک نہیں تھا کہ ان لوگوں سے قتال واجب ہے۔ اگر ایسا اقدام ابوبکر نے نہ کیا ہوتا۔ تو کم از کم جزیرۂ عرب تو ضرور پارہ پارہ ہو جاتا۔ لہٰذا اب ان کے سامنے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا کہ مرتدین سے جہاد کریں جس طرح اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے جہاد فرمایا کرتے تھے

ابوبکر نے مرتدین سے جنگ کی اور مسلمانوں نے پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ ان سے تعاون کیا۔ انہوں نے مرتدین سے مقاتلہ کیا۔ اور یہ مقاتلہ ایمان اور بصیرت صادقہ کے ساتھ تھا۔ اس راہ میں انہوں نے جان و مال کسی چیز کے صرف کرنے سے دریغ اور بخل نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اس جنگ میں ان کے بہت سے اخیار قتل ہو گئے۔

خاص طور پر مسیلمہ کذاب سے جو جنگ ہوئی وہ بڑی سخت تھی اور اس لڑائی میں بہت سے مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نصرت نازل فرمائی اور جزیرۂ عرب بالآخر سراسر اسلامی خطہ ہو گیا اور ابوبکر اس قابل ہو گئے کہ ایک اسلامی فوج عراق میں اور ایک شام میں بھیج دیں۔

حصّهٔ دوم

(١)

اُسوۂ حسنہ

قرآن کے مجمل کی تفصیل قول سے یا عمل سے یا دونوں سے

سورۂ کہف کے آغاز میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی
عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ
لَّہٗ عِوَجًا ۝ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ
بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ
وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ
یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ
لَھُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّا
کِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا ۝ وَّیُنْذِرَ
الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ
وَلَدًا ۝ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ

یعنی:
تمام خوبیاں اس اللہ کے لیے ثابت ہیں
جس نے اپنے (خاص) بندے (محمدؐ) پہ یہ
کتاب نازل فرمائی اور اس میں ذرا بھی کجی
نہیں رکھی۔ بالکل استقامت کے ساتھ
موصوف بنایا تاکہ وہ ایک منجانب اللہ سخت
عذاب سے ڈرائے۔ اور ان اہل ایمان کو جو
نیک کام کرتے ہیں۔ یہ خوش خبری دے کہ
کہ انہیں اجر اچھا ملے گا۔ جس میں وہ ہمیشہ رہینگے
اور تاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جو کہتے ہیں کہ اللہ اولاد

وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ٥

رکھتا ہے نہ اس کی کوئی دلیل ان کے پاس ہے نہ ان کے آباؤ اجداد کے پاس تھی۔ بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے (اور) وہ لوگ بالکل جھوٹ بکتے ہیں۔

سورۃ مدثر میں فرمایا:۔

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ٥ قُمْ فَاَنْذِرْ ٥ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ٥ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ٥ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ٥ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ٥ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ٥

یعنی:

اے چادر میں ملبوس (محمدؐ) اٹھو پھر کافروں کو ڈراؤ۔ اور اپنے رب کی بڑائیاں بیان کرو۔ اور اپنا جامہ پاک رکھو اور بتوں سے الگ رہو (جس طرح اب تک رہے ہو) اور کسی کو اس غرض سے منت دو (دوسرے وقت) زیادہ معاوضہ چاہو۔

سورۃ احزاب میں ارشاد فرمایا:۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ٥ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ٥ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ٥ وَلَا تُطِعِ

یعنی:

اے نبی بے شک ہم نے آپ کو اس شان کا نبی بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور (کفار) کے ڈرانے والے ہیں۔ اور (سب کو) اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں۔ اور مومنین کو بشارت دیں کہ ان پر اللہ کی طرف سے بڑا

الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

فضل ہونیوالا ہے اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانیے اور ان کی طرف سے جو ایذا پہنچے اس کا خیال نہ کیجیے اور اللہ پر بھروسہ رکھیے اور اللہ کافی کارساز ہے۔

سورۃ جمعہ میں ارشاد فرمایا :۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

یعنی :

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر (محمدؐ) بھیجا جو انہیں اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں (عقائد باطلہ و اخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتا ہے اور انہیں قرآن اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے اور دوسروں کے لیے بھی ان میں سے جو ہیں شامل نہیں ہوئے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔

ان آیات سے اور قرآن کریم کی دوسری آیات کثیرہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اس لیے بھیجا تھا کہ ان لوگوں کو عذابِ عظیم سے ڈرائے جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور ان لوگوں کو اجر کریم کی بشارت دے جو اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس عذاب کی تفصیل بیان فرمائی ہے

جس سے کافر دوچار ہوں گے۔ اور اس نعیم مقیم کی حقیقت بیان فرمائی ہے۔ جس سے ایمان والے دائمی طور پر بہرہ ور ہوں گے۔

اور یہ نبی جو ڈراتا ہے اور بشارت دیتا ہے۔ جس چیز سے ڈراتا اور جس کی بشارت دیتا ہے۔ اس کا پورا پورا علم رکھتا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں سے بخوبی آشنا ہے۔ اسے یہ علم رب کی طرف سے بہ طریق وحی حاصل ہوا ہے۔ اس کی باتیں ایک ایسے واعظ کی باتیں ہیں۔ جنہیں سن کر سامعین پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے اور ایسے ادب آموز معلم کی باتیں ہیں جو اپنے سننے والوں کو راہِ راست کی طرف بلاتا ہے پس جس طرح وہ نذیر و بشیر ہے۔ اسی طرح معلم بھی ہے

آں حضرت کی تعلیمات دو انواع پر مشتمل ہیں:

(۱) اللہ کا وہ کلام جو بذریعہ وحی نبیؐ پر نازل ہوا۔ اور جس کے لفظ و عبارت کی تبلیغ حکم خداوندی سے اس نے کی۔ لوگوں کے سامنے تلاوت کی تاکہ پہلے سن لیں۔ پھر اس پر غور کریں۔ اس کلام الٰہی کی تفسیر بھی اس کے ذمے تھی۔ یا قول سے یا عمل سے ——— یا دونوں سے کہ بعض لوگ قصورِ فہم کے باعث اس نص کے کچھ حصوں کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

(۲) وہ علم جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے قلب پر القا کیا۔ جس سے پہلے آپ خود منتفع ہوئے۔ پھر لوگوں کو بتایا کہ وہ اپنے دنیاوی اور دینی معاملات و مسائل میں اس سے منتفع ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد سے وفات تک ۲۳ سال بشیر اور نذیر اور معلم کی حیثیت سے گزارے اور اپنے اس فرض کی بجا آوری میں ذرا سی کوتاہی کو بھی دخل نہیں دیا۔ آپ کا وجود ایک مینارۂ نور تھا۔ ایک اسوۂ حسنہ تھا۔ آپ کی سیرت قرآن کی عملی تفسیر تھی۔ آپؐ کا اسوۂ حسنہ ... تھا کہ لوگ اسے دیکھیں اور اس کی پیروی کریں۔ وہ کریں جو آپؐ نے

کیا ہے۔ اس سے مجتنب رہیں جس سے آپ ؐ نے اجتناب فرمایا ہے۔ آپ ؐ کے امرونہی کوسنیں۔ اور سر تسلیم خم کر دیں۔ سورۂ حشر میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ جو کچھ آپؐ دیں لے لیں اور جس سے روکیں باز آجائیں۔ ارشاد ہوا ہے:۔

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ ‏ ‏ یعنی:

وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ‏ ‏ نہیں رسول ؐ جو کچھ دے لو۔ اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔

غرض یہ تھی آپ ؐ کی حیثیت ——— گھر سے باہر بھی اور گھر کے اندر بھی۔ جب آپ ؐ ازواج مطہرات کے ہاں تشریف لے جاتے۔ تو آپؐ شوہر کے علاوہ معلم بھی ہوتے۔ جو کچھ آپ فرماتے ازواج مطہرات اسے یاد رکھتیں۔ جو کچھ آپؐ کرتے اسے یاد بھی رکھتیں اور آپ ؐ کے ارشادات کی سر بہ سر اور ہو بہو تعمیل کرتیں۔

چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ آپؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کو بہت سا علم ازواج مطہرات کے ذریعے ملا۔ خاص طور پر عائشہ، حفصہ اور ام سلمہ کے ذریعے۔

نماز اور روزے آپؐ عام صحابہ اور مسلمانوں سے کہیں زیادہ پڑھتے اور رکھتے تھے۔ آپؐ چھپ کر عبادت کرتے تھے تاکہ تقلید نبی ؐ کے شوق میں لوگ اپنی طاقت سے زیادہ عبادت نہ کرنے لگیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو قرآن آپؐ پر نازل کیا تھا۔ اس کے بعض حصے مجمل بھی تھے اور اس اجمال کی تفصیل آپ ؐ کے ذمے تھی کہ بہ صورت الہام حاصل ہونے والے علم کے ذریعے اس کی تفسیر و تفصیل بیان فرمائیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نماز پڑھنے اور زکات ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن یہ نہیں بیان فرمایا کہ نماز کس طرح پڑھی جائے؟ اور زکات ادا کرنے کی صورت کیا ہو؟ یہ آپ ؐ نے

اپنے علم الہامی سے بتایا کہ نماز یوں پڑھی جائے اور زکات اس طرح ادا کی جائے۔

قرآن نے رکوع اور سجود کا ذکر کیا ہے۔ لیکن رکوع اور سجود کی حد نہیں بیان کی ہے یہ آپ کا کام تھا کہ آپ نے ان ساری باتوں کو اپنے قول اور عمل سے بتایا اور سکھایا۔ آپ نے مسلمانوں کے لیے نماز قائم کی۔ اور انہیں حکم دیا کہ آپ کی تتبع کریں، قیام کریں۔ رکوع میں چلے جائیں۔ سجدہ ریز ہوں، قعدہ کریں۔ جب آپ قیام کریں، رکوع میں جائیں سجدہ ریز ہوں۔ اور قعدہ فرمائیں۔

آپ ہی نے یہ بھی بتایا کہ نماز میں کیا پڑھا جائے، سجود، جلوس اور رکوع میں کیا کہا جائے۔

پس آپ قرآن کی تفسیر اپنے قول یا عمل سے فرماتے تھے۔ ضروری ہے کہ ہم سنت کی وضاحت بھی کردیں۔ کہ جو حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی طور پر ثابت ہو۔ وہ قرآن کریم کے بعد، دین کی دوسری اصل ہے۔ اب ہم ان دونوں اصلوں —— قرآن و حدیث —— پر گفتگو کریں گے۔

۲

قرآن

اعجاز قرآن، وجوہ اعجاز قرآن، قرآن کے خصائص و صفات

قرآن کا انداز بیان، موضوعات، خصوصیات و ممیزات، تشریع و احکام

قرآن کریم سب سے بڑا معجزہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے رسول کریمؐ کو عطا فرمایا:

اعجاز قرآن کے بارے میں کثیر و طویل بحثیں کی جا سکتی ہیں۔ اس کے وجوہ بھی مختلف ہیں اور فنون بھی۔

قرآن ایک ایسا کلام ہے کہ اس کا مثل عربوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ اپنی ظاہری صورت میں شعر نہیں ہے۔ کیونکہ اوزان و قوافی اس میں موجود نہیں ہیں۔ نہ وہ ان اشعار سے مشابہ اور مشترک ہے، جن سے عرب مالوف اور مانوس تھے اور جن کے موضوعات و معانی سے وہ آشنا تھے۔

قرآن میں نہ ان ٹیلوں کا اور نہ ان جھاڑیوں کا ذکر تھا جو عرب شاعروں کے لیے تکیہ کلام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نہ اونٹ، صحرا، باغ، نخلستان، اشجار، حیوان، صید اور ان چیزوں کا ذکر تھا۔ جن کے نام اور جن سے متعلق تشبیہات و استعارات سے کلام عرب بھرا پڑا ہے۔

قرآن غزل بھی نہیں تھا۔ نہ اس میں فخر و تعلی کا ذکر تھا۔ نہ مدح و ہجو تھا، نہ نوحہ و ماتم کا۔ نہ اس میں مرثیے کا رنگ تھا نہ واردات دل کا۔

عرب شعراء کی طرح قرآن نے جنگ کو بھی اپنا موضوع نہیں بنایا ہے۔ نہ اس میں ہجوم اور اقدام کی تصویر کشی ہے پسپائی اور فرار کا مرقع ہے۔

شعر عبارت ہوتا ہے مبالغے اور تعلی سے لیکن قرآن میں نہ مبالغہ ہے نہ غلو۔ وہ حقائق اور سچائی سے بال برابر بھی تجاوز نہیں ہوتا۔

قرآن لوگوں کے سامنے وہ باتیں پیش کرتا ہے۔ جس سے وہ یکسر گوش نا آشنا تھے۔ آج تک کسی نے بھی ان کے سامنے اس طرح کی باتیں نہیں پیش کی تھیں۔

یہ قرآن باتیں کرتا ہے توحید کی، ایک خدا کی بڑائی بیان کرتا ہے اور اس کی طرف دعوت دیتا ہے

یہ شرک کی باتیں کرتا ہے۔ شرک کی مذمت کرتا ہے۔ اس سے روکتا ہے۔ اس کی برائیاں اور خرابیاں بیان کرتا ہے۔

یہ اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی عظمت کے گیت گاتا ہے۔ اس کی بے حد و نہایت قدرت کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے علم بے غایت کو بتاتا ہے۔ اس کے ارادے کی کارفرمائی بیان کرتا ہے جسے کوئی پلٹ نہیں سکتا۔ اس کے کمال تخلیق یعنی خلق سماوات و ارض اور ان دونوں کے مابین جو کچھ ہے اس کا ذکر کرتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کا بھی اور بڑی سے بڑی چیزوں کا بھی۔

یہ لوگوں کو اللہ کی عبادت کی طرف بلاوا دیتا ہے۔ اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ ان باتوں سے کنارہ کش رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جن سے آلودہ ہونا شرفا کا شیوہ نہیں۔

یہ اس نعیم مقیم کے اوصاف بیان کرتا ہے۔ جو اللہ نے صرف ایمان والوں کے لیے تیار کیا ہے اور ہمیشہ رہنے والے اس عذاب الیم کا ذکر کرتا ہے جو خدا نے ان لوگوں کے لیے تیار

کیا ہے جو شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جو اس کا ساتھی اور ساجھی ٹھہراتے ہیں۔ جو اس کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ جو اس کے ارشادات کو فراموش کر دیتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو بشارت دیتا ہے اور کافروں کو ڈراتا ہے۔

وہ قیامت کی داستان پیش کرتا ہے ——— قیامت کا دن جس کی دہشت کا یہ عالم ہوگا کہ حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے۔ لوگوں پر ایک مدہوشی کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے۔

وہ لوگوں کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ پاکی اور پاکیزگی اختیار کریں!

وہ لوگوں کے سامنے غیب کی خبریں بیان کرتا ہے۔ جس سے مومنین کے قلوب میں ثبات اور کافروں کے دلوں میں دھڑکا پیدا ہوتا ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء آئے تھے۔ وہ ان کی خبریں دیتا ہے۔ ان کا ماجرا سناتا ہے ان کے حالات بیان کرتا ہے۔ جو اپنی قوم کے پاس آیات بینات لے کر آئے تھے اور قوم نے ان سے اعراض کیا تھا۔ اور بہت کم لوگ تھے جو ایمان لائے تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے منہ پھیر لیا تھا عذاب کے مورد بنے اور دنیا و آخرت میں رسوا ہوئے اور وہ لوگ جو ایمان لائے تھے نجات سے بہرہ ور ہوئے اور دنیا و آخرت میں سربلند ہوئے۔

یہ ساری باتیں، بلکہ ان سے بھی بہت زیادہ قرآن اس شخصؐ کی زبان سے کہلا رہا تھا۔ جو قریش کا ایک اَن پڑھ شخص تھا جو بالکل لکھنا نہیں جانتا تھا۔ جسے بالکل پڑھنا نہیں آتا تھا جو علم حساب سے یکسر ناواقف تھا۔ جو کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہ احبار یہود کے پاس بیٹھا نہ رہبان نصاریٰ کی صحبت اختیار کی نہ اصحاب مجوس سے سروکار رکھا۔ یہ دوسرے اکثر عربی باشندوں کی طرح امی محض تھا۔ اسے دنیا کی باتیں بھی بس اتنی ہی معلوم تھیں۔ جتنی ایک معمولی عرب کو معلوم تھیں۔

لیکن اس کے باوجود یہ شخص ؑ توراۃ کے معاملے میں یہود سے مجادلہ کرتا تھا اور انجیل کے بارے میں نصاریٰ سے درپئے جدال رہتا تھا۔ اور فاش و برملا کہتا تھا، یہ لوگ موسیٰ ؑ پر جھوٹ بولتے ہیں۔ عیسیٰ ؑ کے بارے میں غلط باتیں کہتے ہیں۔ اور ان کے پاس جو تورات اور جو انجیل ہے۔ اس میں انہوں نے تحریف کر ڈالی ہے۔

یہ باتیں وہ شخص ؑ کہتا تھا جو نہ توراۃ پڑھ سکتا تھا۔ نہ انجیل، اس نے نہ تورات کو منسوخ کیا نہ انجیل کو۔ دونوں کی سچائیوں کی تصدیق کی۔ اور علم و دین کی وہ باتیں بڑھا دیں جو اللہ نے بتائی تھیں۔

یہ شخص ؑ مشرکین سے ان کے خود ساختہ خداؤں کے بارے میں بحث کرتا تھا۔ جن کی یہ پرستش کرتے تھے۔ جنہیں انہوں نے خدا کا ساجھی ٹھہرالیا تھا۔ جنہیں یہ خدا کے حضور میں اپنا شفیع گردانتے تھے۔ حالانکہ ان کی حالت یہ تھی کہ اگر انہیں پکارا جائے تو جواب نہیں دے سکتے۔ ان سے بات کی جائے تو سن نہیں سکتے۔ ان کے ساتھ برائی کی جائے تو یہ کچھ بگاڑ نہیں سکتے، یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں ان لوگوں نے خود گھڑ لیا ہے یا ان سے پہلے کے لوگوں نے بنالیا ہے۔ ان بتوں کے پاس نہ قوت ہے نہ دبدبہ، نہ شوکت۔

اور اس شخص ؑ نے ان لوگوں کے سامنے ایک مکمل اور جامع نظام شریعت پیش کیا جو دنیا میں نفع پہنچانے والا اور آخرت میں عذاب سے بچانے والا تھا۔ بشرطیکہ یہ اسے اختیار کر لیتے اور اپنے اوپر نافذ کر لیتے۔ اس نے ان لوگوں کے لیے زواج و طلاق، میراث و وصیت، بیع و شراء وغیرہ امور مشروع کیے۔ جو اجتماعی اور انفرادی زندگی پر یکساں حاوی تھے۔

اس نے ان پر انواع عبادات فرض کئے۔ جن سے نفوس کی تطہیر اور قلوب کا تزکیہ ہوتا تھا۔ اور ضمائر میں اللہ کی محبت، خوف، اخلاص اور تعلق کا نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم ہو جاتا تھا۔

اس نے ان لوگوں کو بتایا کہ اللہ سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی وہ سب کچھ سنتا ہے۔ سب کچھ دیکھتا ہے۔ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ جب مجتمع ہوتے ہیں تو وہ ان کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جب تخلیے میں جاتے ہیں تب بھی ساتھ رہتا ہے۔ قلبِ انسان کا ہر جذبہ، ہر چبھن، ضمیر کے اندر ہلچل مچانے والی ہر کیفیت خواہ وہ خیر کی ہو یا شر کی، اس کے علم میں ہے۔ بلکہ وہ اس سے بھی کہیں زیادہ جانتا ہے۔ ہر وہ چیز جو ہو چکی ہے۔ جو ہونے والی ہے۔ جو عنقریب ہو گی

وہ اپنے بندوں کے تمام اعمال سے واقف ہے۔ ان کیفیتوں سے بھی جو صرف دل کے نہاں خانے میں موجود ہیں۔ خواہ وہ اچھی ہوں یا بری۔ فجور سے تعلق رکھتی ہوں یا نیکی سے۔ طاعت کے ذیل میں آتی ہوں یا معصیت کی۔ اور یہ ساری باتیں وہ اپنی کتاب میں لکھ لیتا ہے۔ یوم حساب کو ہر شخص کے سامنے اس کا نامۂ اعمال ہو گا اور اسی کے مطابق سب کو جزا ملے گی۔ اچھے عمل والوں کو اچھی جزا اور برے عمل والوں کو ویسی ہی؛

یہ ساری باتیں ہم قرآن میں پاتے ہیں۔ جو اس شخص پر اترا تھا جو امّی تھا۔ اور چالیس منزلیں زندگی کی طے کرنے کے بعد وفعتہً جس کی زبان پر یہ بول آ گئے تھے۔

پھر اس میں تعجب کیا ہے کہ قریش اس کی یہ باتیں سن کر سکتے میں آ گئے۔ صرف قریش ہی نہیں سارے عرب۔

ان لوگوں نے کہا۔ یہ شاعر ہے۔ لیکن بہت جلد محسوس کر لیا کہ یہ شعر خوانی تو نہیں کرتا۔ کہنے لگے۔ یہ کاہن ہے۔ لیکن بہت جلد ان پر واضح ہو گیا کہ کاہنوں کی طرح شعبدہ بازی اس کا شیوہ نہیں۔

کہہ اٹھے یہ جادوگر ہے۔ لیکن بہت جلد یہ حقیقت ان پر منکشف ہو گئی کہ اس میں جادو کی تو کوئی بات نہیں۔ یہ تو انہی جیسا ایک شخص ہے۔ جو اپنی ذات کے نفع و ضرر پر

کوئی قدرت نہیں رکھتا۔ زمین پر اسی طرح چلتا ہے جس طرح دوسرے لوگ چلتے ہیں۔ اپنی روزی اسی طرح کماتا ہے جس طرح دوسرے لوگ کماتے ہیں۔ یہ کھول کھول کر بیان کرتا ہے کہ میں علم غیب نہیں جانتا۔ بجز اس کے جو خدا خود بتا دے۔

آخر لاجواب ہو کر اپنے دل کو تسکین اور تسلی دینے کے لیے کہہ اٹھے۔ یہ دیوانہ ہے لیکن خود ہی سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اس میں جنون اور دیوانگی کی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے اس سے باتیں کیں۔ اس کی باتیں سنیں، شب و روز اس کی نگرانی کی۔ لیکن اس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں پائی کہ اپنے خیال پر قائم رہ سکتے کہ یہ دیوانہ ہے سوا اس کلام کے جس کی یہ تلاوت کرتے تھا۔ اور جسے سن کر یہ تلملا کر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے تھے

ان میں سے کچھ تو وہ تھے جو اس کی یہ باتیں سن کر اور یہ آن دیکھ کر سہم گئے اور بہت سے ایسے تھے جو دشمن جان بن گئے۔ ان کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا کہ پوری قوت کے ساتھ اس کے خلاف صف آرا ہو جائیں اور عناد و مخاصمت کا کوئی دقیقہ بھی فروگذاشت نہ کریں۔ اور اسے کہیں کا نہ رکھیں۔

لیکن یہ ان تدبیروں اور فکروں میں غرق اور منہمک تھے اور یہ شخص اپنے کام میں لگا تھا۔ اس پر بدستور قرآن نازل ہو رہا تھا۔ اور لوگوں کے سامنے اس کی تلاوت کرتا تھا۔

یہ شخص جو یہ باتیں کر رہا تھا جو قرآن کی تلاوت کر رہا تھا جو امی ہونے کے باوجود یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے بدلائل واضحہ قاطعہ جدال کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے لیے ایک دردِ سر بن گیا تھا

انہوں نے چاہا کہ نرمی کے برتاؤ سے رام کر لیں اسے۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ تشدد اور قوت کے بل پر اسے دبانا چاہا۔ مگر ناکام رہے اور خاص بات یہ کہ یہ شخص ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کر کے چیلنج کرتا تھا کہ اگر کر سکیں تو قرآن کا مثل پیش کر کے دکھائیں۔ اس چیلنج کو قبول کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ سعی بسیار کے باوجود وہ قرآن کا مثل پیش کرنے سے قاصر رہے

البتہ عناد اور مخاصمت پر اور زیادہ پختہ ہوگئے اور اس سے بڑے بڑے معجزات و آیات کا مطالبہ کرنے لگے :

: ہم فقر و فاقے میں اور فلاکت میں مبتلا ہیں آپ اپنی نبوت کے زور سے ایک ہرا بھرا باغ فوراً تیار کردیجیے جس میں کھجور کے درخت ہوں، انگور ہوں، نہریں جاری ہوں، چشمے بہہ رہے ہوں۔ پھر ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

: اللہ اور ملائکہ کا دیدار کرا دیجیے ہم آپ کو نبی مان لیں گے

: ہمارے اوپر یہ سقف نیلی رواق گرا دیجیے تاکہ ہم سمجھیں واقعی آپ سچے ہیں۔

: آسمان پر چڑھ جایے اور وہاں سے کتاب الٰہی لے کر اس کی تلاوت کرتے ہوئے آئیے۔

: اپنے لیے چشم زدن میں ایک فلک مرتبت ایوان تعمیر کر کے دکھا دیجیے۔

: ہمارے اوپر آسمان سے سیم و زر کی بارش کرایے۔

لیکن ان مطالبات کے جواب میں اس شخص کے منہ سے صرف ایک ہی بات نکلتی تھی۔

"میں ان باتوں میں سے کسی بات پر بھی قادر نہیں ہوں۔ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہوں۔ مجھے امتیاز جو کچھ حاصل ہے وہ یہ کہ اللہ نے اپنی رسالت کے لیے مجھے چن لیا ہے اور لوگوں کے پاس بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

یہ تھے قرآن کے وجوہ اعجاز، عربوں نے اس کا مثل پیش کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اور جب معاصر عرب ایک چھوٹی سی آیت بھی اس جیسی نہ پیش کر سکے تو ان کے بعد آنے والے تو اور زیادہ عاجز اور درماندہ ثابت ہوئے اور ان کے علاوہ دوسری قومیں بالکل اور سراسر ناکام۔

قرآن کے وجوہ اعجاز میں ایک اور چیز جس کی مثل پیش کرنے سے نبیؐ کی زندگی میں بھی اور آپ کی وفات کے بعد بھی قاصر رہے وہ اولئے معانی میں اس کا نظم واسلوب ہے۔ یہ نہ شعر ہے، نہ نثر ہے۔ یہ ایک خاص اسلوب کا حامل ہے۔ نہ جس کی کوئی مثال ہے۔ نہ جس کا کوئی نمونہ۔ شعر اس لیے نہیں کہ اوزان وقوافی سے متبقد نہیں۔ نثر اس لیے نہیں کہ ایسی نثر ہوتی ہی نہیں وہ آیات پر مشتمل ہے۔ جن کا اتصال وانفصال میں اور طول وقصر میں، ائتلاف واختلاف میں ایک خاص مزاج ہے۔ اس کی سورتیں پڑھتے وقت مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ کہیں رقت کی، کہیں عزم واستقامت کی۔ کہیں اللہ سے ڈرنے کی۔ کہیں قوت وشدت کی۔ غرض جہاں جن معنی کا تاثر قاری یا سامع پر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے

غرض کوئی سورت بھی تلاوت کیجیے۔ قرآن کا جمال لفظ، خروش اسلوب اور ضبط ونظام آپ کو مبہوت اور مسحور کر کے رکھ دے گا۔ آپ پر پوری طرح حاوی ہو جائے گا۔

قرآن کی ایک اور عجیب وغریب ترین خصوصیت یہ ہے کہ جو اسے پڑھتے یا سنتے ہیں انہیں بار بار ضمیر کی خلش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ اس سے لڑنا پڑتا ہے۔ قرآن جو کچھ کہتا ہے عقل اسے باور کرتی ہے۔ دل اسے مانتا ہے لیکن نفس اس کے ماننے سے ابا اور انکار کرتا ہے۔ ان کے دل اور زبان میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ دل اس طرف جھکتے ہیں۔ زبان انکار کرتی ہے اور چہرے اعراض کرتے ہیں۔

اسباب اعجاز قرآن میں سے ایک اور بہت بڑا اور اہم سبب یہ ہے کہ لوگوں کے عقول وقلوب پر اس کا اثر کامل یک رنگی کے ساتھ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ صدیاں بیت گئیں۔ نسلیں گزر گئیں۔ مگر اس کی سحر کاری جوں کی توں قائم ہے۔

قرآن کا ایک اور بہت بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس نے تاریخ بدل دی۔ اس نے ایک جاہل درندہ خو، ناخواندہ، اجڈ اور غیر مہذب قوم کو جو آپس میں ہمیشہ لڑتی رہتی تھی۔ غارت گری کرتی رہتی تھی۔ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتی رہتی تھی، امتِ واحد بنا دیا۔ اسے خلق جدید سے آشنا کر دیا۔ اس میں نظم وضبط، عدل وامن اور مساوات کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اسے مائل بہ ترقی کر دیا۔ اور اس نے دوسری قوموں اور امتوں میں اپنے یہ خصائل عالیہ پیدا کر کے انہیں خیر، او نیکی اور تہذیب اور عروج و فروغ کے راستے پر ڈال دیا۔ بحث بڑی طویل ہے لیکن اتنی واضح ہے کہ ہر شخص اس سے کسی نہ کسی حد تک باخبر ہے۔

ان تمام تبدیلیوں، ترقیوں اور کامرانیوں کا مصدر واحد قرآن اور صرف قرآن ہے اگر قرآن نہ ہوتا تو امتِ عربیہ جہل وغلظت کے دلدل میں پھنسی رہتی اور دوسری قومیں اس کے حصے بخرے کر کے اسے پامال کر رہی ہوتیں۔ وہ قرآن ہی تھا جس نے اس قوم کو قوت و شوکت کی نعمتِ فراواں سے مالا مال کر دیا۔

قرآن رفتہ رفتہ اترا، وہ ایک ہی مرتبہ میں بذریعہ وحی نازل نہیں ہوگیا۔ وہ اوقاتِ متفرقہ میں اترا۔ کبھی جلد جلد، کبھی تاخیر کے ساتھ۔

مشرکین قریش سوال کیا کرتے تھے

"یہ سارا قرآن ایک ساتھ ہی کیوں نہیں نازل ہوگیا؟"

لیکن اگر یہ پورا قرآن ایک ساتھ نازل ہو جاتا تو وہ اس کا تحمل نہ کر سکتے۔ اس مصلحت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے تھوڑا تھوڑا کر کے اسے نازل کیا تاکہ آسانی کے ساتھ اس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ممکن ہو جائے۔

یہ بھی نہیں تھا کہ جو آیت جس وقت نازل ہوئی ہو اسی وقت لکھ لی گئی ہو۔ جمع قرآن کا

کام ابوبکر کے زمانے میں ہوا اور عثمان کے زمانے میں یہ دیار و امصار میں بھیجا گیا۔ ؎

جسے مسلمانوں نے اپنے کانوں سے سنا اور مصاحف میں پڑھا اور جو آج ہمارے ہاتھ میں ہے اور قطعاً متواتر ہے۔ جس کے بارے میں کسی طرح کا شک وشبہ روا نہیں رکھا جا سکتا۔ جس کے بارے میں مسلمانوں کے اندر ذرا سا اختلاف بھی نہیں اور جس کی صحت پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

حاشیہ مترجم

؎ بلاشبہ ہمارے مؤرخین کی بہت بڑی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ جمع قرآن کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد گرامی میں نہیں ہوا تھا۔ یہ کام بعد میں انجام پایا۔

اس سلسلے میں مختلف اور متعدد مصاحف کا نام لیا جاتا ہے جو ترتیب کے اعتبار سے مختلف تھے۔ جمع قرآن کے بعد یہ نسخے جو مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے گئے تھے قلمزد ہو گئے۔ اور مصحف ابوبکر یا عثمان عالم اسلام میں پھیل گیا۔

لیکن میرے خیال میں یہ بات بداہتہً غلط ہے۔

قرآن آنحضرت پر نازل ہوتا تھا۔ وہی اسے مرتب فرماتے تھے اور اسی ترتیب کے مطابق اس کی تلاوت نماز میں یا قرأت میں فرماتے تھے۔ یہی قرآن تھا جو تراویح میں پڑھا جاتا تھا۔ یہی تھا جس کا دورہ وفات سے پیشتر آپ نے جبرئیل امین کے ساتھ کیا تھا۔ یہی تھا جس کی صحابہ تلاوت کرتے تھے۔ یہی تھا جس کی تعلیم و تدریس کے لیے آپ صحابہ کو مختلف مقامات پر روانہ فرماتے تھے۔ یہ ان دو میں سے ایک تھا جس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ تم میں دو گراں بہا (ثقلین) چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ یہی تھا کہ وقت وفات نبوی جس کے بارے میں حضرت عمر نے فرمایا تھا۔

حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ۔ (ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے)

اور یہ بلاشبہ یہ مکمل قرآن تھا جسے آج تک امت پڑھتی چلی آتی ہے۔ لہذا یہ جمع و ترتیب کی بات قطعاً ناقابل قبول ہے۔

(رئیس احمد جعفری)

قرآن کی ترتیب (جیساکہ وہ ہمارے سامنے ہے) سورتوں کے اعتبار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوئی۔ مصحف میں لمبی سورتوں کو متوسط سورتوں پر اور متوسط سورتوں کو مختصر سورتوں پر مقدم رکھا گیا۔ اس ترتیب میں نزول سور و آیات کو پیش نگاہ نہیں رکھا گیا۔ نہ مکی اور مدنی کا۔ نہ تاریخ نزول آیات کا۔ جیسا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، آیتیں سورتوں میں شامل کردی گئیں۔

چنانچہ ہم سورۂ بقرہ، آلِ عمران اور نساء اور مائدہ کو آغاز مصحف میں سورۂ فاتحہ کے بعد پاتے ہیں۔ حالانکہ یہ مدنی سورت ہے۔ اسی طرح انفال اور توبہ دونوں مدنی سورتیں ہیں۔ مکی سورتوں کے مابین ہیں۔ مدنی سورتوں میں ہمیں مکی آیتیں نظر آتی ہیں اور مکی سورتوں میں مدنی آیتیں موجود ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن کی ترتیب حسب مقام نزول و زمانہ نہیں ہے۔ قرآن ایک ہے جو سب کا سب اللہ کی طرف سے آیا اور اس سب کی تلاوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے سامنے کی۔

مسلمانوں نے اپنے اکثر علوم قرآن ہی سے منضبط کیے ہیں:

- شریعت دین تمام تر قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔
- مکے اور مدینے کے مسلمانوں کی تاریخ دعوت و عزیمت کا بڑا حصہ قرآن میں موجود ہے۔
- تفسیر الفاظ اور توضیح معانی کا علم مستقل جو تفسیر کہلایا قرآن ہی سے حاصل ہوا ہے۔
- لہجات قراءت جو قراءت مختلفہ میں نمودار ہوتے ہیں۔ قرآن ہی سے لیے گئے ہیں
- ان قراءتوں کی نحوی توجیہہ کا دار و مدار بھی قرآن ہی پر ہے۔
- علم تلاوت قرآن جو مشتمل ہے۔ مدّ، قصر، غنہ اور حسب قراءت مختلفہ

اخراج حروف پر، قرآن ہی کا ہے

: لغت عرب کی تدوین و تشکیل بھی قرآن ہی کی رہین منت ہے۔

: علم صرف و نحو بھی معجمات و لغات کو سمجھنے کے لیے جن اصولوں پر قائم ہیں وہ بھی قرآن کے ہیں۔

: روعت بیان کے لیے قرآن ہی کی مثال سے کام لیا جاتا ہے۔

: علوم بلوغت اور خاص طور پر معانی و بیان اور دوسرے کثیر علوم منضبطہ جن پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ قرآن ہی پر قائم ہیں

: علم کلام کا فلسفے پر اعتماد ہوتا ہے۔ خاص طور پر فلسفہ پر، لیکن ابواب نظریات اور اقسام سمعیات میں اس کا مدار قرآن ہی پر ہے۔

: اور متکلمین میں جو لوگ تاویل اور انحراف سے اجتناب کرتے ہیں وہ تفصیل عقائد اسلامیہ میں تمام تر قرآن اور سنت پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور فلسفہ سے ایک چاکر کی طرح خدمت لیتے ہیں۔ جس سے وہ نصوص کی مدافعت کرتے ہیں اور مؤدلین و متکلفین سے جدال کرتے ہیں۔ اور جو صرف فلسفے کو سہارا بنا کر نبرد آزما ہوتے ہیں ان سے برسر پیکار رہتے ہیں۔ وہ ہر حالت میں نصوص کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

قرآن کی طرف زیادہ توجہ نے مسلمانوں کے مابین بعض خصومات بھی پیدا کر دیے۔
مثلاً معتزلہ نے کہنا شروع کر دیا کہ قرآن مخلوق ہے۔ بعض خلفاء بنو عباس نے اس باب میں ان کی پشت پناہی کی۔ جس کے باعث ملک میں شر و فساد کی کیفیت پیدا ہو گئی اور خیار علماء کو امتحانوں اور آزمائشوں کے لرزہ خیز اور روح فرسا دور سے گذرنا پڑا۔
مختلف زبانوں کو روائع بیان اور آیات ادب کے سلسلے میں انسانیت نے بہت کچھ

دیا ہے۔ قدیم سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ لیکن قرآن کے سلسلے میں مسلمانوں نے جس توجہ اور انہماک کا اظہار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے قرآن کے روائع بیان کو پڑھا، یاد رکھا، اس پر بحث کی اور اسے مدار فکر و نظر بنا لیا۔

قرآن کے ساتھ مسلمانوں کی جو توجہ رہی ہے۔ اس کا کوئی نمونہ نہیں پیش کیا جا سکتا، کثرت تعداد اختلاف اجناس، اور تواتر نسل اور اجیال کے باوجود کوئی مسلمان کسی دور میں ایسا نہیں ملے گا۔ جس نے قرآن کا کم یا زیادہ حصہ حفظ نہ کیا ہو۔ اس لیے کہ نماز کی بجا آوری ممکن ہی نہیں جب تک قرآن کی کچھ آیتیں اس میں نہ پڑھی جائیں۔

پس ہر مسلمان کے لیے لازم ٹھہرا کہ کم از کم اتنا قرآن تو بہر حال یاد کرلے جو نماز کی ادائیگی کے لیے کافی ہو۔

قرآن کو حفظ کرنے والے وہ بھی ہوتے ہیں جو اس کے مفہوم و معنی کو سمجھتے ہیں اور وہ بھی جو بلا سمجھے ہوئے محض تقرب الٰہی کے خیال سے اسے زبانی یاد کرتے ہیں۔

بہر حال خلاصۂ کلام یہ کہ قرآن مسلمانوں کے لیے قوام حیات ہے وہ اس کے احکام کی پابندی کرتے ہیں۔ جن چیزوں سے اس نے روکا ہے۔ ان سے باز رہتے ہیں جب نماز پڑھتے ہیں خواہ جماعت سے خواہ انفرادی طور پر خود پڑھتے ہیں یا مقتدی کی حیثیت سے سنتے ہیں، وہ اس کی قرارت یا سماع کو ذریعہ تعبد خیال کرتے ہیں۔ اس سے علم کا استنباط کرتے ہیں اس سے روعت اور جمال کی لذت حاصل کرتے ہیں۔ اس کی قرارت یا سماع سے میٹھی آواز کے ذریعہ لذت گیر ہوتے ہیں

قرآن کا ایک بہت بڑا وصف، صفات بالا کے علاوہ یہ ہے کہ اس نے عربی زبان کو دوسری

زبانوں میں جذب نہیں ہونے دیا۔ حالانکہ مختلف زمانوں میں اور مختلف ادوار میں سیاسی بالادستی کے باعث کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ غیر عربی زبانیں عربی زبان پر غالب اور فرماں روا کی حیثیت سے کار فرما رہیں۔

سیاسی طور پر مسلمان منتشر اور پراگندہ ہو گئے، خلافت عربیہ ختم ہوگئی۔ استعمار اعاجم کے سامنے عربوں کو سرنگوں ہونا پڑا۔

عربوں پر اہل فارس نے خاص دار الخلافت کے اندر بیٹھ کر حکومت کی۔ اس کے بعد ترکوں نے مسلسل کئی صدیوں تک ان کو اپنا محکوم رکھا۔ پھر عہد جدید میں یورپ کی قوموں نے انہیں اپنا تابع اور محکوم بنا لیا۔ اور استعمار فرنگ پوری قوت کے ساتھ ان پر غالب اور مسلّط ہوگیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یورپ کی حضارت مادی کو بھی ان پر تفوق حاصل ہوگیا۔ اور وہ مجبور ہو گئے کہ یورپین زبانیں سیکھیں کہ ان کے مغربی آقاؤں کا فرمان یہی تھا۔ اور انہی زبانوں میں علم و ادب اور فلسفہ و فن سیکھنے پر وہ مجبور ہو گئے۔

اس صورت احوال کا تقاضا یہ تھا کہ عربی زبان فنا ہو جاتی اور شعوب عربیہ کی شخصیت دم توڑ دیتی۔ لیکن قرآن نے اس زبان کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔

عرب قرآن سے چمٹے رہے اس لیے کہ وہ ان کا ستون دین اور قوام حیات تھا۔ اسے عوام نے بھی پڑھا خواص نے بھی۔ اس کا قلیل یا کثیر حصہ سب نے زبانی یاد کیا۔ علماء نے مساجد اور مدارس میں اس کے درس کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزار ہا ہزار طلبہ بعد مکان و زمان کے باوجود طالبان قرآن، قرآن کے درس و فہم میں مصروف رہے۔ انہوں نے قرآن بھی پڑھا اور وہ زبان بھی سیکھی جس میں قرآن نازل ہوا تھا

ایسا بھی ہوا کہ بعض مسلمان قوموں نے عربوں کی حکمرانی کو بری نظر سے دیکھا۔ ان سے نفرت کی۔ عرب اور عروبت کے خلاف ان کے دل میں بغض پیدا ہوگیا۔ جب کبھی موقع ملا انہوں نے عربوں کو ستانے اور ایذا پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ لیکن اس عرب دشمنی کے باوجود، انہوں نے قرآن

کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس لیے کہ قرآن اور اسلام لازم وملزوم تھے۔ وہ عربوں سے بے تعلق، بے پروا، اور متنفر ہو سکتے تھے لیکن اسلام اور قرآن سے نہیں —— ہرگز نہیں۔ چنانچہ انہوں نے قرآن پڑھا اور قرآن کی وجہ سے عربی زبان بھی سیکھنے اور پڑھنے پر اپنے آپ کو مجبور پایا۔

وحدت اسلامیہ پہلے ہی قرآن پر قائم تھی اور گو حالات و ظروف کچھ ہوں اگر عرب وحدت کے لیے کوشاں ہیں تو آج بھی اس وحدت کی اساس قرآن ہی کو بنایا جا سکتا ہے

اب ہم پھر نفس قرآن کو زیر بحث لائیں گے اور بعض سورتوں کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کریں گے۔

مثلاً قرآن میں حضرت نوح ؑ اور ان کی قوم کا قصہ دیکھیے جو سورۂ ہود میں بیان ہوا ہے یہ قصہ پوری تفصیل کے ساتھ قرآن نے بیان کیا ہے۔ معانی کو اس طرح ادا کیا ہے کہ نہ طول کلام سے کام لیا ہے نہ غیر ضروری اختصار سے۔ جہاں اطناب کی ضرورت ہے وہاں اطناب ہے جہاں ایجاز کی ضرورت ہے وہاں ایجاز سے کام لیا ہے۔

قصے کا آغاز دیکھیے۔ کس طرح اس واقع کی منظر کشی کی ہے کہ ایک شخص اپنی قوم کو خدا سے ڈراتا ہے۔ اس کی قوم اس کا انکار کرتی ہے اور اس سے برسر پرخاش ہو جاتی ہے۔ طرفین کے انکار وانذار میں برابر شدت پیدا ہوتی جاتی ہے اور اس سارے ماجرے کو صرف چند آیتوں میں پوری جامعیت و اکملیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے

قرآن جب کوئی قصہ بیان کرتا ہے تو اس کے ایجاز رائع کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ وہ بعض ایسی کڑیاں چھوڑ دیتا ہے۔ جن کے بارے میں قاری یا سامع بطور خود سمجھ سکتے ہیں کہ کیا ہوا ہوگا؟ اس لیے کہ جن چیزوں کو چھوڑا ہے وہ اتنی لازمی اور طبیعی ہیں کہ ان کا سمجھ لینا ہر شخص کے لیے آسان ہے۔ مثلاً قوم نوح ؑ کو غرق کرنے کے لیے جب طوفان نمودار ہوتا ہے تو لازما ہے کہ قوم نوح ؑ کے افراد نے اس سے بچنے اور تحفظ کی پوری جدوجہد کی ہوگی اور اس باب میں کوئی دقیقہ

فروگذاشت نہیں کیا ہوگا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے اپنی جان بچالیں۔ لیکن ان کی یہ سعی و کوشش رائگاں گئی۔ کوئی چیز بھی انہیں غرق ہونے سے نہ بچا سکی۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ جب کسی محکوم کو سزا دینے کا تہیہ کر لیتا ہے تو پھر اس کے لیے کوئی جائے اماں اور پناہ گاہ باقی نہیں رہتی۔ اس کی سعی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی اور اللہ سے کوئی بھی اسے نہیں بچا پاتا۔

لیکن قرآن نے یہ ساری کڑیاں چھوڑ دی ہیں۔ اس نے یہ بالکل نہیں بتایا کہ غرق ہونے والوں پر کیا گزری؟ نہ یہ بتایا ہے کہ ان کی سعی و کوشش کا پیمانہ کیا تھا؟ صورت کیا تھی؟ نہ یہ بتایا ہے کہ اس سلسلے میں انہیں کن کن تکلیف دہ اور روح فرسا حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ نہ یہ بتایا ہے کہ نوحؑ کی دعوت رد کر کے اور ان کا پیام قبول نہ کر کے قوم پر احساس ندامت کی کیا صورت اور کیفیت تھی؟ ان باتوں میں سے ایک بات بھی بیان نہیں کی ہے۔ قصہ سفینۂ نوح سے چلا ہے۔ وہ اصحاب نوح کو لے کر پہاڑ جیسی موجوں پر تیرتا ہوا روانہ ہوتا ہے۔ نوحؑ اپنے اصحاب کی جماعت میں جو عذاب سے ڈر کر سفینے میں آکر بیٹھ گئے تھے، اپنے بیٹے کو نہیں پاتے۔ دیکھتے ہیں کہ وہ کافروں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ وہ عذاب کی زد میں آجاتا ہے۔ وہ باپ کے بلاوے کو رد کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ایک پہاڑ پر جا کر پناہ لے گا۔ جو اسے سیل سے بچالے گا۔ نوحؑ کوشش کرتے ہیں کہ اسے قائل کریں۔ لیکن دونوں کے درمیان موج حائل ہو جاتی ہے اور وہ دوسرے کافروں کے ساتھ غرق ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اس قصے میں قرآن نے یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ سیلاب کا پانی زمین پر کتنے دن تک ٹکا رہا۔ اور سفینۂ نوحؑ کتنے روز تک امواج متلاطمہ سے کھیلتا رہا۔ یہاں تک کہ کوہ جودی پر پہنچ گیا۔

ان میں سے کوئی بات بھی قرآن نے نہیں بتائی ہے ان سب باتوں کو سامع یا قاری کے فہم پر چھوڑ دیا ہے۔

اس اختصار اور ایجاز نے قصے کو اتنا ہولناک اور موثر بنا دیا ہے کہ اگر یہ داستان پوری تفصیل سے بیان کی جاتی تو بھی یہ کیفیت نہ پیدا ہوتی۔

غرض نوح کا پورا قصہ اس ایجاز و اختصار، لیکن جامعیت اور اثر آفرینی کی پوری شدت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے کہ یہ قصہ ایک غیبی خبر ہے جس سے آپ ؐ کی قوم نا واقف تھی۔ اور آپ ؐ بھی لاعلم تھے۔ قریش کو طوفان نوح کا پورا ماجرا اب نزول وحی کے بعد معلوم ہوا۔ اور اس کے بعد اپنے نبی ؐ کو حکم دیا ہے کہ آپ ابھی اپنی قوم کے اعراض اور بے رخی پر اسی طرح صبر فرمائیں۔ جس طرح نوح نے کیا تھا۔ اور اس کی ایذا رسانی کو اسی طرح برداشت کریں۔ جس طرح نوح ؑ نے کیا تھا۔ انجام آپ ہی کے حق میں ہوگا۔ کہ خدا سے ڈرنے والوں کا انجام ہمیشہ بخیر ہوتا ہے۔ فرمایا۔ اور ایجاز و بلاغت کی پوری شان کے ساتھ فرمایا۔

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ	یعنی:
نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ	یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم نے (اے محمدؐ) آپ
تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ	پر وحی کی ہیں۔ ان سے نہ آپ واقف تھے
مِنْ قَبْلِ هٰذَا فَاصْبِرْ اِنَّ	نہ آپ کی قوم پس صبر کیجیے بے شک خدا سے
الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝	ڈرنے والوں کا انجام بخیر ہوتا ہے!

قرآن مجید کی ایک اور خصوصیت خاصہ یہ ہے کہ اس میں کئی ایسی سورتیں ہیں۔ جن میں کثیر موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے اور ان موضوعات کا ربط و تعلق خاصا متباعد ہے۔ ان کے خواص اور اسلوب میں شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی نسق کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔

مثلاً سورۃ بقر میں متعدد اور متباین موضوعات ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ سورۃ ایک ہی مرتبہ میں ——— بعض دوسری سورتوں کے برعکس ——— نازل نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہی ہے

: اس کا آغاز ان مومنین کے ذکر سے ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں۔ راہ خدا میں انفاق کرتے ہیں۔ رسول اللہ

ﷺ اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء ماقبل پر جو کچھ نازل ہوا ہے۔ اس پر رکھتے ہیں۔ یوم آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ حساب اور ثواب و عقاب کو مانتے ہیں۔

: پھر ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے کفر کیا اور ان کے قلوب پر خدا نے مہر لگا دی اور ان کے لیے عذابِ عظیم لکھ دیا۔

: پھر منافقین کا ذکر ہے جو زبان سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن حقیقتہً مؤمن نہیں تھے۔ جو اللہ کو بھی دھوکا دیتے تھے اور مسلمانوں کو بھی۔ حالانکہ درحقیقت خود فریبی میں مبتلا تھے۔ ان کا دل روگی تھا اور اللہ ان کا روگ برابر بڑھا رہا تھا۔ اور ان کے لیے عذاب الیم نقص ایمان اور معصیت کے باعث مقرر کر دیا تھا۔

: اس میں آغاز خلق، نیز خلق آدم، قصۂ ابلیس، سجدۂ آدم سے اس کا انکار اور جنت سے نکالا جانا۔ آدم اور ان کی بیوی کا اغوا، اور ان دونوں کا اس درخت میں سے کھا لینا جس کے قریب جانے سے منع کیا گیا تھا۔ آدمؑ کا جنت سے اخراج، ان کی توبہ اور اللہ کی طرف سے عفو کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

: پھر یہود کا ذکر ہے اور پوری طوالت کے ساتھ ہے۔ ان کے اخبار و احوال بھی پوری تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں مسلمانوں کے ساتھ ان کا برتاؤ اور آں حضرتؐ کے ساتھ ان کا سلوک، ان سب چیزوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

: بعد ازاں قصہ ابراہیمؑ بیان ہوا ہے۔ جب وہ اپنی ذریت کے ساتھ وادی غیر ذی زرع میں اترے جب مکے میں انہوں نے خانہ کعبہ بنایا۔

: پھر تحویل قبلہ کا ذکر ہے۔ جب بیت المقدس کے بجائے مسجد حرام کو قبلہ قرار

دیا گیا۔

: پھر صفا اور مروہ کا ذکر ہے اور انہیں شعائر الٰہی میں سے بتایا گیا ہے۔

: پھر قیامت کے دن کافروں کے حساب کتاب کا ذکر ہے۔

: تشریع قصاص کا ذکر ہے

: وصیت کے بعض احکام بیان ہوئے ہیں

: تشریع صیام اور صیام رمضان کا خاص طور پر بیان فرمایا گیا ہے

: پھر اہلہ (ہلال) کے بارے میں سوال اور اس کا جواب مذکور ہے۔

: امر قتال، امر حج اور مشرکین مکہ سے معاہدات کا حال مذکور ہوا ہے۔

: پھر شراب کا امر معصیت ہونا اور جوئے کا گناہ ہونا بیان کیا گیا ہے

: پھر زواج، طلاق، میاں بیوی کے تعلقات، مطلقہ عورت کی عدت، ماؤں کے دودھ پلانے اور شوہروں پر حق ارضاع اور ماں کے علاوہ دوسری عورتوں سے استرضاع، دودھ پلانے والیوں کے حقوق آیار و اطفال پر ـــــــ یہ احکام بیان ہوئے ہیں۔

: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا اعلان

: ربا (سود) کی حرمت اور اس کی تحریم میں تشدد اور سختی۔

: لین دین کے معاملات لکھ لینے کی ہدایت اور گواہی کرا لینے کا حکم۔

: کتمان شہادت کی مذمت کا بیان۔

: ختم سورۃ پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ایمان باللہ و ملائکہ و کتب و رسل کا ذکر۔

اس ایک سورۃ میں اتنے سارے موضوعات کا بیان ظاہر ہے حسب اقتضائے حالات ظروف و حیات ہی ہو سکتا تھا۔ لہذا لازمی تھا کہ اس کا نزول رفتہ رفتہ ہوتا۔

گمانِ غالب یہ ہے کہ جن سورتوں میں اتحادِ موضوع پایا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ پوری کی پوری نازل ہوئی ہیں۔ رفتہ رفتہ کرکے نہیں اتری ہیں۔

مثلاً سورۃ یوسف اس کا موضوع ایک ہی ہے اور صرف قصہ یوسف تک محدود ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ پوری کی پوری ایک ساتھ نازل ہوئی۔

اسی طرح سورۃ ہود کے بارے میں کہا جاسکتا ہے۔

یہی کیفیت سورۃ انفال کی ہے۔

یہ سورۃ غزوۂ بدر کے موقع پر نازل ہوئی اور اس میں قریش کے کفر و مکر کے سوا کچھ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ غزوۂ بدر کی صورت میں ظاہر ہوا۔

غرض سارے قرآن کریم میں یہی صورت نظر آئے گی

ہر وہ سورت جس کا موضوع ایک ہے۔ یا اس کے موضوعات میں یکسانیت ہے۔ یا جس میں نسق و ترتیب کا اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ تو ترجیح اس خیال کو ہے کہ وہ پوری کی پوری ایک ساتھ نازل ہوئی ہے۔

اور ہر وہ سورۃ جس کے موضوعات مختلف اور متباعد ہوں۔ ان میں یکسانیت نہ ہو۔ نہ آیات میں نسق و ترتیب کا اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہو ان کے بارے میں ترجیح اس خیال کو ہے کہ وہ رفتہ رفتہ کرکے مختلف اوقات میں اختلاف و ظروف و احوال کے مطابق نازل ہوئی ہیں۔

اور یہ پورا قرآن اللہ تبارک و تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ یہ اپنی روح اور اپنے اعجاز کے اعتبار سے واحد ہے۔ خواہ اختلاف تنزیلِ سور اور اختلاف موضوعات سور کی نوعیت و کیفیت اور اس باب میں اقوال و تصورات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ بلکہ یہ بھی قرآن کے دلائل اعجاز میں سے ایک دلیل ہے۔ کیونکہ قرآن ایک مستقل اکائی ہے۔ وہ ہمیشہ ایک معین اصول کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یعنی :

: توحید

: شرک خواہ کسی صورت میں ہو مذموم و مردود۔

: محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے لائے ہوئے قرآن پر ایمان۔

: محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء آئے۔ اور جو کتابیں لائے ان پر ایمان۔

: بعث اور حیات آخرت پر ایمان

: ایمان والوں کے لیے ثواب و نعیم پر اور کفر کرنے والوں کے لیے عذاب و جحیم پر ایمان۔

: جملہ رذائل سے خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے اجتناب کا حکم

: قرآن جس زندگی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ رذائل سے اجتناب اور حسنات پر عمل کی زندگی ہے اس زندگی کو اختیار کرنے والے لوگ، ماں باپ کے ساتھ احسان کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ ایمان کے معاملے میں ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن دنیاوی زندگی ان کے ساتھ حسن سلوک اور خدمت کی بسر کرتے ہیں۔ عزیزوں اور رشتے داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ یتیموں اور مسکینوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ فقراء اور ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں۔

اور ان سب باتوں کے لیے اور ان جیسی دوسری باتوں کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں احکام اور شریعات کا بیان فرمایا ہے

سورۃ فجر میں اللہ تعالےٰ نے " نفس مطمئنہ " کا ذکر کیا ہے

یہ نفس مطمئنہ کیا چیز ہے ؟ ـــــ جس کے لیے جنت کی بشارت ہے ؟

بلاشبہ یہ نفس مطمئنہ وہ ہے جو اپنے ایمان میں صادق ہو جیسے اللہ اور اس کے رسولؐ پر کامل ایمان ہو، کتب آسمانی، ثواب اور عتاب پر ایمان ہو جس کی اللہ کے ساتھ "صلح" ہو ۔ معصیت کا ارتکاب کرکے خفیہ یا علانیہ جو خدا سے جنگ آزمانہ ہو۔

اور دوسرے نفوس جنہیں نفوسِ مطمئنہ کے ضمن میں نہیں شمار کیا جا سکتا، کون ہیں ؟

یہ نفوس ہیں جو اپنے ایمان پر مطمئن نہیں ہیں۔ نہ ان ہدایات اور احکام و اوامر پر قائم ہیں جو دیے گئے ہیں۔ یہ بہ ظاہر امن پسندی کا اظہار کرتے ہیں حقیقتہً جنگ کی خواہش چھپائے رکھتے ہیں۔ اسلام تو ان کی زبان پر ہوتا ہے اور کفر دل میں۔ یہ معصیت کے ارتکاب میں جری ہوتے ہیں۔ سیئات بے دھڑک ان سے سرزد ہوتے ہیں۔ خواہشات کے سامنے یہ سرنگوں رہتے ہیں۔ انہیں عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن یہ جفاکاری کے خوگر ہوتے ہیں۔ انہیں نیکی اور پاکبازی کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن یہ معصیت میں مصروف رہتے ہیں۔ انہیں طاعت کا حکم دیا گیا ہے لیکن نافرمانی میں بسر کرتے ہیں۔

یہ نفوس خفیہ یا علانیہ خدا سے برسرِ جنگ ہیں۔ لوگ ان کے بارے میں دھوکا کھا سکتے ہیں لیکن اللہ ان کی خیانت چشم اور دل کی پوشیدہ باتوں سے واقف ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ـــــــ حسب روایت بخاری و مسلم ـــــــ حدیث ذیل میں یہی کیفیت بیان فرمائی ہے :

"زانی جب زنا کرتا ہے وہ مومن نہیں رہتا۔ چور جب چوری کرتا ہے وہ مومن نہیں رہتا۔ شرابی جب شراب پیتا ہے وہ مومن نہیں رہتا۔"

یعنی دوسرے الفاظ میں آپؐ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ انسان سے کسی حالت میں بھی ارتکاب کبائر ہو ہی نہیں سکتا، اگر اللہ اور اس کے رسول پر اور ثواب و عقاب پر اس کا ایمان کامل ہو، اگر انسان کا یہ ایمان کامل ہو تو قطعاً وہ خواہش سے کنارہ کش رہے گا۔

ان تمام باتوں کی طرف قرآن میں اللہ تعالیٰ نے پوری تفصیل کے ساتھ دعوت دی ہے

ترغیب سے بھی کام لیا ہے اور ترھیب سے بھی اور تخویف سے بھی ان لوگوں کے لیے جو نفس کے دھوکے میں آ گئے۔ اور حیات دنیا کی رعنائی نے جنہیں اسیر کر لیا۔ اور وہ اس کے چکر میں گرفتار ہو گئے۔ پس اس باب میں کوئی غرابت نہیں ہے کہ اختلاف موضوعات اور اختلاف مقامات کے سلسلے میں قرآن سے متعلق لوگوں کے مذاہب و مسالک مختلف ہیں۔ البتہ اس باب میں غرابت ضرور ہے کہ تشریع و موعظت تبشیر و انذار اور موعظت و ملامت میں مذہب واحد کا التزام قائم ہے۔

یہ تنوع دراصل تنوع موضوعات و مقامات پر مبنی ہے جسے اصحاب علم بیان مطابقت بہ مقتضائے حال کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ پس قیامت کا ڈراوا اور اس میں جو ہولناکیاں ہوں گی، "یوم حساب" اور اس میں جو شدت ہوگی۔ مقتضی ہے اس امر کا کہ یہ ذکر پوری قوت بیان کے ساتھ ہو تاکہ قلوب سہم جائیں اور ان پر دہشت طاری ہو جائے اس دہشت خیز انذار شدید کی مثالیں قرآن میں بکثرت ملتی ہیں۔

قرآن کریم میں آپ سورۃ تکویر، انفطار اور انشقاق کا مطالعہ کیجیے۔

دیکھیے، ان چھوٹی چھوٹی آیتوں میں کیسی بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح بعض طویل اور مختصر سورتوں میں وہ آیتیں پڑھیے جن میں یوم حساب کا، اور اس دن مجرمین کے لیے ہول کا اور مومنین کے لیے امن کا جو عالم بیان کیا گیا ہے۔ اسے پڑھیے، آپ دیکھیں گے جہاں شدت بیان کی ضرورت ہے وہاں پوری شدت ہے اور جہاں لینت کلام کی ضرورت ہے وہاں پوری لینت سے کام لیا گیا ہے۔ آپ محسوس کریں گے جیسے مجرمین کے لیے جو ہولناکیاں تیار کی گئی ہیں بہ چشم خود انہیں دیکھ رہے ہیں۔ اور مومنین کے لیے جن انعامات کا وعدہ کیا گیا ہے وہ آپ کے سامنے موجود ہیں۔ آپ پر بہ یک وقت خوف اور رغبت، دہشت اور امن کی کیفیت طاری ہوں گی۔ اور قرآن میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ ترہیب و ترغیب کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہو۔ زیادہ تر دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور۔ ترہیب و ترغیب کے اس

اجتماع کا راز اور مقصد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے کافروں کو اس وقت تک مایوس نہیں کرنا چاہتا جب تک باب امید کھلا ہوا ہے۔

کافر کے سامنے جب قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اور گویا انہیں بچشم خود دیکھ رہا ہوتا ہے۔

اس کے داہنے جانب جنت ہوتی ہے جس میں امن و نعیم ہے اور بائیں جانب دوزخ ہے جس میں ہول اور عذاب ہے اور اسے ان دونوں میں سے کسی ایک کے لے لینے کا اختیار ہے۔

اللہ تعالیٰ خطا کار اور عصیاں شعار مومنوں کو بھی اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا۔ اس کے لیے زشت کاری کی سزا دوزخ ہے۔ اور اگر توبہ کرلے تو جنت!

اللہ نے کافروں اور عصیاں شعار مومنوں کے لیے بار بار بیان فرمایا ہے کہ وہ بڑا مغفرت کرنے والا اور بڑا رحیم ہے۔ یہ کہ اس کی رحمت ہر چیز پر حاوی ہے اور اس کی رحمت کی طرف جو راستہ جاتا ہے وہ ہے کافر کے لیے ایمان اور مومن کے لیے توبہ واصلاح احوال، دونوں کو پورا پورا اختیار ہے کہ ان دونوں میں سے جسے چاہیں اختیار کرلیں۔

اگر میں قرآن کے فنون اعجاز اور مذاہب بیان میں سے ہر مذہب کی تفصیل کرنا چاہوں تو یہ گفتگو شاید کبھی ختم نہیں ہو سکے گی۔ اس کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جائے گا لیکن قرآن ہر شخص کے سامنے ہے۔ ہر ذی بصیرت اسے پڑھ کر اور اس کے سور و آیات پر توقف و تفکر اور تدبر و تامل کر کے خود بہت کچھ جان لے سکتا ہے۔ اور قرآن کے وصف و اعجاز کو اگر میں بیان بھی کرنا چاہوں تو کس طرح کر سکتا ہوں؟

اعجاز قرآن ایک ایسی چیز ہے۔ جس کا شعور صرف قلب کو ہو سکتا ہے۔ جس سے صرف نفس و ضمیر ہی معمور ہو سکتے ہیں۔ اس کا وصف بیان کرنے سے قلم اور زبانیں یکسر قاصر ہیں۔

اب اس گفتگو کو ختم کر کے میں اسلام کی اصلِ ثانی یعنی سنت نبوی ؐ کو زیرِ بحث لاؤں گا۔

(۳)

سُنّت

○

قرآن کے بعد سنّت نبویؐ احکامِ اسلام کی اصل ہے

میں اس بات کی طرف کتاب کے شروع میں اشارہ کرچکا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر بشیر و نذیر اور شاھد بنا کر بھیجے گئے تھے اور خدائے یکتا کی طرف دعوت دیتے تھے آپؐ سراج منیر تھے جیسا کہ اللہ عز و جل نے سورۂ احزاب میں فرمایا ہے ر

اب میں اس باب میں یہ بتاؤں گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ——— قول یا فعل ——— سے جو کچھ ثابت ہو۔ وہ درحقیقت آپ ؐ کا خلاصۂ تبشیر و انذار و شہادت و دعوت الی اللہ ہے۔ میں یہ بھی بتاؤں گا۔ جیسا کہ آغاز کتاب میں اشارہ بھی کرچکا ہوں کہ آپ ؐ معلم تھے۔ جب آپ ؐ مبعوث ہوئے اس وقت سے رفیقِ اعلیٰ کا جوار اختیار فرمانے وقت تک آپ کی حیثیت تمام تر معلم ہی کی رہی۔ آپ ؐ مسلمانوں کے سامنے قرآن کی تلاوت فرماتے تھے اور جہاں تفسیر کی ضرورت ہوتی تھی اس کی تفسیر بھی فرماتے تھے آپؐ قرآن کے مجمل کی تفصیل بیان فرماتے تھے آپؐ لوگوں کو وہ احکام الٰہی بھی بتاتے تھے۔ جو آپ کے لیے نازل ہوتے تھے۔ مثلاً اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپؐ بندوں کو بتا دیں کہ اللہ تعالیٰ بڑا مغفرت کرنے والا اور بڑا رحیم ہے جیسا کہ سورۂ

حجر میں فرمایا ہے :

نَبِّئْ عِبَادِیْ اَنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ۝	یعنی : اے محمدؐ میرے بندوں کو خبر دے کہ میں بڑا مغفرت کرنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہوں اور میرا عذاب عذاب الیم ہے۔

اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو یہ حکم بھی دیا کہ اگر لوگ خدا کے بارے میں سوال کریں تو اس کے بندوں کو بتا دیں کہ وہ ہر شخص سے بہت قریب ہے۔ جب کوئی اسے پکارتا ہے۔ تو وہ جواب دیتا ہے جیساکہ سورۃ بقر میں فرمایا ہے ۔

اللہ نے آپ کو یہ حکم بھی دیا کہ جو بندے ارتکاب گناہ کرکے اپنے اوپر ظلم کر چکے ہیں انہیں بتادیں کہ اس کی رحمت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ وہ تمام گناہ بخش سکتا ہے اس لیے کہ غفور(۱) اور(۲) رحیم ہے۔ جیساکہ سورۃ زمر میں ارشاد ہوا ہے۔

قرآن کی بہت سی آیتوں میں اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ اس کے بندوں کو ایسی بہت سی چیزیں بتا دیں۔ جن کے بارے میں وہ چاہتا تھا کہ بندے جان جائیں۔ عام اس سے کہ وہ خیر کا حکم ہو یا شر کی ممانعت یا تثبیت قلب یا یاس و قنوط سے عصمت۔

کبھی ایسی چیزوں کو بھی بتانے کا حکم ہوتا تھا جن میں نہ کوئی امر ہے نہ نہی نہ تثبیت قلوب، مجرد علم ہے۔ جیساکہ سورۃ کہف میں ارشاد ہوا ہے :

قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ ،	یعنی: (اے محمد) کہہ دیں کہ اگر کلمات الٰہی (لکھنے کیلئے) سمندر روشنائی بن جائیں۔ تو کلمات الٰہی ختم ہونے سے پہلے وہ ختم ہوجائیں گے۔

ان آیات میں نہ کوئی حکم دیا ہے نہ کسی کام سے منع کیا ہے نہ تثبیت قلوب کی ہے۔ نہ

یاس وقنوط سے روکا ہے۔ بلکہ صرف یہ بتایا ہے کہ خدا کا کلام ازلی اورابدی ہے نہ اس کا احصاء کیاجاسکتا ہے۔ نہ انقضاء،

غرض اللہ کا حکم آپ کو یہ تھا کہ جو کچھ نازل ہو۔ وہ لوگوں تک پہنچادیں۔ اوراس میں کسی طرح کی کمی یا زیادتی نہ کریں۔ نیز لوگ جس بات کی وضاحت کے طالب ہوں اس کی وضاحت کردیں۔

۴

سنّتِ نبویؐ

ایمان ——— اسلام ——— احسان

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں لیکن قرآن میں یہ نہیں بیان کیا ہے کہ نماز کس طرح پڑھی جائے؟ اوقات نماز کیا کیا ہیں؟ ہر نماز میں رکعتیں کتنی ہیں؟ ان امور کی وضاحت آپؐ نے اس علم سے کی جو خدا نے آپؐ کو القا کیا تھا۔ آپؐ نے فرائض، واجبات، مستحبات اور نوافل ادا کرکے بتا دیے۔ اس زکات کا نصاب کیا ہو؟ وہ کس طرح وصول کی جائے۔ یہ ساری باتیں بھی برت کر بتادیں اور دکھادیں۔ اسی طرح صوم اور حج وغیرہ کے سلسلے میں مجملات قرآن کی تفصیل بیان فرمادی

پس یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ سب سے پہلے آپ مفسر قرآن تھے اور یہ تفسیر آپؐ قول سے بھی کرتے تھے اور عمل سے بھی۔ چنانچہ کتب حدیث میں قرآن کی سورت یا آیت کی مناسبت کے لحاظ آپؐ کے اقوال واعمال مروی ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان اور اسلام کا ذکر اکثر آیات میں ساتھ ساتھ کیا ہے دونوں

ہیں کوئی فرق نہیں کیا ہے دونوں ــــــــ اسلام اور ایمان ــــــــ صورتوں میں اقامت صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، جہاد فی سبیل اللہ، عمل خیر، احکام الٰہی کی تعمیل۔ اور منہیات سے اجتناب کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

سورۃ احزاب میں فرمایا ہے:۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَ	یعنی:
الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ …	مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں، مومن مردوں
……………………	اور مومن عورتوں ……………………
اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّ اَجْرًا	(کے لیے) اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم کا
عَظِیْمًا ○	سامان تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں مومنین کا مسلمین پر عطف کیا ہے اور اس عطف میں یہ اشارہ ملتا ہے۔ کہ اسلام اور ایمان کے مابین کچھ نہ کچھ اختلاف ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ اختلاف تناقض اور تغائر پر مبنی ہو۔ بلکہ ممکن ہے کہ یہ اختلاف کسی حد تک کمی یا زیادتی پر مبنی ہو۔

پھر ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے اسلام اور ایمان کے فرق کی وضاحت بھی فرمادی ہے۔ جو کسی طرح کے نزاع کو متحمل نہیں ہے۔ سورۃ حجرات میں ارشاد ہوا ہے:۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ط قُلْ	یعنی:
لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا	یہ اجڈ عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔
اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ	آپ (اے محمدؐ) فرمادیں کہ تم ایمان تو نہیں لائے
الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَاِنْ	لیکن یوں کہو کہ ہم (مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہو
تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَا	گئے اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں
یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا ط	داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے
اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ الرَّحِیْمٌ ○	رسولؐ کا کہنا مان لو تو اللہ تعالیٰ تمہارے

اعمال میں سے ذرا بھی کمی نہیں کرے گا بیشک
اللہ بڑا مغفرت کرنے والا اور بڑا رحیم
کرنے والا ہے۔

گویا اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ :۔

: جن اعراب نے اعلان کیا کہ ہم ایمان لے آئے ۔ ان کے بارے میں اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ ان سے فرما دیں کہ وہ صاحب ایمان نہیں ہیں۔

: البتہ اس کی اجازت ہے کہ اپنے آپ کو مطیع (مسلمان) کہیں۔

: پھر انہیں بتایا کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے لگیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال میں ذرا بھی کمی نہیں کرے گا۔ بلکہ ان کے عمل کے مطابق پورا پورا اجر قیامت کے دن انہیں دے گا۔

: یہ کہ اللہ تعالیٰ بڑا مغفرت کرنے والا اور بڑا رحیم ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مؤمن اور مسلم دونوں پائے جاتے تھے۔
مگر ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے ؟

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے۔ وہ اس آیۂ کریمہ سے ظاہر ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے جس کا قوام اخلاص دین ہے۔ جو دل کی گہرائی میں موجود ہو۔ وہ عبارت ہے استقرار تصدیق خدا اور رسول سے۔ اور اس ایمان کا نتیجہ ہر معاملے میں خدا و رسول کی استجابت ہے۔ خواہ حالات و حوادث کیسے ہی کٹھن اور نازک کیوں نہ ہوں۔ جس کی مثال میں جنگ احد پیش کی جا سکتی ہے۔

اور اس ایمان کے لوازم میں ایک لازمۂ خاص ذکر الہی کے وقت خوف عمیق ہے نیز خدا پر ناقابلِ شکست اعتماد اور تلاوت قرآن کریم کے موقعے پر ازدیاد تصدیق۔ جیسا کہ

سورۃ انفال میں فرمایا ہے

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ،	یعنی: ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب سہم جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ (مضبوط) کر دیتی ہیں اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

غرض یہ ہے وہ ایمان جس کا مرقع سطور بالا میں ہم نے پیش کیا ہے۔

اب رہا اسلام:

تو اسلام عبارت ہے طاعت ظاہرہ سے۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول ص کے احکام کی اطاعت اور ممانعت کی تعمیل، واجبات کا ادا کرنا، اور محظورات سے بچنا۔ گویا اسلام نام ہے (نظام اسلامی کی) اطاعت کا۔ اگرچہ وہ ایمانِ صادق سے خالی ہو جس کی تعریف ان آیات کریمہ میں کی گئی ہے جنھیں ہم پیش کر چکے ہیں

بہت سے ایسے لوگ تھے جنہوں نے حالات کے تقاضے سے سہم کر اسلام قبول کر لیا تھا جیسے فتح مکہ کے موقعے پر "طلقاء قریش" نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان میں ایک خاص تعداد ان لوگوں کی تھی جو خوف و طمع کے باعث اسلام ان اعراب کی طرح لائے تھے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ حجرات میں فرمایا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ اسلام مرورِ زمانہ سے ایمان میں تبدیل ہو جائے جیسا کہ لفظ لَمَّا (ابھی تک) سے ثابت ہوتا ہے

وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ	ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔

اس بحث سے ثابت ہوا کہ ہر مومن مسلم ہے کیونکہ تصدیق عمیق کا حامل ہے اور طاعت ظاہرہ و باطنہ پر عامل ہے۔ لیکن ہر مسلم کو مومن نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اظہارِ اسلام کے بعد جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں۔ آدمی کی جان و مال کا تحفظ ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر مواقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منافقین اور مشرکین کے قتل کی اجازت طلب کی گئی۔ تو آپ نے یہ اجازت دینے سے انکار فرمایا اور ارشاد کیا:

"میں لوگوں کے دل کھرچنے پر مامور نہیں کیا گیا ہوں۔"

یعنی لوگوں کی زبان پر جو کچھ ہے۔ اس کا اعتبار کروں گا۔ دل میں کیا ہے؟ اس کا تجسّس نہیں کروں گا۔

اس بحث سے یہ ثابت ہوا کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ اور اس نظریے پر دلیل لانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال میں یہ فرمایا ہے:

وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا

جب ان کے سامنے آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے

اور ظاہر ہے جو چیز بڑھ سکتی ہے۔ وہ گھٹ بھی سکتی ہے۔ چنانچہ حدیث شفاعت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے قیامت کے دن جب وہ اپنی امت کی شفاعت کر رہے ہوں گے۔ فرمائے گا۔

"جائیے، اور دوزخ سے اسے نکال لائیے جس کے دل میں تھوڑا سا بھی ایمان ہو۔"

اور آخر میں خدا اپنے نبیؐ سے فرمائے گا:

"جائیے اور دوزخ سے اسے نکال لائیے۔ جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہو۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلم تھے اور جملہ انبیاء مسلم تھے۔ لیکن انبیاء کا اسلام صرف طاعت

ظاہرہ پر مبنی نہ تھا۔ ان کا اسلام بہت وسیع، عمیق اور اصدق تھا۔ اسی طرح اصحاب نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا اسلام اعراب کی طرح تنگ نہ تھا۔ جو صرف طاعت ظاہری پر مبنی ہوتا۔ وہ بہت زیادہ وسیع اور عمیق تھا۔

چنانچہ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	یعنی:
مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ	آج کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے۔
وَاخْشَوْنِ اَكْمَلْتُ لَكُمْ	اس سے مت ڈرو۔ مجھ سے ڈرو۔ آج کے دن
دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ	میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت
نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ	تمام کر دی۔ اور تمہارے لیے دین اسلام پسند
الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ	کر لیا۔

نیز سورۂ آل عمران میں فرمایا ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ	یعنی:
الْاِسْلَامُ ؕ	اللہ کے نزدیک دین (صرف) اسلام ہے

اسلام اور ایمان کے علاوہ قرآن میں ایک تیسری چیز "احسان" کا بھی ذکر آیا ہے۔

سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ	یعنی:
الْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي	بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان اور
الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ	قرابت مندوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور کھلی برائی
وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ	اور مطلق برائی اور ظلم کرنے سے منع کرتا ہے
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝	اللہ تعالیٰ تمہیں اس لیے نصیحت کرتا ہے کہ تم

نصیحت قبول کرو۔

اسی طرح سورۂ آلِ عمران میں فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ط لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ○	یعنی جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے کہنے کو قبول کر لیا بعد اس کے کہ وہ (جنگ احد میں) زخمی ہوئے۔ ان لوگوں میں جو حسنِ عمل اور تقویٰ کے حامل ہیں ثواب عظیم ہے۔

بہت سی آیتوں میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:

لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ○	یعنی اچھے کام کرنے والوں کا اجر خدا ضائع نہیں کرے گا۔

کہیں فرمایا ہے:

یَجْزِ الْمُحْسِنِیْنَ ○	اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔

کہیں ارشاد ہوا ہے:

یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○	اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

یہ تمام الفاظ "احسان" پر دلالت کرتے ہیں۔

اور احسان کی تعریف کیا ہے؟

احسان یہ ہے کہ انسان طاعتِ الٰہی میں زیادہ سے زیادہ جد وجہد کرے۔ کسی طرح کے کسل کوتاہی اور غفلت کو کام میں نہ لائے۔ بلکہ دل وجان اور اعضا وجوارح سے فریضۂ طاعت بجا لانے میں پورا پورا کام لے۔

پس قرآن میں یہ تین کلمات ——— اسلام، ایمان، احسان ———

بکثرت استعمال ہوئے ہیں اور ان کے معنیٰ میں بڑی حد تک تقارب ہے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم نے طلحہ ابن عبید اللہ سے ایک حدیث روایت کی ہے ایک شخص نے آپؐ سے اسلام کے بارے میں سوال کیا۔ آپؐ نے ارکانِ خمسہ اسے بتا دیے۔ اس نے جاتے وقت کہا:

"خدا کی قسم (ان پانچ ارکان کے سوا) نہ زیادہ کروں گا نہ کم۔"

آپؐ نے فرمایا۔

"اگر سچ کہا تو کامیاب ہوا۔"

اسی طرح ابوھریرہ کی ایک حدیث بخاری و مسلم نے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور پوچھا:

ایمان کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

"ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، قیامت کے دن اس کے دیدار پر، اس کے رسولوں۔ اور بعث پر ایمان رکھے۔"

اس شخص نے پوچھا۔

"اور اسلام کیا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"اسلام یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کر۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر۔ نماز قائم کر، زکاتِ مفروضہ ادا کر، رمضان کے روزے رکھ۔"

اس شخص نے دریافت کیا۔

"احسان کیا ہے؟"

آپ نے فرمایا:

"اللہ کی اس طرح عبادت کر جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ

رہا ہے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔"

اس شخص نے پھر سوال کیا۔

"قیامت کب آئے گی۔"

آپؐ نے فرمایا:

"جس سے سوال کیا جا رہا ہے (اس بارے میں) اس کا علم سائل سے زیادہ نہیں ہے.........!

۵

تعلیمات و بیان سنّت

تطہیرِ اخلاق ، تزکیۂ رُوح ، تنقیۂ کردار ،

بخاری اور مسلم میں ایک حدیث عبداللہ بن عمر رض کی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے ارکانِ خمسہ بیان کرتے ہوئے فرمایا :

" اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے :

(۱) اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں

(۲) نماز کا قائم کرنا ۔

(۳) زکات (مفروضہ) کا ادا کرنا

(۴) (بشرطِ استطاعت) حج کرنا

(۵) ماہ مبارک رمضان کے روزے رکھنا ۔

لیکن بہر حال ارکان و اعمال کی شرط قبول حسن نیت اور صدق ایمان ہے ۔ چنانچہ حضرت عمر سے مروی ہے اور ثقاۃ محدثین کا جس کی صحت پر اور علماء کا تواتر پر اجماع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

"اعمال کا دارو مدار نیت پر ہے۔ ہر شخص کے لیے اس کی نیت ہی اصل چیز ہے۔ پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی۔ پس اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ؐ کے لیے ہے اور جس کسی کی ہجرت حصول دنیا، یا کسی عورت سے شادی کے لیے ہوگی۔ اس کی ہجرت اس سلسلے میں شمار ہوگی جس کے لیے اس نے ہجرت کی ہے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فرائض اور اعمال خیر کی بجاوری کے سلسلے میں اخلاص نیت شرط صحت ہے اور نیت صرف زبان سے نہیں ہوتی۔ ضروری ہے کہ وہ دل کی گہرائی سے ہو۔ عام اس سے کہ انسان اسے زبان پر لائے یا نہ لائے۔

یہی وجہ ہے کہ منافقین کے اعمال غیر مقبول تھے۔ اور ان کے بارے میں خبر دے دی گئی تھی کہ وہ جہنم کے سب سے آخری طبقے میں ہوں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا:

اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ — یعنی:
إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ — آپ ؐ ان (منافقین) کے لیے مغفرت کی دعا
مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۝ — کریں یا نہ کریں۔ یا ستر مرتبہ دعائے مغفرت کریں
تو بھی اللہ ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔

اور آخرالامر آپؐ کو ان کی نماز جنازہ بھی پڑھانے کی ممانعت فرما دی۔ یہ اس لیے کہ یہ منافق زبان سے جو کچھ کہتے تھے وہ ان کے دل میں نہیں ہوتا تھا۔ ایمان کا اعلان کرتے تھے۔ اور دل میں کفر کو چھپائے ہوئے تھے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ایمان، اسلام اور احسان کے حقائق کی صرف تعلیم دینے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ان خصال کو اپنے عمل سے برتا۔

آپؐ نے صحابہ کو تعلیم دی کہ جو شخص اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کے

لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اپنے پڑوسی کو ایذا دے یا اپنے مہمان کے اکرام میں کمی کرے۔ آپ نے لوگوں کو یہ تعلیم بھی دی کہ مہمانی تین شب و روز کی ہوتی ہے اور اس سے زیادہ مہمان پر صدقہ ہے

آپ ان چیزوں کو بھی سکھاتے تھے جنہیں قرآن نے واضح طور بیان کر دیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے وضو اور تیمم کا ذکر فرمایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ:

: نماز کے لیے وضو کس طرح کیا جائے؟

: اگر آدمی ناپاک ہو تو غسل کرلے۔

: اگر وضو یا غسل کے لیے پانی نہ ملے یا پانی کا استعمال کسی بیماری کے باعث مضر ہو یا سفر کی حالت ہو تو جائز ہے کہ پاک مٹی سے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ کا مسح کر لیا جائے۔ یہ وضو اور غسل دونوں کے لیے کافی ہے۔

لیکن اس وضاحت شافی کے باوجود، نبی صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرکے لوگوں کو دکھاتے تھے کہ اس طرح وضو کیا جاتا ہے۔ تیمم کرکے لوگوں کو بتاتے تھے کہ یوں تیمم کیا جاتا ہے تاکہ آپؐ پورے طور پر اپنا فرض رسالت انجام دے لیں۔

: آپؐ لوگوں کو جسم، لباس اور مجالس کی پاکیزگی کا درس بھی دیتے تھے۔ بلکہ یہ بھی بتاتے تھے کہ پاکیزہ زندگی کس طرح بسر کی جائے؛ چنانچہ آپؐ ان لوگوں کو مسجد میں آنے اور نماز باجماعت میں شرکت سے منع کرتے تھے، جو پیاز اور لہسن کھا کر آیا کرتے تھے، اور بدبو پھیلایا کرتے تھے۔ تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے۔

: آپؐ لوگوں کو یہ بھی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ راستے صاف رکھیں۔ اور اگر وہاں کوئی اذیت رساں چیز پڑی ہو تو اسے ہٹادیں۔

: آپؐ اسے بھی سخت ناپسند کرتے تھے کہ کسی شخص کے پاس ضرورت سے

زیادہ پانی ہو اور وہ دوسرے ضرورت مندوں کو دینے سے انکار کر دے۔

: معاملات میں امانت کی آپؐ ترغیب دیا کرتے تھے۔

: لوگوں کو امانت واپس کرنے کی ہدایت کیا کرتے تھے۔

: بیع وشرا اور جمیع اقوال و اعمال میں آپؐ امانت کی ترغیب دیتے تھے۔

: نماز میں اعتدال کی تاکید فرماتے تھے۔

اور ان ارشادات میں آپ گویا فرمان الٰہی نافذ کرتے تھے۔ جیساکہ سورۃ نساء میں وارد ہوا ہے۔

: ائمہ، ولاۃ اور قضاۃ کو آپؐ خدا سے ڈرایا کرتے تھے کہ رعیت پر ظلم نہ کریں۔ ان کے ساتھ نرم خوئی اختیار کریں۔ ان کے معاملات کا تصفیہ کرتے وقت عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

یہ ارشادات بھی بالکل مطابق قرآن تھے۔ جیساکہ سورۃ نمل میں اس طرح کے احکام وارد ہوئے ہیں

: آپؐ کے نزدیک نقض عہد سے بری کوئی چیز نہ تھی۔

: حلف شکنی کو بھی آپؐ سخت ناپسند فرماتے تھے۔

سورۃ نحل میں ان باتوں سے اللہ تعالےٰ نے منع فرمایا ہے۔

: آپؐ بے انتہا باحیا تھے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

اَلْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ حیا ایمان کی شاخ ہے۔

: لوگوں کے چھوٹے بڑے اعمال بھی آپؐ کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھے۔ جو ان کی حیات عامہ اور خاصہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپؐ ان کے بارے میں بتاتے رہتے تھے کہ کس کام کا کرنا اچھا ہے؟ اور کسے ترک کر دینا بہتر ہے؟

: آپ لوگوں کو پند و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ اور جب لوگ پاس کے دروازے پر پہنچ جاتے۔ آپؐ انہیں اسید کے دروازے پر لاکھڑا کرتے۔ آپؐ اکثر اپنے صحابہ سے فرمایا کرتے تھے:

لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِکْتُم قَلِیْلًا وَلَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا ۝

یعنی: اگر تم جان لو جو میں جانتا ہوں تو ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔

: آپؐ ہر کام میں اعتدال کو پسند کرتے تھے۔

: دین میں غلو کو آپؐ ناپسند فرماتے تھے۔

: عبادت میں حد سے زیادہ تجاوز بھی آپؐ کو پسند نہ تھا۔

چنانچہ عمرو بن العاص کے بیٹے عبداللہ نے جب صوم دہر کا ارادہ کیا۔ تو آپؐ نے سختی سے روکا۔ اور فرمایا کہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے۔ تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے۔ اور جب انہیں بہت زیادہ مصر پایا تو ایک دن کے ناغے سے روزہ رکھنے کی اجازت دی اور فرمایا۔ یہ حضرت داؤدؑ کا روزہ ہے۔

: اسی طرح آپؐ نے اپنے ایک جلیل القدر صحابی عثمان بن مظعون کو راہبی اختیار کرنے یا بیوی سے بے تعلق ہو جانے سے منع فرمایا۔

: صحابہ کرام آپؐ کے ہر کام کی تقلید جوش و خروش اور ذوق و شوق سے کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپؐ کی تقلید میں بعض صوم وصال (مسلسل روزے) پر عامل رہنے لگے۔

آپؐ نے بڑی سختی سے انہیں باز رکھا اور فرمایا:

"میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ میرا رب مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔"

مطلب یہ کہ اللہ نے آپؐ کو صبر و برداشت کی جو قوت مرحمت فرمائی ہے دوسرے اس سے محروم ہیں

٦

سُنّت تادیب کے لیے

○

کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کا واقعہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بعض صحابہ پر تادیب کے خیال سے اور اس خیال سے کہ ان میں اور منافقین میں امتیاز رہے۔ ان کی کوتاہی اور لغزش پر شدید عقاب و عتاب بھی کرتے تھے۔

چنانچہ غزوہ تبوک میں تین صحابہ جن کا شمار اخیار میں تھا بچھڑ گئے۔ اور مدینہ سے باہر نہیں نکلے۔ ان کا یہ فعل منافقین سے ملتا جلتا تھا۔

اللہ اور رسول کو ان اخیار صحابہ کی یہ حرکت ناپسند ہوئی۔ اور ان کو نہایت سخت سرزنش فرمائی۔ جس کا مقصد ان کی تادیب اور دوسرے مومنین صادقین کی موعظت تھا۔ چنانچہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

کعب بن مالک انصاری اور دوسرے دو صحابہ کے واقعہ تخلف، اور تادیب و سرزنش کا قصہ پوری تفصیل کے ساتھ بخاری و مسلم نے درج کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مومنین صادقین کی لغزش پر دار وگیر فرماتے تھے، تاکہ ان کے دلوں کا تزکیہ اور ضمائر کا تنقیہ ہو جائے۔

کعب اور دوسرے دو صحابہ کا یہ قصہ اپنے اندر عبرت و موعظت کے بہت سے پہلو پوشیدہ رکھتا ہے۔

یہ تینوں حضرات غزوۂ تبوک شرکت کے لیے نہیں جا سکے۔ اور نہ جانے کا ان کے پاس کوئی معقول عذر بھی نہیں تھا۔

لیکن اس غزوے میں اور بھی بہت سے لوگوں نے شرکت نہیں کی تھی۔ جن کی تعداد بقول کعب ۸۰ سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے واپس تشریف لائے۔ تو یہ نہ جانے والے لوگ آپؐ کی خدمت میں آئے اور جھوٹے عذر پیش کرنے لگے۔ آپؐ نے ان کے عذرات قبول فرما لیے اور ان کے لیے استغفار بھی فرمایا۔ اس لیے کہ آپ ان جیسے لوگوں کے لیے ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ آپؐ لوگوں کے دل کھرچنے کے لیے مامور نہیں ہوئے تھے۔

لیکن یہ تینوں؟

یہ تینوں اللہ اور اس کے رسول پر پختہ ایمان رکھتے تھے۔ دونوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ یہ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ یہ جانتے تھے۔ منافقین کا دروغ آپؐ پر ظاہر ہے گو آپؐ نے انہیں سزا نہیں دی۔ انہوں نے سچ کو ترجیح دی۔ اور اس بات سے ڈرے کہ کہیں خدا ان کے جھوٹ کا پردہ فاش نہ کر دے۔ انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

آپؐ نے ان کی بات سنی اور اسے صحیح قرار دیا۔ لیکن معاف نہیں کیا۔ ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا کہ وہی فیصلہ کرے گا۔

جب تک خدا کے ہاں سے فیصلہ نہ ہو جائے مسلمانوں کو ممانعت کر دی گئی۔ کہ ان سے گفتگو بند کر دیں۔ سب نے بات چیت بند کر دی اور یہ سب سے منقطع ہو گئے۔

ان تینوں میں دو۲ نے خانہ نشینی اختیار کر لی۔ لوگوں کی پھری ہوئی نظریں ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں۔ یہ نمازیں گھر ہی میں پڑھتے تھے۔ اور وہاں پڑے پڑے رویا کرتے تھے

لیکن کعب میں جوانی کا دم خم تھا۔ وہ برابر گھر سے باہر نکلتے رہتے۔ بازار کا آنا جانا بھی جاری رکھا۔ لوگوں کی پھری ہوئی نظروں کو بھی برداشت کرتے گئے۔ گویا یہ خود بھی اپنے آپ کو سزا دینا چاہتے تھے۔

ایک مرتبہ یہ اپنے ابن عم کے پاس جو صحابی تھے گئے۔ اور ان سے تین مرتبہ سوال کیا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ میں اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہوں۔"

ابن عم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بہت الحاح اور اصرار کے بعد جواب دیا تو یہ کہ:

"خدا اور اس کا رسولؐ زیادہ جانتا ہے۔"

اور وہ اس کے سوا کوئی اور جواب دے بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تینوں سے خفا تھے اور۔ آپؐ کی خفگی خدا کی خفگی تھی۔

کعب برابر مسجد جاتے، نماز با جماعت میں شرکت کرتے۔ مجلس نبیؐ کے قریب نوافل پڑھتے تاکہ دیکھیں۔ آپؐ ان کی طرف دیکھتے ہیں یا نظر پھیر لیتے ہیں؟

کعب نے دیکھا۔ آپؐ ان کی طرف دیکھتے تھے۔ لیکن جب وہ آپؐ کی طرف دیکھتے تھے تو آپؐ نظر پھیر لیتے تھے

اور ایک روز آپؐ کا حکم صادر ہوا کہ اپنی بیویوں سے یہ تینوں علیحدگی اختیار کر لیں اور اس حکم میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ان کی بیویاں بھی مومنات تھیں۔ اور مومنین کو ان تینوں سے ترک تعلق کا حکم دیا گیا تھا۔ لہٰذا ان کی بیویوں کو بھی ان سے الگ رہنا ہی چاہیے تھا۔

کعب نے اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا۔

جب پچاس راتیں اس مقاطعے کو گزر گئیں۔ اور ان لوگوں کی ندامت پایۂ تکمیل کو پہنچ ئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔

اس واقعے نے تمام مسلمانوں میں مسرت کی لہر دوڑا دی۔ لوگ توبہ قبول ہونے پر انہیں

مبارک باد دینے آنے لگے۔

کعب تو اتنے خوش ہوئے کہ اپنا سارا مال صدقہ کرنے پر تیار ہو گئے۔ مگر آپؐ نے پورا مال صدقہ کرنے کی اجازت نہ دی۔ آخر انہوں نے اپنا روزینہ کا حصہ اپنے لیے رکھ لیا۔ باقی سب صدقہ کر دیا۔ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اس طرح نازل ہوئی تھی۔ جس طرح مُردہ زمین کو بارش حیاتِ نو سے آشنا کر دیتی ہے۔

ہم نے ایجاز و اختصار کے ساتھ بتایا ہے کہ آپ کی حیثیت اپنے اصحاب کے مابین بشیر و نذیر، شاہد و داعی اور مؤدب و معلّم دین کی تھی۔

پس سنت اگر قرآن کریم کے بعد رب کی اصلِ دوم ہے۔ تو اس پر حیرت کا مقام نہیں۔ مسلمان اپنی زندگی میں جب بھی مشکلات سے دوچار ہوں تو ان کے لیے ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ اپنا معاملہ اللہ اور رسول کو سونپ دیں۔ اس کا حل قرآن سے تلاش کریں اور قرآن میں حل مل جائے۔ تو وہ کافی ہے۔ نہ ملے تو پھر سنت نبوی میں تلاش کرنا چاہیے۔ کہ آپؐ کے قول یا عمل سے اس باب میں صحت کے ساتھ کیا ثابت ہے؟۔ اس لیے کہ آپ ہی اللہ کی طرف سے امت کی تعلیم پر مامور تھے۔

اگر مشکل کا حل نہ قرآن میں ملتا ہے نہ سنت میں۔ تو پھر مسلمانوں کو احکامِ دین کی اصل ثالث کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اور یہ اصل ثالث ہے اجماع صحابہ۔

اگر اصحاب نبی کا کسی بات پر اجماع ہے تو گمانِ غالب یہ ہے کہ وہ دو صورتوں سے خالی نہیں۔

۱ یہ اجماع صحابہ کسی ایسے قول یا فعل نبی پر مبنی ہے جو ہمارے علم میں نہیں آیا۔

۲ یہ اجتہاد صحابہ پر مبنی ہے۔ کیونکہ صحابہ خیار مسلمین یعنی مسلمانوں کے لیے شمعِ راہ ہیں

اور اگر مسئلہ کا حل نہ تو قرآن میں ملے، نہ سنت میں نہ اجماع صحابہ میں تو حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

۷

قرآن اور حدیث

صحابہ کا طرزِ عمل، اصول تصحیح حدیث، قبول روایت میں احتیاط

یہ حقیقت بہر حال پیش نظر رکھنی چاہیے کہ سنت کا معاملہ بہ نسبت قرآن کے کہیں زیادہ اختلافی ہے۔ ہمارے پاس قرآن متواتر طور پر پہنچا ہے جس پر جملہ افراد امت کا اجماع ہے اور یہ اجماع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے لے کر آج کے دن تک برابر قائم ہے اور اس کرۂ زمین پر جب تک مسلمان موجود ہیں قائم رہے گا۔ ۱۴ سو برس کی اس مدت میں متوارث طور پر ایک ہی آہنگ اور لفظ و عبارت کے ساتھ مسلمانوں کی نسلیں اور پشتیں اس کی تلاوت کرتی چلی آئی ہیں۔

مسلمانوں کے اپنی فکر و نظر کے سلسلے میں کتنے ہی فرقے کیوں نہ ہوں اور ان فرقوں کے مابین کتنا ہی اختلاف، افتراق اور انقسام کیوں نہ ہو۔ دین کے اصول و فروع کے بارے میں نیز متکلمین اور فقہا اور دوسرے مسالک فکر و نظر میں کیسے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں، قرآن سب کا ایک ہی ہے۔ اس کے الفاظ و عبارت سے متعلق مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ فہم نصوص اور اختلاف نے اسے ذرا ضرر نہیں پہنچایا ہے۔

لیکن سنت کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔

اس لیے نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کتابت کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ مروی ہے کہ کتابت سے منع فرمایا۔ لہذا سنت کی روایت میں اعتماد صرف حافظے پر کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ جن لوگوں کے حافظے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے ان کا شمار صالح مومنوں میں ہوتا ہے

صحابہ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت میں بہت تشدد برتا کرتے تھے۔ بلکہ کوئی حدیث اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک دو عادل مسلمان اس کی شہادت نہ دے دیں کہ انہوں نے نبی ؐ سے سنا یا آپ کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ حضرت عمر تو اس بارہ خاص میں اور زیادہ سخت تھے، وہ حدیث روایت کرنے والے کو سزا سے ڈراتے تھے۔ جب تک مسلمانوں سے شہادت سننے یا دیکھنے کی نہ مل جائے۔

لیکن زیادہ عرصے تک معاملات اسی نہج پر نہیں چل سکے، فتنے پیدا ہوئے۔ اور مسلمانوں میں اختلاف برپا ہوا۔ ایک نے دوسرے کی تکفیر کی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ایسی جماعتیں پیدا ہونے لگیں۔ جنہوں نے ظاہر کیا کہ دوسروں کے مقابلے میں وہ بہت زیادہ سنت نبی ؐ سے تمسک کرتی ہیں۔ ایسے قصہ خواں پیدا ہوئے جو مجالس وعظ میں ترغیب و ترہیب سے کام لیا کرتے تھے۔ اس طرح حدیثوں کی روایت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اور ان قصہ خوانوں نے ایسی بہت سی باتوں کی روایت شروع کر دی۔ جو آپ نے نہیں فرمائی تھیں۔ یہ لوگ فضائل اعمال کی رغبت دلاتے تھے۔ اور سیئات اعمال سے ڈراتے تھے۔ اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ کہ آپ کی طرف ترغیب و ترہیب کے لیے ایسی باتوں کی نسبت کر دیں۔ جو آپ نے نہیں فرمائی تھیں۔ ان لوگوں کا مقصد مسلمانوں کو نصیحت کرنا اور ان کی بھلائی کرنا تھا۔ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے مسلمانوں کے ناصح تھے۔ نیز آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر بھی۔ پس خیر کا ہر حکم اور شر کی ہر ممانعت کی یہ قصہ خواں بے تکلف آپ کی طرف نسبت کر دیتے تھے۔

◎

۸

روایتِ حدیث میں اسراف

روایت کے ساتھ درایت کی اہمیت

اس کے بعد اشرار کا گروہ پیدا ہوا۔

ان لوگوں کی نیت درست نہیں تھی۔ یہ روایت حدیث میں بہت زیادہ اسراف سے کام لیتے تھے۔ بہت زیادہ جھوٹ بولتے تھے۔ یہ رنگ دیکھ کر خیار مسلمین نے تصحیح حدیث کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ ان کا کام ہی یہ تھا کہ ان احادیث اور روایات کا تنقیہ کریں۔ ان میں جھوٹ اور شک کا شائبہ پایا جائے۔ ان لوگوں نے راویان حدیث کی زندگی کو کھنگالا ان کے معاملات کی جانچ پڑتال کی۔ جسے جھوٹ میں ملوث یا متہم پایا۔ یا جس کی سیرت راہ عدالت سے گریزاں پائی یا جس کا حافظہ کمزور دیکھا۔ یا جس کی روایت میں گھراپن نہ پایا یا جسے ایسے لوگوں سے روایت کرتے پایا جو قابلِ اعتبار نہ تھا۔ اس سے منہ پھیر لیا اور اس کی حدیث رد کر دی۔ اور جو خامی یا خرابی اس میں پائی تھی اس کا اظہار کر دیا۔ یہاں تک کہ محدثین نے تصحیح حدیث کے سلسلے میں ایک مستقل علم ایجاد کر لیا۔

لیکن ان تمام احتیاطوں اور پیش بندیوں کے باوجود ہر مسلمان پر یہ واجب ہے کہ جب اس کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کی جائے تو اسے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لے۔ اسے قرآن پر پیش کرے۔ اگر وہ کم یا زیادہ طور پر قرآن سے تناقض نہ رکھتی ہو، اور نہ سیرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مالوف و معروف انداز و اطوار اور عمل سے متناقض ہو۔ تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔ ورنہ توقف سے کام لینا چاہیئے۔

اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی دستور تھا۔ حضرت عائشہ رضؓ سے ایک مرتبہ کہا گیا کہ بعض اصحاب نبیؐ آپؐ سے روایت کرتے ہیں کہ میت پر اس کے پسماندگان کے رونے دھونے سے عذاب ہوتا ہے تو انہوں نے اس حدیث کے ماننے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا خدا نے نہیں فرمایا ہے؟

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی — کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضؓ سے کہا گیا کہ بعض اصحاب نبیؐ اختیال کرتے ہیں کہ آپؐ نے اپنے رب کو دیکھا تھا

حضرت عائشہ نے اس حدیث کو ماننے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا۔ اور اس کے روایت کرنے والے سے کہا:

"اللہ تعالیٰ کا یہ قول پڑھو"

لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر ہ

حضرت عمرؓ کا تشدد بھی روایت حدیث کے سلسلے میں ہمارے علم میں آ چکا ہے۔ لہٰذا لابدی اور ناگزیر ہے کہ قبول حدیث میں احتیاط کی جائے۔ جب تک وہ صحیحین سے مروی نہ ہو۔

بہر حال کوئی صورت اور مسئلہ بھی درپیش ہو، قرآن، اصول دین اور دین کے اکثر فرائض

کے سلسلے میں ہر اعتبار سے جامع ہے۔

اور سنت ثابتہ قرآن کے مجمل کی تفصیل کرتی ہے۔ اور جو بات محتاج بیان ہو اسے وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس کے بعد اسلام کی روح، اور اصول کو کسی سے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔

◎

۹

جب زمین کا سِلسلہ

آسمان سے قائم تھا اور جب منقطع ہوگیا،

غرض مسلمانوں کی زندگی ہر اعتبار سے طاہر، طیب اور ستھری ہوتی رہی۔ ہر آلودگی اور لوث سے بے داغ۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے مابین موجود تھے جب کوئی بات دریافت کرنا ہوتی، آپ سے پوچھ لیا جاتا۔ اور اس کا جواب علم الہٰی کے واسطے سے دے دیتے۔ یا پھر ایسا کرتے کہ اسے خدا کو سونپ دیتے اور وحی نازل ہوتی۔ اور بات صاف ہو جاتی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ گرامی میں زمین کا جتنا مسلسل اور متصل رشتہ آسمان سے قائم تھا۔ اتنا کبھی نہیں ہوا۔

یہی وجہ تھی کہ کعب بن مالک اور ان کے دو ساتھی جو غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ اس ڈر سے آپؐ کے سامنے عذر تراش نہ کر سکے کہ کہیں خدا آسمان سے ان کے جھوٹ کا پردہ بذریعہ وحی فاش نہ کر دے۔ اور پھر یہ کہیں کے نہ رہیں۔ انہوں نے عقاب و عتاب برداشت کر لیا۔ مگر جھوٹ نہ بول سکے۔ اور کعب کا یہ خیال بالکل صحیح تھا۔ منافقین کے

جھوٹ کا اس موقع پر اللہ تعالےٰ نے بذریعہ وحی پردہ فاش کر دیا۔ بتا دیا کہ یہ لوگ اپنے تخلّف کے سلسلے میں جھوٹے عذرات پیش کرنے آئیں گے۔ اور آپؐ کو حکم دیا کہ ان سے کہدیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے حالات و اخبار سے باخبر کر دیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ توبہ میں آیات کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

اکثر ایسا ہی ہوتا کہ لوگ آپؐ سے سوال کرتے اور آپؐ فرما دیتے

" اس بارے میں مجھے کچھ علم نہیں "

پھر اللہ تعالیٰ آپ کو باخبر کر دیتا اور آپ لوگوں کو بتا دیتے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سوال سن کر آپ اعراض کرتے۔ پھر قرآن کی آیتیں نازل ہوتیں اور سوال کا جواب مل جاتا اور آپؐ حکم الٰہی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔ جیسے اس شخص کا واقعہ تھا جس نے اپنی بیوی کے پاس ایک غیر مرد کو دیکھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آیا اب کیا کرے؟ اگر اس شخص کو قتل کر دیتا ہے تو قصاص میں خود بھی قتل کر دیئے جانے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور یہ بات پوچھی۔ آپؐ نے اس کی بات سن کر اعراض کیا۔ اور اس سوال پر کراہت کا اظہار فرمایا۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی آیات کریمہ میں لعان کا فیصلہ کر دیا۔

میری نظر میں ام امین کا قول، جب وہ وفات نبیؐ پر رو رہی تھیں۔ بڑا بلیغ ہے انہوں نے کہا:

"میں اس بات پر روتی ہوں کہ آسمان سے خبر آنا آپؐ کی وفات کے بعد بند ہو گئی"

اور بات بھی یہی تھی۔

آپؐ کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور اب ان لوگوں کے لیے جو

امر مسلمین کے نگران اور ذمہ دار ———— خلفاء ———— تھے۔ اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا کہ ہر معاملے میں قرآن سے۔ ورنہ حدیث سے رجوع کریں۔

◎

(۱۰)

دَورِ ابوبکرؓ و عمرؓ

فتوحات اور کشور کشائی کا آغاز

حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں بھی یہی اسلوب کار جاری رہا۔ بجز اس کے کہ مرتدین کا معاملہ پیش آیا۔ مگر ان کا قلع قمع جب ہو گیا۔ تو حالات پھر معمول پر آ گئے۔

پھر حضرت عمرؓ کا دورِ عہد آفریں آیا :

عمرؓ نے پوری کوشش کی کہ آنحضرت ﷺ اور ابو بکر کے زمانے میں جو اسلوب حیات قائم تھا وہ جاری رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو کارنامے انجام دیئے۔ انہیں تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ اور میرا خیال ہے قیامت تک فراموش بھی نہیں کر سکے گی۔

عمرؓ کے زمانہ میں جو حالات و مسائل پیش آئے۔ وہ اپنی نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے بالکل نئے تھے۔

آپؓ کے عہد کے غزوات کا بلاد شام و فارس کی جنگوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ﷺ کے زمانے میں جو مالِ غنیمت آتا تھا۔ اس کا قیاس بھی، غنائم ایام عمرؓ سے نہیں کیا جا سکتا۔

آپؐ کے زمانے میں جو غنائم آتے تھے ان کا پانچواں حصہ روک لیا جاتا تھا۔ جیسا کہ

اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے یعنی پیادے کا ایک حصہ اور سوار کے دو حصے۔

اور اس کے باوجود کہ عہد نبوی میں مسلمانوں کی امانت و دیانت بہت زیادہ قوی تھی۔ ایک آدھ واقعہ خیانت کا ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ سورۃ آل عمران میں اس موضوع پر آئتیں وارد ہوئی ہیں۔

لیکن مسلمان جب فارس اور روم میں لڑنے گئے تو ان کے جیب و دامن سیم و زر سے بھر گئے اور خلیفہ مدینے میں بیٹھا تھا جسے کوئی علم نہیں تھا۔ کہ مسلمان فتحیاب ہونے کے بعد کیا کر رہے ہیں؟ اس کے پاس فتح کی خبر آئی۔ اور غنائم کا پانچواں حصہ بھی آگیا۔ جسے اس نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

اس زمانے میں مسلمانوں کو غنیمت میں صرف اموال منقولہ ہی نہیں حاصل ہوتے تھے بلکہ زمین، کھیت اور باغات وغیرہ کی صورت میں جائداد غیر منقولہ بھی حاصل ہوتی تھی۔ یہ سب چیزیں خلیفہ سے بہت دور تھیں۔ اور ان سے پیدا شدہ مسائل کا حل کرنا بے حد پیچیدہ تھا۔ جو غنائم منقولہ تھے انہیں تقسیم کرنا اور پانچواں حصہ خلیفہ کو بھیجنا آسان تھا۔ لیکن غنائم ثابتہ (غیر منقولہ) کا مسئلہ بے حد کٹھن تھا۔ سالار فوج نہ انہیں منتقل کر سکتا تھا، نہ تقسیم کر سکتا تھا، نہ فوج کے لیے یہ ممکن اور مناسب تھا کہ یہ زمین اس میں تقسیم کر دی جائے اور وہ کاشتکار بن کر وہاں مقیم ہو جائے۔ یہ سپاہی کسان بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ یہ تو مسلسل اور غیر منقطع طور پر رواں دواں رہنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ یہ ایک شہر فتح کر کے کمر کھول نہیں ڈالتے تھے۔ فوراً ہی دوسرے شہر کی طرف کوچ کر دیتے تھے۔ یہ ساری باتیں خلفاء نبی ؐ کے لیے نئی تھیں۔ عمر نے ایک ایسا نظام وضع کیا۔ جس نے ان نئے حالات و مسائل کو پورے طور پر اپنے حصار میں لے لیا۔ اور کتاب و سنت نبوی کی روشنی میں سواد کی زمین تقسیم نہ کر کے نظام حکومت کو محکم تر اور استوار تر کر لیا۔

اور مسلمانوں کا یہ لشکر جس نے دولتِ روم اور دولت فارس کا خاتمہ کیا تھا۔ بڑے پیمانے پر جنگ کرنے۔ اور نسبوں حرب سے بالکل ناواقف تھا۔ یہ لوگ صرف ان جنگوں سے واقف تھے۔ جو قبائل کے مابین ہوا کرتی تھیں۔ بڑے بڑے لشکروں سے عہدہ برآ ہونا۔ مہذب اور متمدن حکومتوں کے سازوسامان جنگ کا مقابلہ کرنا۔ دیار و مدن کا محاصرہ کرنا۔ اور انہیں غارت کر دینا انہوں نے کہاں سیکھا تھا؟ لیکن اس کے باوجود نصرت الٰہی نے انہیں بڑی بڑی قوموں اور بڑے بڑے لشکروں پر فتح دی۔ اور سلام کا پرچم مشرق و غرب میں انہوں نے لہرایا۔ اور زمین سے اس عظیم مملکت کو اکھاڑ پھینکا جسے روما کا لشکر گراں اور قسطنطنیہ کے عساکر قاہرہ بھی متزلزل نہ کر سکے تھے یعنی ساسانیوں کی حکومتِ ایران!

آپ پڑھ چکے ہیں کہ عہد ابوبکر میں اسلامی لشکر کے ان مجاہدوں کا بڑا حصہ مرتد ہو گیا تھا۔ اور انہوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس کے باعث حضرت ابوبکر ان سے مقاتلہ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن جب یہ پھر اسلام کے حلقے میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنی پچھلی غلط کاریوں کی تلافی کر دی اور راہ اسلام میں ہر طرح کے شدائد بہ خندہ پیشانی جھیلے۔ انہوں نے جہاد کیا۔ اور جہاد کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے صبر کیا اور اسے انتہا تک پہنچا دیا۔ اور اس کا پھل انہیں فتح عظیم کی صورت میں ملا۔

اور یہ ساری کارفرمائی قرآن کی تھی۔ ان تمام کارناموں کا موثر اول قرآن ہی تھا۔ اس کی تلاوت اور فہم نے ان سے یہ معجزے اور عجائب صادر کرائے تھے۔ خالد بن ولید نے دشمن کو دعوت اسلام یا ادائے جزیہ دیتے ہوئے کہا تھا:

"اگر تم نے ہماری یہ پیش کش (اسلام یا جزیہ) ماننے سے انکار کیا۔ تو ہم ایک ایسی قوم لے کر تم پر چڑھ آئیں گے جو موت کو اتنا ہی عزیز رکھتی ہے جتنا تم زندگی کو محبوب رکھتے ہو۔"

مجاہدین کا یہ جذبہ اور جوش تمام تر قرآن ہی کا پیدا کیا ہوا تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ سورہ توبہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ؕ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ○	یعنی: بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جان اور مال کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے۔ توراۃ میں (بھی) اور انجیل میں (بھی) اور قرآن میں (بھی) اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو (بھلا) کون پورا کرنے والا ہے۔ تو تم لوگ اپنی اس عہد پر جس کا تم نے اللہ سے معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

یہ مسلمان جہاد کرنے نکلتے تھے۔ اور اس بات پر مطمئن رہتے تھے۔ کہ انہوں نے اپنی جان و مال کا سودا جنت کے بدلے خدا سے کر لیا ہے۔ پس ان صداقت پرستوں کے لیے موت زندگی سے زیادہ محبوب و مرغوب تھی۔ اس لیے کہ نعیم الٰہی زوال ناآشنا اور دائمی ہے۔ ان میں سے ہر شخص دشمن کے سامنے بھاگنے میں عار محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا۔ بھاگنے والوں کا استقبال کرنے لیے جہنم ہے۔ جو بُری بری جگہ ہے۔ ان کی کیفیت وہی تھی جو خالد نے بیان کی تھی کہ انہیں موت اتنی ہی محبوب ہے جتنی دشمن کو زندگی محبوب ہے۔

یہ تھا وفات نبیؐ کے بعد عہد ابوبکرؓ و عمرؓ میں مسلمانوں کی زندگی کا نقشہ۔

عمرؓ نے قرآن، سنتِ نبوی اور اسوۂ ابوبکرؓ اور رائے صالحین صحابہ کا التزام کر لیا تھا۔

فتوحات، وسعت مملکت اور انتشارِ جیوش، کثرت غنائم اور فے اور تنظیم امور ارض سے متعلق جو نئے مسائل پیدا ہوئے تھے۔ ان کا حل کتاب اللہ سے تلاش کرتے تھے، پھر سنت نبیؐ سے پھر سیرۃ خلیفہؓ ماقبل سے۔ جہاں کہیں بھی اگر حل نہ ملتا تو انصار و مہاجرین کے ارباب رائے سے مشورہ کرتے اور پھر کوئی نہ کوئی معقول حل نکل ہی آتا۔

عمرؓ آل خطاب کے معاملے میں بھی بہت سخت تھے۔ وہ اسے بالکل پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ انہیں امیرالمؤمنین کی جماعت خاص قرار دیں۔

مسلمانوں میں اپنے حکام اور ولاۃ پر شاید ہی کوئی خلیفہ اتنا تند اور سخت گزرا ہو۔ جتنے عمرؓ تھے وہ انہیں ہر سال طلب کرتے تھے اور ان کی رعیت میں سے بھی اہل الرائے اصحاب کو طلب کرتے تھے۔ پھر آمنے سامنے والی سے رعیت کے بارے میں اور رعیت سے والی کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ اس کے بعد دوٹوک فیصلے صادر کرتے تھے۔

(۱۱)

دورِ عثمانؓ

○

اضطراب، شورش، اور بے اطمینانی کا آغاز،

عمرؓ کے بعد زمام خلافت عثمانؓ کے ہاتھ میں آئی۔ کئی سال تک معاملات بالکل ٹھیک رہے۔ لوگ ان سے خوش تھے۔ وہ لوگوں سے خوش تھے۔ جیوش مسلمین شرق وغرب میں فتوحات میں مصروف تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ بنوامیہ اپنی پوری طمع اور حرص کے ساتھ ان پر غالب آ گئے۔ یہاں تک کہ تمام امور پر حاوی ہو گئے۔ عزل وتعیین بھی ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ خلیفہ صرف تائید کر دیتا۔ مسند خلافت پر بیٹھتے وقت عثمانؓ کی عمر ستر سال سے متجاوز تھی۔ ان کی مقاومت طامعین قریش کے سامنے عام طور پر اور طامعین بنوامیہ کے سامنے خاص طور پر ضعیف ہو گئی۔

اس صورتِ حالات نے فتنوں کو ابھرنے کا موقعہ دیا۔ بغاوت کے شعلے اقالیم میں بھڑکنے لگے۔

بصرہ، کوفہ اور مصر سے جو فوجیں آئیں انہوں نے اپنے شکایات پیش کیئے بعض صحابہ —— اور خاص طور پر حضرت علیؓ —— نے کوشش کی کہ معاملہ سلجھ جائے اور عین اس وقت جبکہ معاملہ سلجھ چکا تھا بنوامیہ کے شر پسندوں نے اسے پھر الجھا دیا۔ فوجیوں

کو عثمان رضی اللہ عنہ کا وہ خط ملا۔ جس پر ان کی مُہر ان کی بغیر اجازت لگائی گئی تھی۔ اور جو ان کے خلاف تھا۔ یہ لوگ جو راضی اور مطمئن ہو کر مصر واپس جا رہے تھے پھر پلٹ آئے خلیفہ کا محاصرہ کر لیا۔ اور آخر ایک دن دیوار توڑ کر داخل ہوئے اور خلیفہ کو قتل کر دیا۔

عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے فتنے کے دروازے کھل گئے

اس میں کوئی شبہ نہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش صرف دارالخلافت سے باہر ہی نہیں تھی۔ مدینے میں بھی تھی۔ یہ لوگ اس بات سے بہت دل تنگ تھے کہ بنو امیہ خلیفہ پر حاوی ہو چکے ہیں۔ اہل مدینہ میں وہ لوگ بھی تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اتنے خفا تھے کہ انہیں رات کی خاموشی میں چپکے سے دفن کرنا پڑا۔

۱۲

عہدِ علیؓ

مشاجرات و اختلافات صحابہ کا بیان اور ان کی کیفیت

عثمانؓ کے بعد لوگ علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ان کی بیعت کر لی۔ اکثر کی بیعت رضا کارانہ تھی۔ بعض کی بہ کراہت۔ شام میں معاویہؓ نے بیعت سے صاف انکار کر دیا۔ اصحاب نبیؐ کی ایک جماعت بہ حالت غضب بصرے کی طرف بڑھی۔ اس کی سرگروہی ام المومنین عائشہ بنت ابی بکر، طلحہ بن عبید اللہ اور زبیر بن العوام کے ہاتھ میں تھی۔ اور یہ دونوں بزرگ ——— طلحہؓ و زبیرؓ ——— کبار صحابہ میں سے تھے۔ عثمانؓ کی مجلس شوریٰ کے رکن اور اصحاب عشرہ مبشرہ۔ وفات کے وقت تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم جن سے راضی تھے اور جنہیں آپؐ نے جنت کی بشارت دی تھی۔

مہاجرین و انصار کی ایک جماعت بالکل الگ تھلگ رہی۔ اس نے اس شورش اور فتنے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ان میں سعد بن ابی وقاصؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے جلیل القدر صحابہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سعد بھی عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ انہوں نے فتح بلاد فارس میں بڑا شاندار حصہ لیا تھا ان سے علیؓ کی بیعت کر لینے کے لیے کہا گیا۔ انہوں نے علیؓ سے کہا:

"آپ کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔"

علیؓ نے ان سے تعرض نہ کرنے کا حکم اپنے ساتھیوں کو دیا۔ اسی طرح عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ ماجرا گزرا۔

علیؓ کی بیعت ابھی اتمام تک پہنچی ہی تھی کہ انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اپنے آپ کو دو دشمنوں میں گھرا ہوا پایا۔ ایک بصرے میں جس کی سربراہی حضرت طلحہؓ، زبیرؓ اور عائشہؓ کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرا شام میں جس کے سردار معاویہ تھے۔

علیؓ کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ان دونوں فریقوں سے لڑیں، تاکہ یہ طاعت کا راستہ اختیار کریں۔ اور تفرقے کے بعد جماعت مسلمین پھر سے مجتمع ہو جائے اور یہ بکھری ہوئی امت واحدہ بن جائے۔ جیسے ایام نبیؐ اور ایام شیخین ——— ابوبکرؓ و عمرؓ ——— میں تھی۔

اس جگہ اس حقیقت کا صاف الفاظ میں اعتراف کرنا چاہیے کہ علیؓ نے ہرگز جنگ کا اس وقت تک آغاز نہیں کیا جب تک صلح و امن کی پیش کش نہیں کر لی۔ جب تک بار بار اس دعوت کو دوہرا نہیں لیا۔ جب تک اپنے مخاصموں سے دلیل و حجت کی لڑائی نہیں لڑ لی اور پوری وضاحت کے ساتھ یہ ثابت نہیں کر دیا کہ قتل عثمان سے قطعاً ان کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن علی سے خصومت رکھنے والے ان سے جنگ کرنے پر حریص تھے۔ یہ لوگ خون عثمان کا قصاص طلب کر رہے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ وہ لوگ ان کے حوالے کر دیئے جائیں۔ جنہوں نے عثمانؓ کو قتل کیا ہے یا قتل عثمانؓ میں شرکت کی ہے۔ علیؓ اس مطالبے کو ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سب سے پہلے لوگوں کو ایک امام پر متحد ہو جانا چاہیے اس کے بعد خلیفۂ مقتول کے معاملے کا تصفیہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ہی اللہ کی حد جاری کی جائے گی۔ جس طرح اسے جاری کیا جانا چاہیے۔ ایک نظام کے ماتحت، امن کی حالت میں، نہ کہ فتنے اور انقسام کی ظلمت میں۔

اسی طرح علیؓ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ سعی اصلاح احوال اور دعوت صلح و مفاہمت میں پورا زور صرف کر کے مایوس ہو چکنے کے بعد طلحہ و زبیر و عائشہؓ اور ان کے بصری پیروؤں سے جنگ کریں۔

جنگ جمل اسی سلسلے میں برپا ہوئی۔ حضرت زبیرؓ نے اپنی غلطی محسوس کر لی وہ جنگ سے دستبردار ہو گئے۔ لیکن حجاز کے راستے میں دھوکے سے کسی نے قتل کر دیا۔

اسی طرح طلحہؓ بھی ایک اموی ——— مروان بن الحکم ——— کے ہاتھ سے دھوکے سے قتل ہوئے۔ جب وہ جنگ سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ موت سے پہلے انہوں نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

(۱۳)

جنگِ جمل

حضرت عائشہ صدیقہؓ میدانِ جنگ میں

عائشہ رضؓ اپنے موقف پر قائم رہیں۔ اونٹ پر اپنے ہودج میں تشریف فرما رہیں ہودج کے گرد مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت قتل ہو گئی۔ جن میں محمد بن طلحہ بن عبیداللہ بھی تھے۔ وہ اس حالت میں قتل ہوئے کہ اونٹ کی مہار ان کے ہاتھ میں تھی

حضرت عائشہؓ برابر اہل بصرہ کو جنگ پر آمادہ کر رہی تھیں۔ یہاں تک کہ اونٹ کی کونچیں کاٹ دی گئیں۔ پھر لوگ متفرق ہو گئے اور اہل بصرہ نے شکست کھائی۔ لیکن حضرت عائشہ کو کسی طرح کی تکلیف نہیں پہنچی۔ پھر جب علیؓ نے انہیں اعزاز واکرام کے ساتھ مدینے بھیج دیا تو وہ خانہ نشین ہو گئیں۔ اور پھر وہاں سے نہیں نکلیں۔ جیسا کہ سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ازواج نبی صؐ سے فرمایا تھا:

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ
تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی
وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ

یعنی:
تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستوار کے موافق مت پھرو اور

الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ
رَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ ـــ
لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ
اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ
تَطْهِيْرًا ۚ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى
فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ
وَ الْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۚ

تم نماز کی پابندی رکھو اور زکات دیا کرو
اور اللہ کا اور اس کے رسولؐ کا کہنا مانو۔
اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ اے گھر والو تم کو
آلودگی سے دور رکھے اور تم کو ہر طرح ظاہراً
و باطناً پاک صاف رکھے۔ اور تم ان
آیات الٰہیہ کو اور اس علم (احکام) کو یاد رکھو
جس کا تمہارے گھروں میں چرچا رہتا ہے
بے شک اللہ تعالیٰ راز داں ہے۔ پورا
خبردار ہے۔

(۱۴)

علیؓ اور معاویہؓ

○

تاریخِ اسلام کا ایک المناک باب

جب تک حالات سدھر نہیں گئے۔ علی نے بصرے میں اقامت رکھی۔ پھر کوفہ واپس آ گئے۔ یہاں قیام کیا اور اسے مرکز خلافت بنا لیا۔ انہوں نے مرکز خلافت کوفہ کو اس لیے بنایا کہ مدینہ جنگ کا اکھاڑہ بننے سے محفوظ رہے۔

علی نے بار بار معاویہ کے پاس سفارت بھیجی۔ انہیں طاعت اور صلح کی دعوت دی۔ جمیع قطار اسلامیہ کے شرق و غرب میں علی کی بیعت مکمل ہو چکی تھی۔ سوا شام کے جہاں دمشق میں معاویہ خونِ عثمان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور صلح کی ہر پیش کش کو رد کر رہے تھے۔

اب علی کے لیے جنگ کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہ گیا۔ چنانچہ وہ لشکر لے کر بڑھے۔ اور صفین کے مقام پر پہنچے۔ معاویہ نے گھاٹ پر قبضہ کر لیا تاکہ علی اور ان کے اہل لشکر کو پیاسا مار ڈالیں میں جنگ کر کے اصحاب علی نے گھاٹ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اسے پسند نہیں کیا کہ معاویہ اور لشکر اہل شام کو پیاسا مار ڈالیں۔ انھیں کھلی اجازت دے دی کہ خود پییں اور اپنے جانوروں کو پلائیں۔

علیؓ نے اب بھی صلح کی کوشش جاری رکھی۔ لیکن معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ نے قتال کے سوا دوسرا راستہ پسند نہیں کیا۔ چنانچہ قتال شروع ہوا۔ جنگ نے کئی پلٹے کھائے۔ آخر کار میدان علیؓ کے ہاتھ رہا۔ قریب تھا کہ لشکر شام شکست فاش سے دوچار ہو۔ رواۃ کا بیان ہے کہ معاویہ بھاگنے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو چکے تھے کہ عمرو بن العاصؓ نے بچاؤ کی صورت پیدا کر لی۔ نیزوں پر قرآن بلند کر کے کتاب اللہ سے فیصلہ کر لینے کی اپیل کی۔ علیؓ نے سمجھ لیا یہ دھوکا ہے لیکن یمن کے لشکریوں نے انہیں حکم کا فیصلہ تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیا۔

اصحاب علیؓ میں جو لوگ قتل ہوئے، ان میں عمار بن یاسرؓ بھی تھے جو بڑی بے جگری اور بہادری سے لڑے تھے۔ یہ بہت بوڑھے تھے۔ عمر نوّے سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ رجز پڑھ پڑھ کر بڑے جوش سے لڑ رہے تھے۔ کہتے تھے:

من رائح الی الجنۃ — جنت کون چلتا ہے؟

الیوم القی الاحبۃ — آج میں دوستوں سے ملنے جا رہا ہوں

محمدا و حزبہ — محمدؐ اور ان کی جماعت سے!

عمارؓ کا قتل علیؓ اور ان کے اصحاب صالحین کی تثبیت اور معاویہ اور ان کے ساتھیوں کے لیے تشکیک کا ثبوت تھا۔ کیونکہ بہت سے مہاجرین و انصار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا تھا۔ کہ وہ اثنا بنائے مسجد میں عمار کے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

"افسوس! اے ابن سمیہؓ، تجھے باغیوں کی ایک جماعت قتل کرے گی۔"

انصار کے ایک مرد صالح خزیمہ بن ثابتؓ صفین میں علی کے ساتھ تھے لیکن مقاتلہ میں شریک نہیں ہوئے کیونکہ دل شک سے خالی نہ تھا۔ لیکن جب عمار کو سیوف اہل شام سے قتل ہوتا دیکھ لیا، شک زائل ہو گیا اور بے ساختہ پکار اٹھے:

"حق ظاہر ہو گیا!"

اور لڑتے ہوئے قتل ہو گئے

معاویہ اور عمرو بن العاص کے پاس عمار کے قتل کا جواب نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے راستہ پیدا کر لیا کہا :

" ہم نے انہیں کب قتل کیا ہے ۔ انہیں تو ان لوگوں نے قتل کیا ہے جو انہیں یہاں لڑنے کے لیے لائے تھے "

اس قول کی اہل شام میں خوب اشاعت کی گئی ۔ تاکہ ان کے قلوب میں شک اور قلق کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی ۔ وہ زائل ہو جائے ۔

۱۵

خوارج

تاریخ اسلام کا ایک عجیب و غریب فرقہ

اسی اثنا میں علی کی جماعت کے اندر ایک جماعت پیدا ہوئی جو تحکیم کے خلاف تھی۔ اور اس بات پر علی سے اتنی برہم تھی کہ انہیں کافر کہنے لگی۔ کیونکہ اس کے نزدیک حکم کے معاملے پر صلح کر لینا امر الٰہی کی مخالفت کرنا تھی۔ انہیں صلح کے بجائے جنگ جاری رکھنا چاہیے تھی۔

لیکن جب بار بار کی دعوت صلح کے بعد آخر کار جنگ پھر شروع ہوئی تو خوارج کو علی کے ساتھ شریک جنگ ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ ان کی شکایت رفع ہو گئی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

خوارج کا شعار یہ کلمہ تھا:

لاحکم الا اللہ

ان کے اس قول کے بارے میں علی نے کہا:

کلمۃ حق ارید بہا الباطل یعنی بات سچی ہے لیکن اس سے مراد حق نہیں باطل ہے۔

حکمین کی حیثیت سے جب عمرو بن العاص اور ابو موسیٰ اشعری کا فیصلہ خدع و اختلاف

کے ہنگاموں میں ختم ہوگیا۔ تو پھر لڑائی شروع ہوگئی۔

خوارج نے اب کافی طاقت حاصل کر لی۔ علی نے ان کے پاس عبداللہ بن عباس کو بات چیت اور افہام وتفہیم کے لیے بھیجا۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ پھر علی خود بہ نفس نفیس ان کے پاس گئے۔ ان سے بحث و گفتگو کی۔ بہت سے قائل ہوگئے۔ بہت سے قائل نہیں ہوئے۔ ان سے لڑائی کرنا پڑی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خوارج کو زبردست شکست ہوئی

لیکن جب علی ان الجھنوں میں گرفتار تھے۔ اور خوارج اور معاویہ کو شکست دے رہے تھے۔ ان کے اصحاب میں تفرقہ پیدا ہوگیا۔ یہاں تک کہ علی کو یاس ہوگئی۔ وہ انہیں بار بار سمجھاتے تھے اور راہِ حرب کی طرف رہبری کرتے تھے۔ مگر ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا

اس موقعہ سے معاویہ نے فائدہ اٹھایا۔ عراق اور جزیرۂ عرب میں تاخت وتاراج شروع کردی۔ بسر بن ارطاۃ کی سرکردگی میں ایک لشکر حجاز کی طرف بھیجا۔ جہاں اس نے بڑی قساوت کا مظاہرہ کیا۔ یہی یمن میں اس نے کیا۔

پھر معاویہ نے اپنی تدبیروں سے اور موقع سے فائدہ اٹھاکر مصر پر قبضہ کرلیا۔ اور وہاں علی کے گورنر محمد بن ابی بکر صدیق کو قتل کردیا۔

رفتہ رفتہ علی کی قوت کمزور پڑتی گئی اور معاویہ کو قوت حاصل ہوتی گئی۔ کیونکہ وہ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے

اسی اثنا میں ایک بہت بڑا دلدوز سانحہ علی کے ساتھ پیش آیا۔

علی کے ابن عم عبداللہ بن عباس جو بصرے کے گورنر تھے۔ بیت المال کا سارا سرمایہ لے کر حجاز فرار ہوگئے۔ اور مکے آکر چین سے رہنے لگے۔ اس حالت میں کہ طلب دنیا نے انہیں اپنے ابن عم (علی) سے برہم کردیا تھا۔ اس کی خبر معاویہ کو ملی۔ انہیں طمع دامن گیر ہوئی۔ اپنے پیام بر بصرہ بھیجے۔ انہوں نے وہاں کے لوگوں کو بھڑکایا۔ علی آخر مجبور ہوگئے کہ ایک لشکر بھیج کر ان لوگوں کی سرکوبی کریں۔ جو امن شکنی پر اتر آئے تھے۔

(۱۶)

قتلِ علیؓ

خوارج کی سازش اور خونِ شہادت کے قطرے

اس اثنا میں خوارج جڑ پکڑتے رہے۔ ان کی ایک جماعت نے فیصلہ کیا کہ معاویہ، عمرو بن العاص اور علی کو قتل کر دیا جائے۔ جنہوں نے دنیا کو شر سے بھر دیا ہے۔ لیکن معاویہ اور عمرو بن العاص بچ گئے۔ علی کو قتل کرنے میں عبدالرحمٰن ابن ملجم کامیاب ہو گیا۔ جبکہ وہ نماز کے لیے مسجد میں پہنچے تھے۔

اس طرح وہ امت جسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ط — اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے رہو اور پراگندہ نہ ہو۔

اس قوم نے اللہ کا یہ حکم فراموش کر دیا۔

جس قوم سے اللہ نے سورۃ انفال میں کہا تھا:

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَذْهَبَ رِيحُكُم — آپس میں مت لڑو ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

اس نے اس فرمان الٰہی کو فراموش کر دیا۔

جس قوم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

"خبردار! میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔"

اس نے اپنے نبی کی یہ نصیحت فراموش کر دی۔

اس قوم نے یہ ساری نصیحتیں فراموش کر دیں اور فتنۂ مال اور ہوس اقتدار میں مصروف ہو گئی۔

علی قتل ہو گئے اور ان کے قتل کے وقت سے مسلمان ایسے گرفتار شر ہوئے کہ آج تک اس کے اثرات باقی ہیں۔ امت دو عظیم فرقوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک کی رائے میں علی امام شرعی ہیں اور امامت موروثی ہوتی ہے۔ دوسرے کی رائے میں خلافت اہل بیت میں متوارث نہیں ہے۔ اس منصب کا ہر صالح مسلمان سزاوار ہو سکتا ہے

پھر ان دونوں فرقوں میں اتنا اختلاف بڑھا کہ ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے۔ ایک تیسرا فرقہ —— خوارج —— جو اٹھا تھا۔ وہ گو اب تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ لیکن وہ اہل سنت اور شیعہ دونوں کو کافر سمجھتا تھا۔ اور دونوں کا خون اس کے نزدیک حلال تھا۔

(۱۷)

دَورِ مُعاویہؓ

استلحاق زیاد بن ربعیہ کی داستان

اگر بنوامیہ دنیا کی طمع میں نہ گرفتار ہو گئے ہوتے تو فتنۂ قتل عثمان برپا نہ ہوتا۔ اگر معاویہ کو شام اور جملہ اقطار مسلمین پر قبضہ کر لینے کی ہوس نہ ہوتی تو ان کے اور علی کے مابین جنگ برپا نہ ہوتی یا انہوں نے علی سے اشتراکِ عمل کیا ہوتا تو فتنہ جنگِ جمل برپا نہ ہوتا۔

حسن بن علی سے صلح کے بعد معاویہ کا جمیع اقطار بلاد اسلامیہ پر تسلط ہو گیا۔ اور وہ اپنے آپ کو امیر المؤمنین کہلانے لگے۔ انہوں نے خلفائے راشدین کے نقشِ قدم کی پیروی نہیں کی۔ انہوں نے خلافت کو بادشاہت اور موروثی بنا دیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنایا۔ جن چیزوں کو اللہ نے قرآن میں حرام کیا تھا نہیں حلال کر لیا۔ انہوں نے زیاد کو جو ابوسفیان کا ناجائز بیٹا تھا۔ خاندان میں شریک کر لیا حالانکہ اللہ نے بڑی شدت سے اس استلحاق کو سورۃ احزاب میں منع فرمایا ہے:۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ   یعنی:

قَلْبَيْنِ فِیْ جَوْفِهٖ وَمَا جَعَلَ
اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِیْ تُظٰهِرُوْنَ
مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ وَمَا جَعَلَ
اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ
ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ
وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ
يَهْدِی السَّبِيْلَ ۝

اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینے میں دو[2] دل نہیں بنائے۔ اور تمہاری ان بیبیوں کو جن سے تم ظہار کر لیتے ہو تمہاری ماں نہیں بنا دیا اور تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (سچ مچ کا) بیٹا نہیں بنا دیا۔ یہ صرف تمہارے منہ سے کہنے کی بات ہے۔ اور اللہ حق بات فرماتا ہے۔ اور وہی سیدھا راستہ تبلاتا ہے

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ
اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ
تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ
فِی الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ وَ
لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَا
اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا
تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَكَانَ
اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

تم انہیں ان کے باپوں کی طرف منسوب کیا کرو یہ اللہ کے نزدیک راستی کی بات ہے۔ اور اگر تم ان کے باپوں کو نہ جانتے ہو تو وہ تمہارے دین کے بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں۔ اور تم سے اس میں جو بھول چوک ہو جائے تو اس سے تم پر کچھ گناہ نہ ہوگا۔ لیکن ہاں جو دل سے ارادہ کر کے کرو۔ اور اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے۔

زیاد کا باپ اس استلحاق سے پہلے ایک رومی غلام مشہور تھا جس کا بیٹا ہونے پر وہ فخر کیا کرتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس استلحاق سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ بخاری اور مسلم کی روایت ہے:

"جو شخص ایسے شخص کو جو اس کا باپ نہ ہو باپ کہے۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔"

اس واقعے کے بعد تو کتاب وسنت سے خروج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس لیے کہ گناہ، گناہ کو دعوت دیتا ہے۔ اور اس لیے کہ حب دنیا قناعت نہیں پیدا ہونے دیتی۔

قرآن میں اللہ نے مکے کو حرم قرار دیا ہے۔ اور نبیؐ نے مدینے کو حرم قرار دیا ہے جیسا کہ بخاریؒ و مسلمؒ کی روایت ہے۔ لیکن بنو امیہ نے مدینے اور مکے دونوں کی بے حرمتی کی۔ یزید بن معاویہؓ نے مدینے کے باشندوں کا خون مباح کر لیا اور وہاں اس کے عساکر نے اس کے حسب الحکم تین دن تک قتل و غارت اور بے حرمتی کا سلسلہ جاری رکھا۔

عبدالملک بن مروان کی اجازت سے حجاج بن یوسف نے مکے پر آگ برسائی۔ اور حجاج نے باشندگان مکہ کا خون بہایا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ بلاد مقدسہ کے لوگ بنو ابی سفیان اور بنو مروان کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔

ابن زیاد نے یزید بن معاویہ کے حکم سے حسینؓ، ان کے بیٹوں اور بھائیوں کو قتل کیا۔ اور بنات نبیؐ کو قیدی بنا لیا۔

مسلمانوں کا مال ان خلفا کی ملکیت بن گیا۔ اسے یہ اس طرح خرچ کرتے جس طرح چاہتے اس طرح نہیں جس طرح خدا نے چاہا تھا۔

معاویہ نے اس مال سے اہل کوفہ و بصرہ کے ضمیر خریدے تا کہ وہ علی کے خلاف ہو جائیں پھر مسلمانوں کا یہ روپیہ (بیت المال) وہ اپنے تخت حکومت کے بقا کے لیے اندھا دھند خرچ کرنے لگے۔ نہ اس میں وہ کوئی حرج سمجھتے تھے نہ مضائقہ۔ خلفاء بنو امیہ برابر اسی ڈگر پر چلتے رہے اور مسلمانوں کا روپیہ غارت کرتے رہے۔ سیرت نبیؐ اور سنت شیخینؓ اور اسوۂ علیؓ سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

عمرؓ نے بالکل سچ کہا تھا۔

"اگر یہ امر (خلافت) ابن ابی طالب کو ملا تو وہ مسلمانوں کو جادۂ صواب پر لے جائیں گے۔"

لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ دوسرے الفاظ میں ظروف حیات جدیدہ نے

احیاءِ سنت نبیؐ و شیخین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر متاخرین کہتے ہیں :۔

"علی سیاست کے لیے مناسب نہ تھے"

حالانکہ وہ سیاست کے لیے پورے طور پر مناسب تھے۔ لیکن وہ دین کو دنیا پر ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے ضمیر نہیں خریدے۔ نہ اللہ اور رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کیا۔ انہوں نے اس سے انکار کر دیا کہ اپنے نفس کو فاسد ہونے دیں۔ ان کے نزدیک مر جانا یا قتل ہو جانا برابر تھا۔ بہر حال خدا کے سامنے جانا اور اپنے عمل کا حساب دینا تھا۔ وہ مسلمانوں سے اللہ کا یہ قول (سورۃ مائدہ) بیان فرمایا کرتے تھے :

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُم أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ :	یعنی : اے مومنو، اپنی فکر کرو۔ اگر تم ہدایت پر ہو تو کسی کی گمراہی تمہیں ضرر نہیں پہنچا سکتی :

خدا ان (علی) پر رحم فرمائے۔ وہ راہِ ہدایت کے حریص تھے۔ وہ اس دنیا سے خوش خوش گئے۔ نہ ان کا دامن آلودۂ معصیت تھا۔ نہ ان سے کوئی لغزش ہوئی تھی۔

(۱۸)

مُعتزلہ کی نمُود

اختراع کیے ہوئے معتقدات، متکلمین کی عقلی توجیہات

اگر بات صرف یہیں تک رہتی کہ مسلمان تین گروہوں یعنی شیعہ، خوارج اور اہل سنت و الجماعت میں منقسم ہو جاتے تو بھی شاید معاملات اس درجہ ابتر اور نازک نہ ہوتے۔

لیکن ایک اس سے بھی بڑا اور مہلک خطرہ مسلمانوں کے سر پر منڈلانے لگا۔

یہ انقسام سے بھی بڑا خطرہ کیا تھا؟

: یہ تمام مسلمانوں کے باہمی تفرق رائے کا خطرہ تھا۔

: یہ خطرہ وہ تھا جس نے انہیں دین میں پراگندہ اور متفرق کر دیا تھا۔

: مسلمان ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے۔

: ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے

: ایک دوسرے کا بُرا چاہنے لگے۔

: ایک خارجی کے ہاتھوں شیعہ یا سنی کو اماں نہیں مل سکتی تھی۔

: ایک شیعہ یا سنی سے خارجی کو خطرۂ جان لگا رہتا تھا۔

: پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ شیعہ تلوار بن کر سُنّی گردن پر لٹکنے لگا۔

: اور سنی، شیعہ کے خون کا پیاسا نظر آنے لگا۔

: ایک دوسرے کے خلاف فساد اور فتنے کا مورچہ سنبھالنے لگا۔

: کبھی تلوار چمکتی تھی اور خون برسانے لگتی تھی۔

: کبھی نفاق اور دوں فطرتی زندگی پر حاوی ہوجاتی تھی۔

: حکومت کا مشرقی حصہ، مغربی حصے کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ اور شورش، بغاوت اور فساد انگیزی میں مبتلا ہوجاتا تھا۔

: مغرب مشرق کے خلاف مصروفِ عمل تھا اور اسے طاعت پر صرف فہرمانیت اور استبداد اور تشدد کے بے پناہ مظاہرے کے بعد ہی مجبور کرسکتا تھا۔

: مشرق اور مغرب دونوں ہیں اصل اور اساس کی حیثیت طغیان اور شورش نے اختیار کرلی تھی۔

: زیاد اور اس کے بیٹے بنو امیہ کی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے زمین پر فساد برپا کررہے تھے۔

: اور بنو امیہ نے انہیں اس فساد کی عام اجازت دے رکھی تھی

ان سے کوئی باز پرس کرنے والا نہ تھا۔ انہیں حق اور اختیار تھا کہ جو چاہیں کریں، احتساب اور عتاب کی فکر سے بے پرواہ ہوکر بندگانِ خدا کا خون بہاتے رہیں۔

: اور پھر زیاد اور اس کے بیٹوں کے بعد ——— حجاج آیا

: حجاج ——— جس نے پورے عراق کو شر اور فساد سے معمور کردیا۔

اور یہ جو کچھ ہوا صرف اتنا ہی نہیں تھا

اس دور میں مسلمانوں کی حیات عقلی بھی آماجگاہ فتنہ و فساد بن کر رہ گئی۔

یہ آپس میں قوت دست و بازو کا مظاہرہ کرنے والی جماعتیں جب حالات سازگار ہوتے تلواریں سونت لیتیں اور ایک دوسرے پر پل پڑتیں۔ اور جب شمشیر زنی کا موقع نہ ہوتا نوک خنجر اور دشنہ و پیکاں سے کام لینے لگتیں۔

اور جب دونوں کا موقع نہ ہوتا تو تیغ زبان سے کام لیا جاتا۔

مناظروں کی مجلس جمتی، اہل السنت والجماعت، شیعہ اور خوارج ایک دوسرے کو قائل کرنے اور ایک دوسرے کی کمزوریاں تلاش کرنے اور ایک دوسرے کو زک دینے کا کام ان مناظروں کی مجالس سے لیتے۔

یہ مناظرے زیادہ تر مساجد میں ہوتے اور عراق کی مسجدیں تو شاید بنی ہی اس لیے تھیں کہ مسلمان وہاں جھگڑیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کریں۔

اور بہت جلد یہ فرقے مختلف ٹکریوں، جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

: شیعوں کے کئی فرقے ہو گئے

: خوارج کئی جماعتوں میں منقسم ہو گئے

: اہل السنت والجماعت میں بھی بہت سے فرقے در فرقے پیدا ہوتے چلے گئے۔

اس افتراق کی منظر کشی حماسہ کے ایک شعر میں بڑے دلآویز طریقے پر کی گئی ہے:

وتفرقوا شيعا لكل جزيرة

فيها امير المؤمنين و منبر

یعنی:

مسلمان اس طرح گروہوں میں تقسیم اور پراگندہ ہو گئے کہ:

ہر جگہ ایک امیر المؤمنین اور ایک منبر نظر آنے لگا۔

ان مناظروں نے کلامیہ فرقوں کو جنم دیا۔

یہ کلامی فرقے شیعوں میں بھی تھے، خوارج میں بھی۔ اور اہل السنت والجماعت میں مرجیہ پیدا ہوئے۔ معتزلہ نے عالم وجود کو آباد کیا۔

اور پھر بہت جلد خود معتزلہ بھی کئی فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

غرض کوئی فرقہ بھی خواہ وہ اہل السنت ہو یا کوئی اور اس فرقہ آرائی سے نہ بچ سکا۔ یہ سب ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہو گئے۔

کلامی فرقوں کی تعداد ستر سے بھی متجاوز ہو گئی۔ ہر ایک ان میں سے کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا قائل تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس کے بعد زبان سے یہ کلمہ ادا کر لینے کے بعد اس کا خون اس کی جان، اس کا مال محفوظ ہو جاتا۔ اور اگر اس میں کوئی کجی تھی تو اس کا حساب اللہ پر اٹھا رکھا جاتا۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعے پر اپنے معتبر اصحاب سے ارشاد فرمایا تھا۔ لیکن کیا ایسا ہوا؟

جواب اثبات میں کون دے سکتا ہے؟

ایک مزید فتنۂ عظیمہ اور بلاد شدید کا سامنا ملت کو اس وقت کرنا پڑا۔ جب تخت حکومت نے اپنے مسلک اور نقطۂ نظر کو دوسروں سے منوانے کے لیے ظلم وجفا اور تشدد کا لرزہ خیز سلسلہ شروع کر دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس جدل و اختلاف اور تفرق رائے کا ایک روشن پہلو بھی تھا۔

اور وہ روشن پہلو یہ تھا کہ دنیا علم سے معمور ہو گئی۔ اور مسلمانوں کی ایک نہایت شاندار فکری تاریخ پیدا ہو گئی۔

لیکن یہ بات بھی شک وشبہ سے بالا ہے کہ اس روشن پہلو سے دین کو نفع اتنا نہیں پہنچا

جتنا نقصان پہنچ گیا ——— اس نے اسلام کو فائدہ کم پہنچایا اور نقصان بہت زیادہ پہنچا دیا۔

اس نفع و زیاں کا صحیح اندازہ آپ کو اس وقت ہو جائے گا جب اس فکری انتشار کے دَور کا عہدِ صحابہ کرام سے موازنہ کریں گے۔

ان صحابہ نے قرآن سنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سنے۔ ان کی عقل نے تصدیق کر دی، اور دل ایمان لے آئے۔

انہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی سنی ہوئی باتوں میں شک نہیں پیدا ہوا۔ نہ یہ اپنی سنی ہوئی باتوں پر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔

ایسا کیوں تھا؟

اس لیے کہ قرآن پورے طور پر واضح تھا۔ اور اس لیے بھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث صحیح ثابت ہو۔ وہ بھی پورے طور پہ واضح تھی۔

اور جب صورت واقعہ یہ تھی تو ان کے نزدیک اس سے بڑھ کر حماقت اور لغویت کی کوئی انتہا نہیں تھی کہ اللہ ایک بات ارشاد کرتا ہے۔ یا اللہ کا رسولؐ ایک بات فرمائے۔ اور یہ لوگ اللہ اور رسولؐ کے کہے ہوئے پر جھگڑنے لگیں۔ اختلاف فکر و نظر میں مصروف ہو جائیں

ذرا غور تو کیجیے۔

یہ اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں!

یہ قرآن سنتے ہیں۔ اور قرآن انہیں بتاتا ہے کہ اللہ سمیع و بصیر ہے۔ علیم و حکیم ہے۔ وہ ایک ہے۔ قدرت والا ہے۔

اور یہ سب کچھ سننے کے بعد ان میں سے کسی کے دل میں یہ خلش نہیں پیدا ہوتی کہ جو صفات اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے منسوب کیے ہیں۔ کیا ہیں؟

آیا یہ عین ذات ہیں یا خارج از ذات ؟

جیسا کہ معتزلہ نے جب اس بات سے انکار کیا کہ یہ صفات قائم بذاتہٖ نہیں بلکہ عین ذات ہیں تو مسلمانوں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور اس بنیاد پر یہ معتزلہ اپنے آپ کو اصحاب توحید کہنے لگے۔ اور جب ان کے بدمقابل ان سے جھگڑتے اور اس باب میں اختلاف کرتے تو یہ انہیں نا سزا طور پر متہم کرتے اور "معطلین" کے نام سے یاد کرتے۔

اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ید اللہ فوق ایدیھم (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے) بھی ایک نزاعی مسئلہ بن گیا۔ اور سوال پیدا ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے جس ید (ہاتھ) کو اپنی طرف مضاف کیا ہے۔ آیا اس کا استعمال قرآن میں مجازی طور پر کیا ہے یا حقیقی طور پر یا ——— اس طرح سمع و بصر اور دوسرے صفات بھی زیر بحث آنے لگے۔

اسی طرح ذرا سوچیے اور اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے موازنہ کیجیے۔

یہ صحابہ قرآن سنتے ہیں اور سنتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے کافروں سے دائمی اور ہمیشہ قائم رہنے والے عذاب کا ڈراوا دیا ہے۔ اور مومنین کو جنت کی اور وہاں باقی رہنے والی نعمتوں کی بشارت دی ہے۔

یہ سن کر وہ مسلمان جن سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے کانپ جاتے ہیں۔ خدا کے عقاب شدید کے تصور سے لرز اٹھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی عفو اور مغفرت سے مایوس بھی نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ ان سے وعدہ فرما چکا ہے کہ اگر انہوں نے توبہ کر لی اور اس توبہ پر قائم رہے تو پھر عفو و مغفرت سے بہرہ ور ہونے کے حق دار ہوں گے۔

اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ ساری باتیں سنتے ہیں۔ لیکن نہ انکار کرتے ہیں نہ سوال میں قدم حد سے باہر نکالتے ہیں۔ نہ باہمی رزم و پیکار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

لیکن یہی باتیں جب متکلمین کے کانوں میں پڑتی ہیں۔ تو طرح طرح کے سوالات پیدا

کرنے لگتے ہیں۔

وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کے بارے میں سوال کرتے ہیں:

آیا مومن ہے یا کافر؟

لیکن اسے کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ علی الاعلان لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا اقرار کر رہا ہے۔

اسے مومن بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ خدا کی نافرمانی کی۔ اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر بیٹھا۔ انہوں نے ایک نئی بات پیدا کی۔ یعنی گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ کافر ہے نہ مومن۔ بلکہ ان دونوں کے بین بین منزل پر ہے۔

یہ کہتے ہیں جس شخص نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔ وہ فاسق ہے۔

کیونکہ اگر اللہ اس شخص کو معاف کر دے۔ ایسے آدمی کو بخش دے جس سے گناہ کبیرہ سرزد ہوا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ عادل نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ پر عدل واجب ہے۔ وہی عدل نہ کرے گا تو کون کرے گا۔

غرض ان نکتہ سنجیوں میں یہ حد سے تجاوز کر گئے۔ اپنا بھی نقصان کیا اور مسلمانوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ ابونواس نے معتزلہ کے اس انداز پر کیا خوب کہا ہے۔

فقل لمن یدعی فی العلم فلسفة

حفظت شیئا و غابت عنك اشیاء

لا تحضر العفو ان کنت امرًا فطنا

فانه خطرله بالدین ازراء

معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ طلحہ و زبیر شہید نہیں ہوئے اس لیے کہ انہوں نے امر الٰہی کی مخالفت کی تھی۔

انہیں ہر چیز یاد ہے سوا ایک بات کے

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝

یعنی :
اگر اللہ کے ساتھ شرک کیا جائے تو وہ اسے معاف نہیں کر سکتا۔ اس کے سوا وہ جسے چاہے معاف کردے اور جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے وہ بہت بڑی گمراہی میں مبتلا ہوا۔

اسی طرح اللہ سورۃ زمر میں فرماتا ہے :

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ، لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا، إِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔

یعنی :
(اے محمدؐ) کہہ دیجیے اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے ۔وہ بہت زیادہ مغفرت کرنے والا اور بہت بڑا رحم کرنیوالا ہے

غرض یہ وعیدی لوگ خود بھی مایوس ہوتے ہیں ،اور دوسروں کو بھی اللہ تبارک و تعالےٰ کی رحمت و مغفرت سے مایوس کرتے ہیں ۔

یہ وعیدیہ حضرات خدا کی رحمت سے مایوس ہو کر اور دوسروں کو اس کی عفو و مغفرت سے مایوس کر کے مذکورہ آیات کریمہ کی روشنی میں ایک طرح کا گناہ کرتے ہیں اور صرف متذکرہ آیات ہی میں نہیں اور بھی بہت سی آیتوں میں قرآن نے امید و آرزو کا دروازہ پورے طور پر کھلا رکھا ہے ۔

وعدہ اور وعید کے سلسلے میں اللہ عزوجل کا انداز ــــ جیساکہ ہم اس سے پہلے بھی بتا چکے ہیں ــــ خوف ورجا کے ساتھ ساتھ رہتا ہے جو لوگ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ انہیں عذاب وعقاب سے ڈراتا ہے اور یہ ڈراوا اتنی شدت کے ساتھ ہوتا ہے کہ قریب قریب یاس کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر فوراً بعد اللہ تبارک وتعالےٰ امید وآرزو کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ جس کے کھلتے ہی یاس کا فور ہو جاتی ہے۔ امید کے اس دروازے میں وہ داخل ہو سکتا ہے جو توبہ کرلے۔ اور آئندہ گناہوں سے کنارہ کش رہے۔

غرض قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ وعدہ اور وعید کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۃ حجر میں فرماتا ہے:

نَبِّئْ عِبَادِیْ اِنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَ اِنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ۝

یعنی: (اے محمدؐ) میرے بندوں کو خبر دے دیجیے کہ میں بہت زیادہ مغفرت کرنیوالا اور بہت زیادہ رحم کرنیوالا ہوں اور دیہ بھی خبر دے دیجیے کہ) میرا عذاب بہت ہی دردناک ہے

(۱۹)

مُعتزلہ

فکر و نظر کی کجی ، اعتقاد میں غلو

فرقِ اسلامیہ کا یہ اختلاف اس فتنے کی طرف راجع ہوتا ہے جو حضرت عثمان رض کے قتل کا سبب بنا اور جس کے بعد اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین جنگ برپا ہوئی۔

اس فتنے کے دوران میں یا اس فتنے کے باعث جو فرقے پیدا ہوئے ان میں سخت و شدید اختلافات رونما ہوئے۔

خوارج نے علی اور ان کے اصحاب، معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو کافر کہنا شروع کیا۔
شیعہ، معاویہ کو اور ان کے شامی مددگاروں کو کافر کہنے لگے۔
اور اس طرح تکفیر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اصحاب نبی میں سے جو لوگ گویا معتزلہ ہی تھے، ان لوگوں نے اس اختلاف میں کسی طرح کی شرکت نہیں کی۔ مثلاً سعد بن ابی وقاص اور محمد بن مسلمہ بالکل الگ تھلگ رہے۔ انہوں نے کسی مسلمان کو بھی کافر کہنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک نے کہا:

"مجھے ایسی تلوار لا دو جو بولتی ہو اور بتا دے کہ یہ کافر ہے اور وہ مومن۔"

ان حضرات نے کفر سازی کی اس دوڑ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ان کے نزدیک جو شخص لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا ہے۔ اس کے بارے میں یعنی اس کی سرگرمیوں کے بارے میں اظہار رائے سے توقف بہتر ہے۔ اور یہ موقف ہے امید کا۔ ان حضرات نے ان پیکار آزما لوگوں کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا تھا۔ وہی قیامت کے دن ان کے اختلافات کا فیصلہ کر دے گا۔ چاہے تو نیکوکار کو اجر دے گا اور فاجر کو سزا دے گا۔ اور چاہے تو سزا میں تخفیف کر دے یا یا بالکل معاف کر دے۔

لیکن معتزلہ اس ڈھرے پر قائم نہیں رہے

صلحاء نے جو راہِ عمل مقرر کر دی تھی اس سے منحرف ہو گئے۔

انہوں نے ان معاملات میں بھی عقل کی تحکیم قبول کر لی۔ جہاں عقل کا گزر نہیں تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے:

: تکفیر کا سلسلہ شروع کیا۔

: پھر دو منزلوں میں سے ایک درمیانی منزل ۔ ۔ ۔ ۔ کی اختراع مرتکب گناہ کبیرہ کے لیے کی اور کہنے لگے کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ نہ مومن ہے نہ کافر، بلکہ فاسق ہے۔

فاسق اس لیے ہے کہ اس نے حکم خدا کی نافرمانی کی اور خدا کا نافرمان مومن نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ اسلام کا اظہار کرے۔ وحدت الٰہی کا اعتراف کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق مانتا ہو۔

ایسے شخص کے لیے ان کا فتویٰ یہ تھا:

: دنیا میں اس کی شہادت (گواہی) کبھی نہیں قبول کی جائے گی۔

: اور مرنے کے بعد یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

۲۰

مُعتزلہ کی انتہا پسندی

فلسفۂ یونان سے سابقہ، ادیانِ غیر کے اثرات، عقل کی تحکیم،

اور اسی اثنا میں کہ مسلمان ان مسائل میں الجھے ہوئے اور ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھے، ان کی مڈ بھیڑ یہودیوں، عیسائیوں اور ایرانیوں اور ہندیوں سے ہوئی اور یہ دونوں ایک دوسرے کے دین پر حملہ اور اپنے دین کا دفاع کرنے لگے۔

اس ہجوم و دفاع کے سلسلے میں انہیں کئی ایک ایسی چیزیں معلوم ہوئیں جو اس سے پہلے معلوم نہیں تھیں۔

اور پھر بہت جلد انہیں اجنبی ثقافتوں سے پالا پڑا اور یہ ان کی رنگارنگی سے واقف ہوئے۔ یونانی ثقافت خاص طور پر ان کے لیے وجہ کشش ثابت ہوئی اور اس سے بھی زیادہ یونانی فلسفے نے ان کا دامنِ دل اپنی طرف کھینچا۔ اور ان دونوں چیزوں سے یہ بہت زیادہ متاثر ہوئے اور ان سے انہوں نے دفاع کے وہی گر سیکھ لیے جو یہود و نصاریٰ اپنے دین کے دفاع کے لیے اختیار کرتے تھے۔

اس کے بعد یہ معتزلہ اور زیادہ آگے بڑھے۔

اور بہت دور تک آگے بڑھتے چلے گئے

یہ عقل پر ایمان لے آئے اور جملہ معاملات کا فیصلہ اسی سے کرانے لگے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ مصدر معرفت صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے عقل!

ان کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ صرف عقل ہی ہے جو لوگوں کے افعال و اعمال کے متعلق خوب و زشت کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ وہی اور صرف وہی بتا سکتی ہے کہ خوب کیا ہے اور زشت کیا؟

یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک اللہ کی معرفت عقل سے ہی ممکن ہے۔ خدا کی قوت کا عرفان عقل ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ خواہ انبیاء کرام اسے لائے ہوں یا نہ لائے ہوں۔ اس کی طرف رہنمائی کی ہو یا نہ کی ہو۔

عقل پر ایمان لاکر یہ گمراہ ہو گئے اور پھر —— اور پھر یہ گمراہی کی وادی ہی میں بھٹکنے کے لیے اور زیادہ آگے بڑھتے چلے گئے۔

ان نادانوں نے یہ نہ سوچا کہ عقل، مدکات انسانی میں سے ایک ملکہ ہے اور دوسرے مدکات انسانی کی طرح اس کی قوت اور رسائی بھی محدود ہے۔ یہ اشیاء کی معرفت حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن جو چیزیں اس کے دائرے سے باہر ہوں وہاں بھٹکنے کے سوا اور کیا کر سکتی ہے؟

اس طرح انہوں نے اختلاف کے بہت سارے دروازے کھول دیئے۔ ایسا اختلاف پیدا کیا جو ختم ہونے میں نہیں آیا۔

انہوں نے مسلمانوں کو ۷۰ سے زیادہ فرقوں میں تقسیم کر دیا۔

پھر ان معتزلہ نے انہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس زعم میں بھی مبتلا ہو گئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اختلاف کی خبر دے دی تھی۔ اور ان فرقوں کی تعداد بھی بتائی تھی۔ جو اسلام میں بہت جلد پیدا ہونے والے تھے۔

اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان نو پیدا فرقوں میں صرف ایک فرقہ ناجی ہو گا ——

ان کی روایت کردہ حدیث کے مطابق ——————— باقی دوسرے تمام فرقے ہلاک ہونگے،
یہ ساری باتیں انہوں نے اس حدیث میں بیان کردی ہیں جس کی انہوں نے روایت کی ہے۔

اور اس حدیث کے متعلق خواہ اس کی سند کچھ ہی ہو کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض ان کی اختراع ہے۔

ان کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"بہت جلد میری امت ۷۳ فرقوں میں منقسم ہو جائے گی۔ ان میں سے صرف ایک فرقہ ناجی ہوگا۔ باقی دوسرے تمام ہلاک ہوں گے۔"

سوال کیا گیا:

"ناجی فرقہ کون ہوگا؟"

ارشاد فرمایا

"اہل السنت والجماعت"

عرض کیا گیا:

"اہل السنت والجماعت کون لوگ ہوں گے؟"

ارشاد فرمایا:

"جس پر میں اور میرے صحابہ قائم ہیں۔"

یہ بات شک وشبہ سے بالا ہے کہ ان فرقوں کی کثرت اور مختلف معاملات ومسائل سے متعلق ان کے اقوال وتصورات اور نظریات وافکار، نتیجہ تھے ادیان وثقافت اجنبی کے اسلام سے دوچار ہونے کا۔

ہم جانتے ہیں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد فلسفہ یونانی کے باعث کس طرح فتنوں

میں مبتلا ہوگئی۔

ان لوگوں کا خیال تھا کہ فلاسفۂ یونان نے معرفت اور عرفان حقائق و اشیا کے جو رنگا رنگ انکشافات ریاضی، علوم طبیعی اور طب وغیرہ سے متعلق کیے ہیں وہ بے خطر ہیں۔

بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک بھی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے دیکھا کہ فلاسفۂ یونان نے عقل کو ہر چیز کا حاکم بنالیا ہے خواہ اس کی رسائی وہاں تک ہوسکتی ہو یا نہ ہوسکتی ہو۔ یہ فلاسفہ یونان اللہ تعالیٰ کے خصائص اور صفات پر تحقیق کرتے۔ اور ان چیزوں کو زیر بحث و گفتگو لاتے ہیں اور اس سلسلے میں خود کئی معروف مذاہب میں بٹ گئے ہیں۔

مسلمانوں میں جو فلسفہ طراز پیدا ہوئے تھے۔ وہ بھی ان کے نقش قدم پر چلے۔ اور انہوں نے بھی عقل سے ان گتھیوں کو سلجھانے کی سعی و کوشش شروع کر دی۔ انہوں نے اپنی عقل کی رہنمائی میں طبیعی اور ماوراء طبیعات مسائل کے انکشاف کی جدوجہد شروع کر دی۔

متکلمین نے بھی اسی راہ کی راہروی کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے بھی عقل کو ہر جگہ خواہ وہ چیز اس کے دائرے میں ہو یا نہ ہو داخل کرنا شروع کر دیا۔ جہاں عقل کے پر جلتے تھے۔ وہاں بھی یہ اسی کی رہنمائی میں آگے قدم بڑھانے لگے۔ انہوں نے رسائل فلسفہ کو دوسروں سے بحث و مناظرے اور ردوکد میں اپنا راہ نما بنالیا۔ دوسرے اہل مذاہب سے ان کی جو جنگیں ہوتی تھیں۔ ان میں یہ عقل ہی سے کام لینے لگے۔ اور آخری نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اصحاب عقل دوسروں کو چھوڑ کر خود آپس میں دست و گریباں ہوگئے۔ بالکل اسی طرح سے دوسرے مذاہب کے لوگ فلسفہ آشنا ہونے کے بعد شئون دین میں باہمی پیکار اور رزم آرائی میں مصروف ہوگئے

معتزلہ بھی اسی ڈگر پر چلے۔

انہوں نے قرآن و سنت کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے آپ کو چند صفات کے ساتھ متصف کیا ہے تو کرید کرنے لگے کہ یہ صفات کیا ہیں۔ یا ان کی حقیقت اور نوعیت کیا ہے؟

انہوں نے قرآن میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ "تدبر اور تفکر" کا حکم دیتا ہے تاکہ لوگ اس حقیقت کا عرفان کر سکیں کہ یہ نظام کائنات جو اتنی باقاعدگی سے اور نظم و ضبط کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ ممکن نہ تھا کہ بغیر کسی موجد کے اس طرح چل سکتا۔ اور وہ موجد صرف خدا ہے۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ تدبر و تفکر سے ہر گرہ کھل سکتی ہے اور ہر الجھن دور ہو سکتی ہے۔ کوئی بات ایسی نہیں۔ جس پر عقل کا حکم ناطق نہ ہو۔ لہٰذا عقل کی مدد سے ذات الٰہی کا ادراک و عرفان بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور جن صفات سے اس نے اپنے آپ کو متصف کیا ہے ان کی کنہ اور حقیقت اور ماہیت بھی معلوم کر لی جا سکتی ہے۔ لہٰذا وہ بے تامل ان وادیوں میں بھی عقل کی مشعل لے کر چل پڑے۔ جہاں عقل کا چراغ نہیں جل سکتا۔ اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے کہ اللہ پر ایمان لانے اور اس کی قدرت کا سراغ لگانے کے لیے عقل کو آگے بڑھائیں۔ جن صفات سے اللہ نے اپنے آپ کو متصف کیا ہے ان کے ادراک و شعور کے لیے بھی عقل کو راہنما بنانا سزاوار نہیں۔ اس لیے کہ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ عقل انسانی۔ ملکاتِ انسانی میں سے ایک ملکہ ہے۔ اس کی قوتِ ادراک و شعور بہرحال محدود ہے۔ اسے وہ قوت اور نفوذ قطعاً حاصل نہیں ہے۔ جو فلاسفہ یونان خیال کرتے ہیں۔ یا ان کی پیروی میں یہود و نصاریٰ فلسفیوں نے خیال کر رکھا ہے۔ ان کی مثال بالکل ویسی ہے۔ جیسی ابو نواس نے اپنے ایک شعر میں بیان کی ہے۔ کہ انہوں نے ایک بات رٹ لی اور دوسری باتوں کو فراموش کر گئے

ابوالعلا معرّی جیسے مرد حکیم کو دیکھیے۔ عقل پر ایمان لا کر وہ مبتلائے فریب ہو گیا۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ وہ خود امامِ وقت ہے۔ اس کے سوا کوئی اور امام نہیں ہے۔ صرف وہی ہے۔ جو لوگوں کی قدم قدم پر رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔

چنانچہ بعض غالی شیعوں کا رد کرتا ہوا کہتا ہے:

: عقل کے سوا کوئی امام نہیں۔

: صبح و شام اسی کا مشورہ کام بناتا ہے

: اگر تم عقل کی پیروی کرو گے تو

: ہر قدم پر سزاوارِ رحمت بے کراں ہو گے۔

عقل پر ابو العلا کا ایمان اس درجہ راسخ ہو گیا تھا کہ دین اور اسلام سے بالکل بے بہرہ ہو کر کہہ اٹھا تھا:

: تم کہتے ہو اس دنیا کا پیدا کرنے والا ایک حکمت والا ہے

: ہم کہتے ہیں تم نے ٹھیک کہا خود ہم بھی یہی کہتے ہیں

: تمہارا خیال ہے کہ خدا لامکاں ہے اور لازماں بھی ہے

: یہ تم کیسے کہہ رہے ہو؟

: یہ ایک مہمل کلام ہے

: جسے عقل قبول نہیں کرتی

گویا ابو العلا المعرّی کی عقل و دانش ایک ایسے خالق حکیم کا تصور کرنے سے انکار کرتی ہے جو لامکاں اور لازماں ہو۔ اور چونکہ وہ اسے قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا مجبور ہوتا ہے کہ خدا کے لیے عام مخلوقات کی طرح زمان و مکان ثابت کرے اور یہ ایسی لغو بات ہے کہ جو ایک مسلمان کے منہ سے نکل ہی نہیں سکتی۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ خود ابو العلا بھی اسے ثابت نہیں کر پاتا، چنانچہ اپنے ایک دوسرے قصیدے میں کہتا ہے:

: کیا تم افلاک کے تاروں کو نہیں دیکھتے جو

: اِدھر اُدھر ایک ایسے آقا کی قدرت سے منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ جو غیر منتقل ہے۔

ابو العلا اور دوسرے لوگوں کی یہ ساری باتیں، عقل کی فریب خوردگی کا نتیجہ ہیں۔ ان لوگوں نے عقل سے دھوکا کھایا۔ اور اپنے ایمان کی پونجی ہار بیٹھے۔

یہ عقل کو ان معاملات میں حاکم ماننے لگے۔ جہاں تک عقل کا گزر ممکن ہی نہیں ہے جہاں صرف حیرت اور عجز کی کارفرمائی ہے۔

جس حقیقت تک یہ عقل کے واسطے اور ذریعے سے پہنچنا چاہتے ہیں۔ وہاں تک عقل انہیں نہیں لے جاسکتی۔

(۲۱)

فتنۂ تاویل

دور ازکار اور لایعنی تاویلات کا دور

تقریباً ایسی ہی کیفیت مجسمہ اور مشبہہ کی ہے یعنی ان لوگوں کی جو خدا کو مجسم مانتے ہیں۔ ان کی کوشش بھی یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت دقیقۂ عقل سے حاصل کریں۔

انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام نے اکتفا کیا تھا۔ وہ قرآن کی نص قبول کر لیتے تھے اور سہولت و آسانی کے ساتھ اسے اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ نہ کوئی تکلف ضروری تھا۔ نہ کسی تاویل کی حاجت تھی۔

اللہ عزوجل نے قرآن کریم میں ہمیں خبر دی ہے کہ اس نے اپنی اس کتاب میں آیات محکمات اتاری ہیں۔ ان میں ام الکتاب بھی ہیں اور متشابہات بھی اور یہ کہ جن لوگوں کے قلوب میں کجی ہے۔ وہ متشابہات کی پیروی، فتنہ پسندی اور تاویل پسندی کے باعث کرتے ہیں۔ حالانکہ تاویل کا علم صرف خدائے عزوجل کو ہے اور ان راسخین علم کو جو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے جو کچھ ہمارے رب نے بھیجا ہے۔

چنانچہ سورۃ آل عمران میں وارد ہوا ہے:

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْكَ
الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ
هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ
مُتَشٰبِهٰتٌ، فَاَمَّا الَّذِیْنَ
فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ
مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ
الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ط
وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ
وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ
اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَ
مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ
رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ
اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ
لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ
الْوَهَّابُ۔

یعنی:

وہ ایسا ہے جس نے نازل کیا ہے تم پر کتاب (قرآن)، کو، جس میں کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ اشتباہ مواد سے محفوظ ہیں۔ اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں (اس) کتاب کا۔ اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جن کی مراد مشتبہ ہے (دین میں) شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کے (غلط) مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے حالانکہ ان کا (صحیح) مطلب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ (علم دین میں) پختہ کار اور فہیم ہیں۔ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالاً) یقین رکھتے ہیں (یہ) سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کر اس لیے کہ تو ہم کو ہدایت کر چکا ہے اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت (خاصہ) عطا فرما بلاشبہ تو بڑا عطا فرمانے والا ہے۔

قرآن، آیات قرآن، ام الکتاب اور متشابہات سے متعلق اوپر کی آیتوں میں جو کچھ مذکور ہوا یہ از روئے دین ہر مسلمان کی زبان پر ہونا چاہیے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ عقل کو جو قوت آج حاصل ہے کسی دن اس سے زیادہ بھی حاصل ہو سکے گی یا نہیں ؟ لیکن تحقیق شدہ بات یہ ہے کہ عقل قدما اور عقل اصحاب فلسفہ و علم اللہ کی حقیقت کا انکشاف کرنے میں جس طرح درماندہ چلی آ رہی ہے ۔ اسی طرح رہے گی ، وہ نہ حقیقت الہیہ کا ادراک کر سکتی ہے نہ اس کے صفات کا شعور اسے حاصل ہو سکتا ہے ۔ فلاسفہ اور متکلمین نے جو احکام اس سلسلے میں لگائے ہیں انہیں صرف عقلی دھوکے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

لہذا میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ مؤولین خواہ قدما میں سے ہوں یا فلاسفہ میں سے ، ان کی تاویل دور از کار ہیں ۔ انہوں نے عقل کو رہنمائی سونپی اور دھوکا کھا گئے ۔ انہوں نے وہ باتیں کہیں جو ان کے منہ سے نہیں نکلنی چاہیے تھیں ۔ جن باتوں کے بارے میں نطق و کلام کے یہ سزاوار نہیں تھے ۔ انہوں نے اس چیز کی طمع کی جس کی طمع سے انہیں دامن کشاں رہنا چاہیے تھا ۔ انہیں سزاوار یہ تھا کہ حد سے قدم آگے نہ بڑھاتے ۔ جس جگہ ان کی قوت فہم و ادراک اور شعور و بلوغ ختم ہو گئی تھی ۔ وہیں پر ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ۔ یہ ان کے لیے بہت بہتر ہوتا ۔ ان کے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی جنہیں انہوں نے فتنے میں مبتلا کر دیا تھا ۔

ان کی دور از کار تاویلات نے عجیب عجیب گل کھلائے ہیں ۔ قرآن مجید میں "طیراً ابابیل" کا ذکر آیا ہے ۔ وہ چڑیاں جنہوں نے مکّے کی حملہ آور حبشی فوج پر کنکریاں پھینک کر اسے تباہ کر دیا تھا ۔ یہ عقل پرست "طیرا ابابیل" سے وبا مراد لیتے ہیں اور کنکریوں سے غیر مرئی جراثیم یہ تاویل انہوں نے اپنی طرف سے کی ہے ۔

حالانکہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرام نے سورۃ فیل کا یہ مطلب نہیں لیا تھا ۔ نہ اس نہج پر اسے سمجھا تھا اور وہ اس نہج پر سمجھ بھی نہیں سکتے تھے ۔ یہ ان کے لیے زیبا بھی کب تھا ۔ وہ میکروب[1] سے بالکل نہیں واقف تھے اور نہ کوئی وجہ تھی کہ واقف ہوتے ۔

اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں ہفت آسمان (سماوات سبع) کا جو ذکر آیا ہے

---

[1] جراثیم

اس سے مراد کواکب وسیارہ ہیں۔ یہ بھی اٹکل پچو بات ہے۔ یہ ایسی بات کہہ رہے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب نے کبھی نہیں فرمائی۔

ان تاویلاتِ بعید کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ اور علم کے منکشفات جدیدہ کے مابین ایک طرح کی ملائمت پیدا کریں۔ اور اسی جذبے سے بے بس ہو کر نصوص کی ایسی دور از کار تاویلات کر گزرتے ہیں۔ جو بے بنیاد ہوتی ہیں۔ ان کو قطعاً اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ اس میں اور علم جدید میں کسی طرح کی ملائمت اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ دین اللہ کا علم ہے۔ جس کی کوئی حد و پایاں نہیں۔ اور علم جدید، علم قدیم کی طرح صرف طاقتِ عقل انسانی تک محدود ہے۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ کائنات تک جس میں انسان رہ رہا ہے۔

۲۲

باطنیہ

باطنی فرقے کے معتقدات و تصوراتِ دینی

اور اس سے بڑھ کر لغویت اور سخافت کی انتہا کیا ہوگی کہ ملائمت پیدا کرنے کی کوشش

ان دو۲ میں کی جائے جن میں سے ایک غیر محدود ہے۔ دوسرا محدود — کتنا سچ

فرمایا ہے خدائے بزرگ و برتر نے۔ جب اس نے فرمایا کہ جن لوگوں کا علم راسخ ہے وہ کہتے ہیں

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا هَبْ لَنَا مِنْ

لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ٥

دوسرا بہت بڑا شر جو ان فرقوں کی اختلاف آرائی سے ابھرا اس نے تو مسلمانوں کی

زندگی کو فساد سے بھر دیا۔

یہ شر تھا، تاویل میں غلو کا۔

ایسا غلو جو تصور کی حد سے ماوراء تھا — جس کا عقل تصور بھی نہیں کر سکتی

جسے نصوص قرآن سے کوئی ربط و تعلق نہیں تھا۔

بعض جماعتوں اور گروہوں کو اپنی دعوت پھیلانے کی فکر ہوئی۔

یہ دعوت چوری چھپے تھی ـــــــ پہلے سیاست میں۔ پھر دین میں۔

مثال میں ہم باطنیہ کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔

باطنیہ کا عقیدہ تھا، علم دو[۲] طرح کا ہوتا ہے۔

۱ ـــــ ایک علم ظاہر۔ جس سے عوام آگاہ ہوتے ہیں اور اس پر عمل کرتے رہتے ہیں اور اسے سمجھتے بھی ہیں۔

۲ ـــــ دوسرا علم باطن ـــــ علم باطن کے حامل، ظاہر نص کو ترک کر دیتے ہیں اس لیے کہ یہ صرف عوام کی چیز ہے۔ خواص کی نہیں۔

ظاہر نص کو ترک کرنے کے بعد یہ ایسی تاویلات تلاش کرکے لاتے ہیں۔ جو اصل مفہوم و مقصود سے بالکل جداگانہ اور قطعاً الگ ایک چیز ہوتی ہے[۱]۔ جو از روئے لغت بھی کسی درجہ میں قابل قبول نہیں ہوتی۔ اور جب مسلمانوں نے ان آیتوں کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے تلاوت سنی تھی۔ تو بھی کسی کے حاشیۂ خیال میں وہ تاویل نہیں آئی تھی۔ جو اب پیش کی جارہی تھی۔

اور ان تاویلات میں انہوں نے اس درجہ غلو سے کام لیا کہ گویا ایک نئے دین کے بانی بن گئے۔

◎

---

[۱] اقبال مرحوم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر

تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند

(مترجم)

(۲۳)

تصوّف

کیا اسلام میں رواجی تصوّف کی گنجائش ہے؟

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ تصوف میدان میں آیا۔

شروع شروع میں یہ تصوف عبارت تھا، غلو کے ساتھ زہد سے، زہد میں اتنے اور ایسے غلو کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل پسند نہیں فرمایا تھا۔

حضرت عثمان بن مظعون رحمتہ اللہ علیہ نے جب زہد میں اتنا غلو کیا کہ گویا راہب بن گئے۔ دنیا سے بالکل کنارہ کر لیا۔ اہل خانہ اور متعلقین سے یکسر بے پرواہ ہو گئے اور صبح و شام عبادت و ریاضت میں بسر کرنے لگے۔ تو آپؐ نے انہیں سختی کے ساتھ اس سے روکا۔ اور اپنا اور دوسروں کا حق ادا کرنے کی تاکید فرمائی۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص بڑے برگزیدہ صحابی تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے صوم دہر[1] کی

---

[1] صوم دہر یعنی صوم مسلسل، بغیر کسی وقفے کے روزے رکھتے چلے جانا۔ (مترجم)

ٹھان لی۔ تو آپؐ نے انہیں روکا اور باز رکھا۔

اسی طرح جو لوگ قرأت قرآن میں غلو کرتے تھے۔ انہیں بھی آپؐ نے ٹوکا۔ آپؐ کی خواہش یہ تھی کہ آپؐ کے اصحاب اپنے دین میں رفق اور اعتدال کو مدِ نظر رکھیں نماز پڑھیں، روزے رکھیں، عبادت کریں۔ لیکن نہ اس کثرت سے کہ باقی مزید چیزیں ایک ناقابل برداشت بوجھ بن جائیں۔ اور طبیعت ان سے اکتا جائے۔

آپؐ نے اپنے صحابہ کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ آسانی چاہتا ہے نہ کہ سختی۔ اس بات کی بھی آپؐ نے وضاحت فرمادی کہ دین میں سہولتیں بہت زیادہ دی گئی ہیں۔

جو صحابہ اپنے مزاج اور افتاد طبیعت کے لحاظ سے نماز، روزے اور عبادت میں غلو کرتے تھے۔ نماز پڑھتے تھے تو پڑھتے چلے جاتے تھے۔ روزے رکھتے تھے تو رکھتے چلے جاتے تھے۔ عبادت کرتے تھے تو بس کرتے چلے جاتے تھے۔ انہیں آپؐ نے حکم دیا کہ روزے بھی رکھیں۔ اور افطار بھی کریں۔ شب بیداری بھی کریں اور سوئیں بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ نے جو کچھ ان کے لیے حلال کر دیا ہے اسے —— اپنی انتہاپسندی اور غلو کے باعث —— اپنے اوپر حرام نہ کریں۔

اس باب خاص میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وضع احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بعض عبادتیں چھپ کر کرتے تھے۔ اس اندیشے سے کہ آپؐ کی تقلید کے شوق میں لوگ اس تکلیف ما لا یطاق کو اختیار کرلیں گے۔ اور (بعد میں) یہ چیز انہیں گراں گزرے گی۔

چنانچہ آپؐ نے لوگوں کو صوم وصال[1] رکھنے سے منع فرمایا۔ آپؐ کی ممانعت کا یہ حکم

---

[1] صوم وصال وہ روزہ ہوتا ہے۔ جس میں شب و روز کا روزہ رکھا جاتا ہے۔ صرف دن کا نہیں۔ (مترجم)

سن کر بعض لوگوں نے عرض کیا۔

" مگر آپ بھی تو صوم وصال رکھتے ہیں "۔

آپ نے ارشاد فرمایا۔

" (ہاں لیکن) میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ میرا رب مجھے کھلاتا ہے۔ مجھے پلاتا ہے"۔

اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو عبادت میں برداشت اور سختیوں کو جھیل لے جانے کی جو قوت مرحمت فرمائی تھی۔ وہ دوسرے لوگوں کو عطا نہیں ہوئی تھی۔

لیکن اس کے باوجود:

آپؐ کی تنبیہہ اور احتیاط کے باوجود زہد اپنی جگہ بناتا چلا گیا۔

امت مسلمہ کے صلحاء کی ایک جماعت نے زندگی کی آسائشوں اور رعنائیوں میں حصہ لینے سے بالکل اجتناب کیا۔

ان لوگوں نے اپنے نفس پر زیادہ سے زیادہ تشدد کیا۔

عبادت وریاضت میں شب و روز انہماک وظیفہ حیات قرار دیا۔

لذاتِ دنیوی سے یکسر اعراض کو روا رکھا۔

لیکن یہ کوئی ایسی حرج کی بات نہ تھی۔

ہر شخص کو حق ہے کہ اگر اپنے میں سکت پاتا ہے تو زہد کو اختیار کرلے۔ عبادت وریاضت کو اپنا شعار بنالے۔ لذاتِ دنیوی سے کوئی لطف نہ لے۔ لیکن اپنی اس انتہا پسندی اور غلو سے کسی دوسرے کی اذیت یا آزار کا سبب نہ بنے۔

لیکن بہت جلد اس زہد نے فرقوں کی نشو و نما کے دور میں اپنے قالب کے اعتبار سے بعض تبدیلیاں قبول کرنا شروع کردیں۔

اس نے اپنے اندر زیادہ سے زیادہ پیچیدگیاں پیدا کرنے کا آغاز کر دیا۔
یہاں تک کہ وہ تصوف نشو و نما پا کر ابھرا۔ جسے ہم پہلی صدی ہجری کے اواخر میں دیکھتے ہیں۔

اور جب مسلمانوں کو اجنبی ثقافتوں اور مذہبوں سے دوچار ہونا پڑا تو اس تصوف نے اپنی پیچیدگیوں میں اور زیادہ اضافہ کر لیا۔
مسلمانوں نے ایرانی اور ہندی ثقافت سے جو تاثر قبول کیا تھا۔ یہ تصوف اس سے بھی کسی نہ کسی درجے میں متاثر ہوا۔ مسلمان خاص طور پر یونان کی ثقافت سے اثر پذیر ہوئے تھے۔ یہ تصوف بھی اس سے مستغنی اور بے پروا نہ رہا۔
نتیجہ یہ نکلا کہ تصوف صرف زہد و عبادت سے عبارت نہ رہا۔ صرف نفس کشی اور تزکیہ باطن کے لیے وقف نہ رہا۔ بلکہ اس نے اللہ سے اتحاد اور اتصال کے مسائل فلسفیانہ پر بھی غور و خوض کرنا اور حصہ لینا شروع کر دیا۔ اللہ کی معرفت بہ طریق اشراق بھی تصوف کے حدود و عمل میں داخل ہوگئی۔

معاملہ اور آگے بڑھا:

باطنی مذاہب سے تصوف کا اختلاط شروع ہوا اور جیسے جیسے یہ اختلاط بڑھتا رہا، ویسے ویسے اس کی پیدا کردہ اور ایجاد کردہ تعقیدات اور پیچیدگیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔
شئون دین کے بارے میں عوام جو کچھ جانتے اور سمجھتے تھے، تصوف نے اس سے ہٹ کر اپنے لیے ایک الگ اور نیا راستہ بنا لیا۔
اس اقدام نے تصوف کی بجائے خود ایک مذہب بنا دیا ——— صرف ایک مذہب نہیں۔ بلکہ مجموعۂ مذاہب
تصوف ایک مذہب تھا اور اس مذہب کے اندر اور بھی کئی مذہب موجود تھے۔

———— اور یہ مذاہب تصوف ایک دوسرے سے برسرِ پرخاش اور باہم دست و گریباں بھی تھے۔

فقہاء، محدثین اور متکلمین جن چیزوں پر نکیر کرتے تھے جنہیں قابلِ اعتراض سمجھتے اور مذموم گردانتے تھے۔ نام نہاد صوفیوں نے انہی چیزوں کو اپنا لیا۔ اور ان کی زبان پر وہی ممنوعہ باتیں چڑھ گئیں

اس کا انجام جو ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔

یعنی اس مذہب کے بعض اکابر کو شدید ترین ابتلاء اور مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔ جو کبھی قتل کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ کبھی پھانسی کی ———— مثال میں منصور حلاج کا نام لے دینا کافی ہے۔

———— ❖ ————

ایک بات تصوّف کے سلسلے میں یہ بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ صرف اسلام ہی کے اندر تصوف محدود و مقصور نہیں ہے بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے۔ اور مسیحیت میں تو تصوف کو ایک خاص اور امتیازی مقام حاصل ہے

ان متصوفین اسلام نے پہلے اپنے اوپر زیادتی کی۔ پھر عام لوگوں کو بھی اس زیادتی کا حصے دار بنالیا۔

———— ❖ ————

مسلمانوں میں جب جہل اور جمود کی کار فرمائی بڑھی تو امر تصوف دجل کی صورت میں رونما ہوا۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ عامۃ الناس کو اس سے شر کثیر حاصل ہوا۔ فائدے کا پلّہ ہلکا رہا۔ لیکن نقصان کا پلہ نیچا ہوتا چلا گیا۔

(۲۴)

"رائے" کا فتنہ

فقہائے مدینہ اور فقہائے عراق کا اختلافِ فکر

گزشتہ صفحات میں اختلاف بین المسلمین کی جو کیفیت ہم نے پیش کی ہے معاملہ وہیں آکر ٹھہر نہیں گیا۔ بلکہ اس نے اور زیادہ خوفناک اور خطرناک صورتیں اختیار کر لیں۔

یہ اختلاف استنباط احکام میں بھی رونما ہوا۔ جن کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے تھا۔ اپنی اجتماعی زندگی میں وہ ان احکام کے محتاج تھے۔ اور صرف اجتماعی زندگی ہی میں نہیں۔ بلکہ عبادات میں جن احکام کے محتاج تھے۔ وہ بھی اختلاف کی زد سے نہ بچ سکے۔

دینی احکام کا اختلاف صرف فقہا تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ مختلف گوشوں تک پہنچا اور اپنی جگہ بناتا رہا۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اہل حجاز احکام کا استنباط قرآن اور سنت سے کیا کرتے تھے۔ یا پھر اجماع صحابہ سے۔ اور یہ صورت بھی نہ ہو تو اکابر اور ممتاز صحابہ کے عمل کو اپنا رہنما بنا کر احکام مستنبط کر لیا کرتے تھے۔

یہ کیوں تھا؟

اس لیے کہ اہلِ حجاز اس حقیقت کے رمز آشنا تھے کہ صحابہ کا کسی مسئلے پر اجماع سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور چیز پر ہو ہی نہیں سکتا۔

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اکابر صحابہ ذاتِ نبوی سے اتصال پر ہر چیز قربان کر دینے کو تیار رہتے تھے۔ وہ اپنے وقت کا اپنی فرصت کا بڑا حصہ آپؐ کی خدمت میں صرف کرتے تھے آپؐ کے عمل کو دیکھتے تھے۔ آپؐ کے قول کو سنتے تھے۔ آپؐ کی تعبیر و تفسیر سے واقف رہتے تھے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ دین کو جس طرح انہوں نے سمجھ لیا کوئی نہیں سمجھ سکا یہ اپنے احکام میں پیشِ نظر صرف سنت نبویؐ کو رکھتے تھے۔

اہلِ عراق احکام کا استنباط قرآن، سنت اور اجماع سے کرتے تھے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اسے بھی معیوب نہیں خیال کرتے تھے کہ اگر ضرورت کا تقاضا اور مصلحت کا اصرار ہو تو مذکورہ اصولوں ——— قرآن، سنت، اجماع ——— کی روشنی میں "رائے" سے بھی کام لیں۔ اور ایسے احکام مستنبط کریں۔ جو رائے پر مبنی ہوں۔

یہ چیز جنگ و پیکار کا سبب بن گئی اور ہر دو فریق ——— اہلِ حجاز اور اہلِ عراق ——— میں نوبت رزم و حرب تک پہنچ گئی۔

اصحاب رائے کی جماعت بھی متحد نہ تھی۔ اس میں بھی اختلافات پیدا ہونے لگے

ان اختلافات کا نتیجہ یہ نکلا کہ فقہ کثرتِ کلام کا مجموعہ بن گیا۔ بالکل اس طرح جیسے اس سے پہلے ان لوگوں کے مابین کثرت کلام نے ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا۔ جو استنباط احکام میں اصول دین کے ماتحت مشغول رہتے چلے آئے تھے۔ اور فرقہ قدریہ سے متعلق تھے۔

اب صورت احوال یہ تھی کہ ایک فقہ شیعہ کی تھی۔ ایک فقہ خوارج کی تھی۔ اسی طرح دوسرے فرقوں کا حال تھا۔ یہ سب استنباط احکام میں خواہ وہ سیاست سے متعلق ہو یا مذہب سے، اپنے مذہب اور مسلک کو دوسرے کے مسلک اور مذہب کے خلاف

چلاتے تھے۔

اس طرح اصول اور فروع کے اندر اختلاف بین المسلمین پیدا ہوا۔ اور حدّکمال تک پہنچ گیا۔ بلکہ اس کے آگے اگر کوئی درجہ ہوتا تو شاید وہاں تک بھی ؟

ان باتوں کا نتیجہ وہی نکلا۔ جو ان سے پہلے کی اور بعد کی امتوں اور قوموں میں نکلا تھا۔ ـــــــ یعنی ضعف، جہل اور انحطاط ! جس کے بعد یہ شرعظیم کے گرداب میں پھنس کر رہ گئے۔

(۲۵)

تعصّبؑ

جس نے امّتِ مسلمہ کی جڑیں ہلادیں،

قبل اس کے کہ ہم اس جہل اور حیاتِ مسلمین پر اس کے شر و فساد سے متعلق گفت گو کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تعصب کو مختصر سے وقفے کے لیے زیر بحث لائیں۔ جو اصول و فروع میں فرقہ آرائی کی کثرت نے پیدا کر دیا تھا۔

احزابِ سیاسی کا جہاں تک تعلق ہے۔ شروع شروع میں انہوں نے کفر سازی کا وطیرہ اختیار کیا۔ اور جب موقع ملا تو پھر ایک دوسرے کا خون بھی اپنے اوپر حلال کر لیا اور قتل و غارت کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ موقع ملا تو شورش اور بغاوت اور خروج سے بھی گریز نہیں کیا۔

کلامی فرقے کبھی مخالفوں پر کفر کا وار کرتے تھے۔ کبھی اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کو فاسق قرار دیتے تھے۔ اور اگر کبھی انہیں سیاست میں درخور حاصل ہوجاتا یا حکام کے قلوب و عقول پر استیلا، حاصل ہوجاتا تو وہ اپنے مخالفوں کو ضرب، قتل اور زنداں کے امتحان و ابتلاء سے گزرنے پر مجبور کر دیتے۔ جیساکہ اس وقت پیش آیا تھا جب مامون پر

معتزلہ حاوی ہو گئے تھے۔ اور اس کے دل میں خلق قرآن کا مسئلہ اس طرح جما دیا تھا۔ کہ وہ اس کا ایمان بن گیا تھا۔ اور دوسروں سے اسے منوانے کے لیے اس نے قوت وسطوت سے کام لے کر جبر و استبداد کے مظاہرے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس قول کو دین کے اصول و فروع میں کوئی اہمیت نہیں حاصل تھی۔ یہ صرف غلو کا نتیجہ تھا جس نے تعصب کی خوفناک صورت اختیار کر لی تھی۔

معتزلہ کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالٰی کے صفات اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالٰی عالم بذاتہ اور قادر بذاتہ ہے۔ اس کو انہوں نے توحید کے نام سے موسوم کیا تھا۔

اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اللہ تعالٰی نے قرآن کریم میں خبر دی ہے کہ اس نے:

- موسٰی علیہ السلام سے کلام کیا۔
- محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا۔
- محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ جو کچھ ان پر نازل کیا جاتا ہے۔ اسے دوسروں تک پہنچائیں اور تبلیغ کریں۔
- محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو احکام دیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اپنے مخاطبین سے اشیاء مختلفہ پر گفتگو کریں۔ لہذا آپؐ کا تخاطب کبھی مسلمانوں سے تھا کبھی کافروں سے، کبھی پوری انسانیت سے۔ اور اس تخاطب میں مختلف چیزیں بیان کی جاتی تھیں۔

پس ان تمام باتوں سے معتزلہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ خدا کا کلام مخلوق اور حادث و فنا پذیر ہے۔ پہلے وہ نہیں تھا۔ پھر اسے عالم وجود میں لایا۔ اور اپنے انبیاء پر وقتاً فوقتاً نازل کیا۔ لہذا قرآن کی حیثیت وہی ہے جو انسانوں کی مرتب اور تصنیف کی ہوئی کتابوں کی ہوتی ہے۔ فرق جو کچھ ہے وہ یہ کہ اسے اللہ نے منضبط کیا ہے اور دوسری کتابوں کو

انسان مرتب اور منضبط کرتا ہے۔

اگر معتزلہ نے صرف اتنا ہی کہا ہوتا تو وہ جانتے اور ان کا خدا۔ لیکن انہوں نے اپنے ذہن و دماغ کی اس اپج کو صرف الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا۔ بلکہ اس سے لوگوں کو فتنہ و فساد میں بھی مبتلا کیا۔

یہ معتزلہ خلیفہ مامون الرشید پر حاوی ہوگئے۔ اور یہ بات اس طرح اس کے دل میں ڈال دی کہ اس نے اس کے عقیدے کی صورت اختیار کر لی۔

انہوں نے مامون کو اس بات کا بھی قائل کر لیا کہ جو شخص قرآن کو حادث (فنا پذیر) نہیں مانتا۔ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے۔ اور دین سے خارج ہو جاتا ہے۔

کیونکہ اگر قرآن کو قدیم (غیر فنا پذیر) مان لیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف خدا ہی قدیم (غیر فنا پذیر) نہیں ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز —— قرآن —— بھی ہے۔ گویا دو قدیم لازم آئے۔

اور جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ اس کے خارج از دین اور کافر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

کیونکہ قدیم تو صرف خدا ہے۔ جو یکتا ہے۔ جس کا کوئی ساجھی نہیں۔ جس کا کوئی مثل نہیں۔

ان لوگوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ کہ مامون کے دل میں یہ باتیں ڈال دی ہوں۔ اور خاموش ہوگئے ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کیا کہ مامون کو اس پر آمادہ کیا کہ اپنی اس رائے یا عقیدے کو لوگوں پر تھوپے۔ مسلمانوں سے قرآن کے حادث ہونے کا اقرار کرائے۔

اور اس مہم کا آغاز علماء، فقہاء اور محدثین سے کیا جائے۔

تھوڑے سے تردد اور تامل کے بعد مامون نے یہ بات بھی مان لی۔ اور علماء مسلمین کے ابتلا اور امتحان کے درپے ہوگیا۔ چنانچہ مامون نے:

: حکومت کے تمام متوسلین اور ملازمین پر یہ بات عائد کر دی کہ خلق قرآن یعنی قرآن کے حادث ہونے کو تسلیم کریں۔

: پھر یہی بات اس نے عامۃ المسلمین پر عاید کردی۔ اور لوگوں سے خلق قرآن کا اقرار کرانے لگا۔

: اس سلسلے میں پہلا وار اس نے قضاۃ، عمال اور شہود (گواہوں) پر کیا یعنی جو قاضی خلق قرآن کے عقیدے کو تسلیم نہ کرے، وہ برطرف جو عامل اور حاکم قرآن کو حادث نہ مانے وہ برخاست۔ جو شہود (گواہ) اس عقیدے کو تسلیم نہ کریں ان کی گواہی ہر حالت میں نامقبول اور مردُود!

: وہ کہتا تھا کہ دولتِ اسلامیہ کے مناصب عالیہ پر مشرکین سے کام، خدمت اور مدد لینے کو ضرورت نہیں۔ اور جو لوگ قرآن کو حادث نہیں مانتے۔ وہ مشرک ہیں۔

: مامون نے اپنے عمالِ دولت کو حکم دیا کہ وہ اس باب میں قاضیوں کا جائزہ لیں۔ جو اس عقیدے کو تسلیم کریں انہیں ان کے منصب پر بحال رکھا جائے اور جو لوگ اسے تسلیم کرنے سے انکار کریں انہیں فوراً معزول کر دیا جائے۔

: اس نے قاضیوں کو حکم دیا کہ وہ شہود (گواہوں) کا امتحان لیں اور صرف اس شخص کی گواہی قبول کریں جو قرآن کو مخلوق مانتا ہو۔ اور اس بات کو علے الاعلان تسلیم کرتا ہو کہ قرآن کے حادث ہونے پر وہ ایمان اور عقیدہ رکھتا ہے

: دار و گیر اور تشدد کے اس دور میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے تقیہ کرتے ہوئے اور متوقع مصائب اور حوادث سے بچنے کے لئے اس عقیدے پر اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔

: لیکن ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اس عقیدے کو قبول کرنے سے صاف

الفاظ میں انکار کر دیا

: ان لوگوں کو نذر زنداں کر دیا گیا۔

: انہیں مارا پیٹا گیا۔ اور ہدف تشدد بنایا گیا۔

: اور اگر مامون زندہ رہتا تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے مخالف علماء کو قتل کر کے دم لیتا۔ کیونکہ اس نے حاکم بغداد کو حکم دے رکھا تھا۔ کہ وہ علماء کا امتحان لے۔ ان میں سے جو عالم قرآن کے حادث ہونے کا اقرار اور اس عقیدے پر اپنے ایمان کا اعلان کر دے۔ اُسے چھوڑ دے۔ اور جو ایسا نہ کرے اس کی گردن اڑا دے اور کٹا ہوا سر اس کی خدمت میں بھیج دے۔

مامون نے جب حاکم بغداد کے نام یہ فرمان صادر کیا تو وہ عراق سے باہر جا رہا تھا کہ شاہ روم سے نبرد آزما ہو

اسی زمانے میں امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کو سخت ترین ابتلاء اذیت اور بلاء عظیم سے دوچار ہونا پڑا۔

لیکن امام صاحب ایک مرد عظیم بھی تھے اور ایک بطل جلیل بھی۔ انہوں نے ایک عظیم انسان اور جلیل القدر بطل کی طرح ابتلاء کے اس دور کو برداشت کر لیا۔ زنداں کی صعوبتیں جھیلیں۔ اور اف تک نہ کیا۔

صرف یہی نہیں کہ طویل مدت تک جیل کی تکلیفیں برداشت کی ہوں۔ بلکہ وہ ضرب شدید بھی برداشت کی جس نے انہیں اتنا ناتواں کر دیا کہ یہ چیز ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

معتزلہ نے مامون کے دل میں یہ عقیدہ کچھ اس طرح جاگزیں کر دیا تھا کہ اس معاملے میں اس

کی کیفیت ایک دیوانے اور مجنوں شخص کی سی ہوگئی تھی۔

اگر کہیں اپنے اس سفر میں وہ مرنہ جاتا تو شاید خدا کی یہ زمین شر و فساد سے معمور ہو جاتی۔

مامون کے بعد واثق اور معتصم علی الترتیب مسند نشین خلافت ہوئے۔ یہ دونوں بھی مامون کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ لیکن اعتدال کے ساتھ ——— ان میں وہ سختی اور درشتی نہ تھی جو مامون کی سیرت بن گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان دونوں نے بازارِ قتل گرم نہیں کیا۔ جیسا کہ مامون فیصلہ کر چکا تھا۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفا کیا کہ جن لوگوں نے قرآن کے حادث ہونے کا عقیدہ تسلیم نہیں انہیں جیل بھیج دیا۔ یا کوڑے لگوا کر لہولہان کر دیا یا ان کی املاک و جائیداد ضبط کر لی۔ قتل سے محفوظ رکھا۔

اور اگر واثق اور معتصم کے بعد متوکل نے اور زیادہ میانہ روی اور رواداری سے کام لے کر اس مسئلے کو ختم نہ کر دیا ہوتا۔ اور اس باب میں مسلمانوں سے تعرض کرنا ترک نہ کر دیا ہوتا۔ تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خلافتِ عباسیہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔ اور وہ ایسی تباہی سے دوچار ہوتی۔ جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا [1]

---

[1] امر واقعہ یہ ہے کہ معتزلہ کے برپا کیے ہوئے اس فتنے نے سارے عالم اسلام میں تزلزل برپا کر دیا۔ علماء صلحاء اور اساطین امت کو اس بے دردی اور شقاوت کے ساتھ کبھی بھی یکساں اور مسلسل طور پر اتنی طویل مدت تک ہدف ستم نہیں بنایا گیا تھا۔ جتنا ان تینوں ——— مامون، واثق اور معتصم ——— کے دور میں کیا گیا۔

بلاشبہ یہ مطلق العنانی کا دور تھا۔

بادشاہ وقت کے منہ سے نکلا ہوا ہر بول ایک فرمان کی حیثیت رکھتا تھا۔ ملوک وسلاطین کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی کسی میں ہمت اور سکت نہیں تھی۔

(حاشیہ ص ۳۲۳) علمار اس لیے طرح دے جاتے تھے کہ وہ حتی الامکان اپنے فعل یا اقدام سے امت میں تفرقہ پیدا کرنا۔ اور اسلامی حکومت کو کمزور کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اور عوام اس لیے خاموش رہتے تھے کہ وہ تن تنہا بغیر کسی سردار اور رہنما کے میدان میں نہیں آ سکتے تھے۔

لیکن عوام اور خواص یا دوسرے الفاظ میں علما اور غیر علمار کی اس مداہنت اور چشم پوشی کی بھی ایک حد تھی۔ اور اس حد کو اگر حالات یہی رہتے تو ایک نہ ایک دن ضرور ٹوٹنا تھا۔

امام احمد بن حنبل سے پہلے تشدد اور سختی کا جو دور شروع ہوا تھا۔ وہ گو انتہائی المناک اور روح فرسا اور تکلیف دہ تھا۔ لیکن عوام کے قلوب پر اس نے اتنا اثر نہیں کیا تھا کہ وہ شعلۂ جوالا بن جاتے۔

لیکن امام صاحب جب ہدف ستم بنے تو پانی چھلکنے کے قریب ہو گیا۔

اس لیے کہ امام صاحب صرف ایک عالم، ایک محدث اور ایک مجتہد ہی نہیں تھے۔ وہ اپنی ذات اور شخصیت کے اعتبار سے بھی یگانہ اور یکتا تھے۔ ان کا زہد و تقویٰ۔ ان کی پاکیزہ سیرت اور طاہر کردار، ان کی بے لوثی، ان کا استغنا، ان کا ایثار، ان کی علمی، دینی اور مذہبی خدمت، یہ ساری چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے لوگوں کو ان کا والہ و شیدا بنا دیا تھا۔ لوگ ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ ان سے عقیدت بھی رکھتے تھے۔ اور ان پر قربان ہو جانے کا جذبہ بھی رکھتے تھے

جب برسرعام اس طرح امام صاحب کی توہین ہوئی اور انہیں ہدف مصائب بنایا گیا انہیں جیل کی چار دیواری میں بند کر دیا گیا۔ اور دربار کے اندر ان کے جسم نحیف پر کوڑوں کی بارش ہوئی اور اس سزائے تازیانہ نے انہیں نیم جان اور لہولہان کر دیا۔ تو ایک خاموش اضطراب سا سارے عالم اسلام میں پیدا ہو گیا۔

اس اضطراب کے آثار نمایاں نہیں تھے۔ بالکل اس طرح جیسے طوفان سے پہلے سمندر

کی پرشور موجیں مائل بہ سکون ہوجاتی ہیں ۔ اور لوگوں کو وہم بھی نہیں گزرتا کہ ایک ہولناک طوفان سر پر کھڑا ہے ۔

لیکن جس طرح اہل نظر آنے والے طوفان کو سمندر کے پرسکون ہونے کے باوجود بھانپ لیتے ہیں ۔ اسی طرح ماہرین نفسیات بھی اس شورش اور یلغار کا اندازہ کر لیتے ہیں جو ارباب اقتدار کی نافہمی کے باعث روز بروز یقینی ہوتا جاتا ہے ۔

متوکل یقیناً دانش مند شخص تھا ۔ جس نے اس طوفان کا اندازہ کر لیا اور دور اندیشی سے کام لے کر اس فتنے کی جڑ کاٹ دی جو موج بلا بن کر امنڈنے والا تھا ۔

(رئیس احمد جعفری)

(۲۶)

رَوادَاری

جس کی اہمیّت اسلام میں مسلّم ہے۔

بہر حال جن لوگوں کی فطرت میں تعصب رچا ہوا تھا۔ اور جو لوگ غلو کو اپنی سرشت بنا چکے تھے۔ جب کبھی بھی اقتدار و اختیار کی باگ ان کے ہاتھ میں آئی۔ اور حکومت کے ایوان میں انہیں عروج حاصل ہوا تو انہوں نے اپنے سے اختلاف رکھنے والوں اور اپنے مخالفوں کو کچلنے اور پامال کرنے میں۔ بلکہ حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

منصور حلاج، امام احمد بن حنبل اور دوسرے اکابر و اعیان کے قتل و ضرب کے حالات ناگفتہ بہ کی طرف گذشتہ صفحات میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ لیکن معاملہ صرف بغداد یا عراق میں تک محدود نہیں تھا۔ دوسری جگہوں پر بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب —— اندلس اور افریقہ —— میں بھی اسی نقشِ قدم کی پیروی ہو رہی تھی۔

وہاں بھی ایسے لوگ تھے جو سجن و زنداں کی چار دیواری میں آہنی سلاخوں کے پیچھے بدف

ستم بنائے جا رہے تھے۔ جیسے ابن رشد اور ایسے بھی تھے۔ جن کی کتابیں نذرِ آتش کر کے جلائی اور پھونکی جا رہی تھیں۔ جیسے ابن حزم ؎

؎ زمانے کی ستم ظریفی کیا چیز ہے،

یہی ابن رشد، جو اپنے معاصرین کے دور میں سزائے جیل کے مستحق تھے۔ اور یہی ابن حزم جن کی کتابیں ان کے ہم عصر جلا رہے تھے۔ بعد کی آنیوالی نسلوں نے انہیں علم وفضل کی اقلیم کا تاجدار تسلیم کیا۔

ابن رشد کا فلسفے میں جو مقام ہے وہ ایک طرف اسے فلاسفۂ یونان کا ہمسر بناتا ہے۔ تو دوسری طرف علم دین میں اس کی وسعت نظر، تحقیق وتدقیق، ژرف نگاہی اور مہارت فن اسے مجتہد کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ اس کی بدایۃ المجتہد مذاہب فقہیہ اتنا بڑا گنج گراں مایہ ہے۔ کہ آج تک عربی زبان میں ایسی جامع مانع اور مجتہدانہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب کا مطالعہ انسان کو نہ صرف دوسری کتب فقہیہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ بلکہ وہ خود اپنے اندر ملکۂ اجتہاد محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور ایک کتاب کی یہ اتنی بڑی خوبی ہے۔ جس کے آگے دوسری خوبیاں ہیچ ہیں۔

اس طرح علامہ ابن حزم ظاہری ——— ان کے بعض آراء و افکار سے اہل علم کی ایک جماعت کو اگر اختلاف تھا یا ہے۔ تو اس سے ان کے علمی مقام اور مرتبہ رفیع پہ کوئی حرف نہیں آسکتا۔ چنانچہ نہیں آیا۔ آج کون ہے جو ابن حزم کا نام سن کر فرطِ عقیدت واحترام سے سر نہ جھکا دیتا ہو۔

(رئیس احمد جعفری)

اور ان شر پسندوں اور فتنہ سامانیوں اور فساد انگیزیوں کا مرکز وہی لوگ ہیں جو موقع پا کر اقتدار و اختیار کے ایوان میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے بعد سفاکی اور شقاوت کا مظاہرہ شروع کر دیتے ہیں۔

مشرق میں جو کچھ معتزلہ نے کیا تھا۔ وہی کچھ بلکہ اپنے حدود کے اندر اس سے بھی بڑھ چڑھ کر مغرب اسلامی کے فقہا نے کیا۔

انہوں نے بعض حکام کو اپنی فکر ورائے سے اتنا متاثر کر دیا کہ ان پر حاوی ہو گئے اور انہیں واسطہ بنا کر من مانی کرنے لگے۔

یہ اس درجہ غلو پسند تھے کہ انہوں نے اپنی رائے کو رائے کی حد سے نکالا۔ اور فرض کے درجے تک پہنچا دیا۔ جس کا ماننا اور جس کی تعمیل ہر ایک پر لازمی ہے۔ اور جو اس فرض کے ماننے سے انکار کرے۔ وہ مستحق تعزیر و عقوبت ہے۔

یہ لوگوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ ان کی آنکھ سے دیکھیں، ان کے دماغ سے سوچیں۔ ان کے کان سے سنیں۔ اور ان کی زبان سے بولیں۔

یہ اَن ہونی سی بات تھی۔ لیکن اپنی ان ہونی بات پر یہ حد درجہ بضد تھے۔ ہر قیمت پر اسے نافذ اور معمول بہ دیکھنا چاہتے تھے۔

یہ لوگوں سے اس طرح اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔ جو سنت نبوی اور اسوۂ رسولؐ کے سراسر خلاف تھا۔

یہ لوگ حامل قرآن اور عارف سنت تھے۔

ان کی نگاہ سے یہ حقیقت اوجھل نہیں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور آپؐ کے "اصحاب مومنوں" نے مدینے اور دشت وصحرا کے منافقین کے ساتھ ـــــــ جو ہرگز مسلمان نہیں تھے۔ صرف ظاہر میں مسلمان بنے ہوئے تھے کہ ان کے مصالح کا تقاضا یہی تھا ـــــــ کیا سلوک کیا تھا؟

یہ جانتے تھے اور بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی ۔کسی کے ساتھ بُرا برتاؤ نہیں کیا ۔ آپؐ لوگوں کی ایذا رسانی اور مخالفت کو صبر و تحمل کے ساتھ انگیز کرتے تھے ۔ گستاخوں اور بدتمیزوں ، بلکہ بدترین دشمنوں تک کو معاف فرما دیتے تھے ۔ آپؐ کی کوشش صرف یہ رہتی تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے ۔ گمراہوں کو راہِ راست پر لے آئیں ۔ جو سیدھے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں انہیں راہِ صواب پر گامزن کر دیں ۔ جنہوں نے حق کو چھوڑ دیا ہے انہیں رشد و ہدایت کی منزل تک پہنچا دیں ۔ اور اگر ایسا نہ کر سکیں تو ـــــ

اور اگر نہ کر سکیں تو خدا سے دست بدعا ہو کر ان کی ہدایت کے طالب ہوتے تھے ۔ چاہتے تھے اللہ کی رحمت بے کراں ان کے قلوب کو اسلام کے لیے کھول دے ۔ ان کے دلوں میں اسلام کو پیوست کر دے ۔

چنانچہ آپؐ ان ـــــــ منافقین ـــــــ کی زندگی میں ان کے لیے استغفار کرتے رہے تھے ۔ اور ان کے مرنے پر ان کی نماز (جنازہ) پڑھانے پر تیار اور آمادہ رہتے تھے ۔ یہاں تک کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا :۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ	یعنی : (اے محمدؐ) آپؐ ان (منافقین) کے لیے دعاءِ مغفرت کریں ۔ یا نہ کریں یا ستر مرتبہ بھی ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں خدا ہرگز انہیں نہیں بخشے گا ۔

اور پھر اس کے بعد خدائے عزّ و جل نے آپؐ سے ارشاد فرمایا :

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا ، وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ	یعنی : (اے محمدؐ) ان (منافقین) میں سے کسی کے مرنے پر آپ کبھی نماز نہ پڑھائیں ۔ نہ ان

میں سے کسی کی قبر پر کھڑے ہوں۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ عمر بن الخطاب، نیز بعض دوسرے صحابہ نے منافقین کی شرارت اور فتنے سے بے قابو اور مشتعل ہو کر آپؐ سے اذنِ قتل طلب کیا۔ لیکن آپؐ نے ہمیشہ انکار کیا۔ کسی کو بھی اس کی اجازت نہیں دی۔

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق کے موقعے پر ایک مہاجر اور انصار میں سے ایک شخص کے مابین کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔

فریقین میں سے ہر ایک نے اپنے جتھے کے آدمی کا ساتھ دیا۔ یعنی مہاجرین مہاجر کی طرف ہو گئے اور انصار نے اپنے آدمی کا ساتھ دیا۔

یہ خبر عبداللہ بن ابی بن سلول کو پہنچی۔ جو مدینے کے منافقوں کا سردار تھا۔ اس نے سنتے ہی کہا:

"ہمیں مدینہ واپس پہنچ لینے دو، وہاں جا کر معزز (انصار) لوگ، ذلیل (مہاجر) لوگوں کو نکال باہر کر دیں گے۔"

بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ عمر بن الخطاب نے کہا:

"اجازت ہے اس منافق کو قتل کر دوں؟"

آپ نے انکار کیا اور فرمایا:

"کیا تم چاہتے ہو کہ لوگ یہ کہیں کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرا دیا کرتے ہیں؟"

عبداللہ بن ابی بن سلول نے جو کچھ انصار اور مہاجرین کی لڑائی کے موقعے پر کہا تھا۔ اللہ تعالٰے نے قرآن میں اس کا ذکر فرمایا ہے:

يَقُولُونَ لَئِنْ رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ

یعنی:
یہ (منافق لوگ) کہتے ہیں کہ ہم مدینے

مِنْهَا الاذل ۔ وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَ لِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝	پہنچ ہیں۔ تو معزز لوگ ذلیلوں کو وہاں سے (نکال) باہر کر دیں گے۔ حالانکہ ساری عزت خدا کے لیے، اس کے رسولؐ کے لیے اور مومنین کے لیے ہے۔ لیکن منافقین (اس بات کو) نہیں جانتے۔

جنگ حنین کے مال غنیمت کی تقسیم کے موقعے پر ایک شخص[1] نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم پر اعتراض کیا۔ یہ اعتراض آپؐ کی اس بخشش پر تھا۔ جو آپؐ نے مؤلفۃ القلوب[2] کے لیے خاص طور پر روا رکھتے ہوئے انہیں دوسروں سے کچھ زیادہ دے دیا تھا۔

معترض نے یہ اعتراض آپ؟ کے روبرو کیا تھا۔ اس نے کہا:

"اے محمدؐ عدل کر۔ تو عدل نہیں کر رہا ہے۔"

آپؐ نے جواب میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا:

"بدبخت — اگر میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا؟"

اس موقعے پر بھی آپؐ کے بعض اصحاب نے اس گستاخی اور دریدہ دہنی کے جرم میں اسے قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔ مگر آپؐ نے صاف انکار فرما دیا

اللہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ ان منافقین کے سینوں میں اسلام کے بجائے کفر بسا ہوا ہے

---

[1] یکے از انصار

[2] مؤلفۃ القلوب سے مراد وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ لیکن اسلام ابھی ان میں راسخ نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا ان کے ساتھ زیادہ رعایت اور عنایت ملحوظ رکھی جاتی تھی (مترجم)

لیکن اس نے بھی نے آپؐ کو ان کے قتل کی ترغیب نہیں دی۔

نہ صرف یہ کہ کسی منافق کے قتل کی ترغیب نہیں دی۔ بلکہ آپؐ کو اجازت بھی نہیں دی کہ کسی منافق کو قتل کر دیں۔

البتہ اس سے منع کر دیا کہ آپؐ کسی منافق کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ یا ان کی قبور پر تشریف لے جائیں۔

اور ——— !

اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا تو یوں ہی نہیں فرمایا تھا کہ :

"میں اس پر مامور کیا گیا ہوں کہ لوگوں سے اس وقت تک مقابلہ کرتا رہوں جب تک وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ نہ کہہ دیں۔ اور اگر وہ یہ اقرار کریں۔ کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تو مجھ سے ان کی جان اور ان کا مال محفوظ ہو جائے گا۔ بجز اس کے کہ ان کی جان اور مال سے کسی حق کی بنا پر تعرض کیا جائے۔ ورنہ ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔"

اور یہ ——— آپؐ ہی نے یہ بھی فرمایا تھا۔

خبردار ——— میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔"

اور وہ فقہاء اور محدثین جنہیں مامون نے قتل کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ اُن کی زبان پر جاری تھا۔ اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنا خون اور اپنا مال محفوظ کر لیا تھا۔

اور یہ کلمہ ——— لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ ——— صرف ان کی زبان ہی پر جاری نہیں تھا۔ یہ لوگ صالحین امت میں سے تھے۔ اصحاب ورع و زہد اور ارباب صلاح و تقویٰ تھے۔

لیکن عباسی خلفاء میں سے غلوپسند خلفانے لوگوں کو بغیر کسی "حق" کے مبتلائے آفات ومحن کیا۔ اوران میں سے بعض کو قتل کرکے ظلم ناروا کا ثبوت دیا۔ ان کے قتل کا سبب یا شبہ تھا۔ یا سازش، یا اختلاف رائے! ——— جیسے خلیفہ مہدی نے زنادقہ کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو جو زندقے سے متہم تھے قتل کیا۔ اور ایسے لوگوں کو بھی قتل کیا جن کا کفر ثابت نہیں تھا۔ ان کی جان صرف اس لیے لی گئی کہ بعض لوگ ان کے خلاف در اندازی کر رہے تھے اور ذاتی یا صفاتی وجوہ سے ان کی جان کے درپے تھے۔

ان خلفاء کے غلو کا یہ حال تھا کہ ایک خلیفہ نے اپنے ایک وزیر کو حکم دیا کہ اپنے بیٹے کو قتل کر دے۔ یہ حکم دیتے ہوئے اس نے کہا:

"اٹھ ——— اسے قتل کر کے خدا کا تقرب حاصل کرے۔"

یہ ساری باتیں تمام تر غلو، تعصب اور ناروا داری کا نتیجہ تھیں۔

ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ آپؐ نے مخالفین کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا ہو۔

ایسی بھی کوئی مثال نہیں ملتی کہ خلفائے راشدین نے ایسا کیا ہو۔ اور مسلمانوں کو قتل کر دینا شروع کر دیا ہو بجز اس کے کہ انہوں نے علانیہ دین سے خروج کیا ہو۔ اور دین سے عداوت اور بیزاری کا اظہار کرنے لگے ہوں۔ اس صورت میں بے شک اسلام نہ ان کے خون کا محافظ تھا۔ نہ مال کا ——— انہوں نے خود اپنے اس حق کو کھو دیا تھا۔

(۲۷)

استبداد

مُطلق العنان فرمانرواؤں کی قہرمانیّت

اس جگہ میں تفصیل کے ساتھ زیاد کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔

زیاد ——— جس نے اپنے ایک مشہور خطبے میں لوگوں سے تخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"وہ وقت آگیا ہے کہ میں بُرے آدمی کے بدلے میں بھلے کو بے دین کے مقابلے میں دیندار کو پکڑوں گا اور سزا دے کر رہوں گا)

میں حجاج بن یوسف ثقفی کا ذکر کرنا بھی نہیں چاہتا جس کی تلوار سے اب تک خون ٹپک رہا ہے۔ جس نے بغیر کسی "حق" کے ان گنت لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہ زیاد اور حجاج بہت بڑے سفاک اور خون آشام تھے۔ خلفاء بنو امیہ نے انہیں اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو عراق میں کھلی چھٹی دے دی تھی۔ کہ جو چاہیں کریں۔ اور جتنے ظلم چاہیں عوام پر ان کی بے گناہی کے باوجود توڑیں۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں نے اس آزادی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ خوب خوب ظلم کیے۔ اور عوام کی گردنیں ان کی بے گناہی کے باوجود بے دریغ

کاٹیں۔ انہوں نے لوگوں کا خون بہایا۔ ان کا مال چھینا۔ اور فتنہ و فساد کے پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ :

: رائے کا غلو

: لوگوں کو ان کے معتقدات و خیالات کے برعکس اپنے معتقدات اور خیالات کا پابند کرنے کی کوشش۔

: شبھے کی بنا پر دار و گیر کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔

: بدگمانی کی بنیاد پر بے دھڑک لوگوں کا قتل۔ اور تعذیب

: اکابر و اعیان امت کی توہین و تذلیل ———

یہ ساری چیزیں ہیں، جن کا اسلام انکار کرتا ہے۔ پوری قوت اور شدت کے ساتھ جنہیں وہ رد کرتا ہے۔ اللہ اور اس کا رسول، دونوں ان باتوں سے بری ہیں۔

یہ ہتھکنڈے انہی حکام اور برسرِ اقتدار لوگوں کے ہو سکتے ہیں۔ جو خدا کے خوف سے بے پروا ہو چکے ہوں۔ جو ہوا و ہوس کے پیرو ہوں، جو عقل سے دشمنی رکھتے ہوں اور جو اللہ کے قوانین صریحہ کو توڑنے اور ان سے سرتابی پر کمربستہ ہو چکے ہوں۔

(۲۸)

بغاوت

○

استبداد و قہرمانیت کی خوں آشامیوں کا ردِّ عمل

دوسری صدی ہجری کے وسط میں۔ اور پہلی صدی ہجری میں جماعتوں کا اختلاف جو کبھی نوکِ شمشیر کے ذریعے ابھرا، اور کبھی تیغِ زبان نے جسے اچھالا۔ اور وہ اختلاف جو بعد میں اسلامی فرقوں کے وجود کے ساتھ ساتھ ابھرا اور نمایاں ہوا ——— بعض خفیہ سیاسی مذاہب کی تخلیق اور نشو و نما کا سبب بن گیا۔ ایسے اضطرابات کا مصدر اور گہوارہ بن گیا۔ جس نے مرکزِ خلافت کو یا پہلے دمشق میں، اور بعد ازاں بغداد میں متزلزل کر کے رکھ دیا

عہد عباسی میں مرکزی قوت حاکمہ نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ لوگ سیاسی معاملات میں آزادانہ طور پر اپنے افکار و آراء کا اظہار نہ کرنے پائیں۔ نہ کسی سیاسی تحریک میں کوئی حصہ لے سکیں۔ نہ سیاسی امور پر غور و خوض کریں۔

اس قہرمانیت کا لازمی نتیجہ ایک ہی نکل سکتا تھا۔ اور بالآخر وہ رونما ہو کر رہا۔ یعنی لوگ چھپ چھپ کر، خفیہ اور پوشیدہ طور پر اپنے سیاسی خیالات و تاثرات کا اظہار

کریں۔ اس کے سوا اب ان کے لیے کوئی اور چارہ کار ہی نہیں رہ گیا تھا کہ اپنی سرگرمیوں کو ——— خواہ وہ ذہنی ہوں یا عملی ——— منظر عام سے پس منظر میں لے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خفیہ تحریکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بغاوت اور شورش کے پروگرام بننے لگے۔ پس پردہ اور نگاہ مردم سے ہٹ کر حکومت کا تختہ الٹنے کے منصوبے تیار ہونے لگے۔

ایک مزید بات ان میں سب سے بالا، اہم اور توجہ طلب:

عصر عباسی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ثقافت طبقۂ علمار متخصصین اور طبقہ اغنیار میں جا کر اور ان میں رچ بس کر اتنی بلند بام ہو گئی تھی کہ یہ دونوں ——— اکابر اہل علم اور ارباب ثروت ——— تو اس کی رنگ آرائیوں سے خوب خوب محظوظ ہوتے تھے۔ لیکن عوام کا جہاں تک تعلق تھا انہیں کوئی حقوق حاصل نہیں تھے۔ حکومت اور ارباب اقتدار و اختیار کی طرف سے ان پر جو مظالم ہو رہے تھے اور جس طرح ان کے حقوق پامال کیے جا رہے تھے۔ ان چیزوں نے انہیں چونکا دیا تھا۔ وہ اب شعور و احساس کی منزل کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ اغنیار طیبات حیات سے پورے طور پر بہرہ ور ہو رہے تھے۔ اور کم مایہ لوگوں کے لیے فقر و فلاکت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اقویار ضعفار پر چھائے ہوئے تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے حکمران تھے۔

ان حالات میں یہ خفیہ دعوتیں اور زیر زمین تحریکیں پیام بغاوت بن کر پھیلیں درحقیقت یہ دعوتیں اور تحریکیں نہ اتنی زیادہ سیاسی تھیں، نہ بہت زیادہ مذہبی۔ یہ حقوق اجتماعی کا ایک مطالبہ تھا۔ یہ مطالبہ تھا عدل و انصاف کا اور ——— اور مساوات کا۔

چنانچہ بصرے میں زنگیوں (اصحاب الزنج) کی بغاوت درحقیقت غلاموں کی

آقاؤں کے خلاف بغاوت تھی۔

اس بغاوت نے مرکز خلافت کو ہلا دیا تھا۔ اور اسے ایک خطرِ عظیم میں مبتلا کر دیا تھا جسے فرو کرنے اور کچلنے کیلیے بغداد کے اولوالامر نے لشکر کثیر اور زر بے حساب صرف کر ڈالا۔ تب جا کر نجات ملی۔ لیکن یہ نجات بہت مہنگی پڑی۔ اس جنگ میں جو آقاؤں کی غلاموں سے ہوئی۔ بہت سے آدمی کام آئے۔ اور ان گنت روپیہ صرف ہوا۔

اس جنگ کی چنگاریاں ابھی سلگ رہی تھیں کہ ایک اور بغاوت جو پہلی سے کہیں زیادہ مہیب، ہولناک اور ضرر رساں تھی، نمودار ہوئی۔ اس کا خطرہ بہت بڑا تھا۔ اور اس کی جڑیں بہت دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ قرامطہ کی شورش اور بغاوت تھی۔

اس شورش اور بغاوت کی بنیادی دعوت اور بنیاد بڑی خطرناک تھی ——————

عدل و مساوات کی دعوت :

اس دعوت کا مطلب تھا۔ اس نظام اجتماعی کا انہدام جو اس وقت پورے دبدبے اور طنطنے کے ساتھ قائم تھا۔

عراق، شام اور بلاد عرب میں شر و فساد کی کار فرمائی زور شور کے ساتھ جاری تھی ایسا معلوم ہوتا جیسے ہر طرف انارکی پھیلی ہوئی ہے۔

اور بات یہیں تک آ کر ختم نہیں ہو گئی۔ بلکہ شیعان علی نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ وہ اندر ہی اندر کام کر رہے تھے۔ ان کی سرگرمیاں خفیہ تھیں ان کی دعوت خفیہ تھی۔ لیکن ان میں بلا کا جوش عمل تھا اور اس جوش عمل نے بالآخر شمالی افریقہ میں انہیں تخت حکومت و فرماں روائی عطا کر دیا۔

یہ نئی حکومت بہت جلد ابھری اور قوت و شوکت کے ساتھ اس نے کار فرماں

رواں انجام دینا شروع کر دیا۔ یہ حکومت صرف شمالی افریقہ تک محدود نہیں رہی یہ ایک سیل تندرو کی طرح رواں دواں بڑھتی رہی۔ اور مخالف قومیں خس و خاشاک کی طرح اس کے ساتھ بہتی رہیں۔ ان میں نہ مزاحمت کی سکت تھی۔ نہ مقابلے کی طاقت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خفیہ دعوتوں کے ذریعے بے یقینی کے عالم میں جو حکومت ایک دور دراز مقام ——— شمالی افریقہ ——— میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا پرچم کشورکشائی مصر، شام اور بلاد عرب پر لہرانے لگا۔

یہ کتنی عجیب بات تھی۔

لیکن بات کتنی ہی عجیب ہو عین واقعہ تھی ——— امور واقعات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اور واقعہ یہ تھا کہ اب عالم اسلام کا بہت بڑا زرخیز اور شاداب ملک ——— مصر ——— اس کے قبضے میں تھا۔ ایسا ہی ایک اور دوسرا ملک ——— شام ——— جو اپنی رعنائی اور زیبائی میں خود اپنی مثال تھا، اس کا زیر نگیں تھا۔ اور صرف مصر و شام کا کیا ذکر بلاد عرب پر اس کا قبضہ تھا۔

(۲۹)

تعدّدِ خلفاء

○

افتراق بین المسلمین کی انتہا

مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا

نہ اب ان میں وہ نظم تھا، نہ قوت، نہ وہ شان اور شوکت۔ وہ بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی قوت ضعف و اضمحلال کے دور سے گزر رہی تھی۔ پہلے ان کی ایک حکومت تھی جو عرب سے کر عجم تک دادِ فرمانروائی دے رہی تھی۔

ان کا ایک نظامِ حکومت تھا جس کے سامنے سب کی گردنیں جھکتی تھیں۔

ان کا مرکز خلافت بھی ایک تھا۔

اور اس ایک مرکز خلافت سے ہر مسلمان وابستگی کو اپنے لیئے مایہ فخر سمجھتا تھا۔ خواہ وہ عرب ہو یا عجم، سیاہ فام ہو یا لالہ رخ ——— لیکن اب یہ مرکز کئی مرکزوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرامطہ کی حکومت قائم ہونے کے بعد مسلمانوں میں تین حکومتیں قائم ہو گئیں اور تین خلفاء مسند آرائے خلافت ہو گئے

ان تینوں میں سب سے زیادہ ضعیف اور کمزور خلیفہ عباسی خلیفہ تھا۔ جو بغداد میں بیٹھا زندگی کے دن پورے کر رہا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ اگرچہ یہ خلیفہ تھا۔ لیکن ہر طرح کے اقتدار واختیار سے محروم تھا۔ یہ محض بے بس تھا۔ اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ذاتی طور پر راحت و آسائش کی زندگی بسر کرلے۔ لیکن معاملاتِ حکومت سے کوئی سروکار نہ رکھے۔

دوسرا خلیفہ مصر میں تھا۔

فاطمی جب شمالی افریقہ سے ایک رود تند جولاں کی طرح بڑھے تو مصر میں آکر دم لیا۔ یہاں آکر قاہرہ نام کا شہر بنایا اور بسایا۔ اور اس کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ اور جاہ و جلال، شوکت و سطوت اور عزوشان کے ساتھ حکومت کرنے لگے۔

تیسرا خلیفہ اندلس کے ایک شہر قرطبہ میں تھا

یہ اموی خلافت تھی۔

دمشق کی اموی خلافت نے مدت ہوئی دم توڑ دیا تھا۔

پھر عباسیوں کی دہشت سے سراسیمہ ہوکر اس خاندان کے کچھ لوگ جان لے کر بھاگے اور اندلس میں پہنچ گئے اور وہاں ایک اموی حکومت پھر قائم ہوگئی۔ شروع شروع میں یہ اموی حکومت کمزور تھی۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد اس نے قوت و طاقت حاصل کرلی ۔۔۔۔۔۔ مشرق میں دولتِ عباسیہ کا ستارۂ اقبال اوج پر تھا۔ اور مغرب میں دولتِ امویہ کا چراغ ٹمٹمایا۔ پھر شمعِ فروزاں بن گیا

یہ تینوں حکومتیں مسلمان تھیں۔

یہ تینوں خلیفہ "مسلمانوں" کے تھے

لیکن ان میں باہم اتحاد نہ تھا۔ دشمنی تھی، عداوت تھی۔ کینہ تھا۔ ہر ایک دوسرے کو

تباہ و برباد کرنے اور صفحۂ ہستی سے ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ کسی کے لیے ممکن نہ تھا کہ دوسرے کا وجود برداشت کر سکے۔

بنوہاشم دو ٹکڑوں میں بٹ گئے ——— عباسی اور علوی

خلافت عباسیہ بغداد میں قائم تھی اور خلافت علویہ قاہرہ میں۔

بنوامیہ نے قرطبہ میں کاروبار حکومت سنبھال رکھا۔ یہ عباسیوں کے بھی دشمن تھے اور علویوں کے بھی

علماء اندلس کے مابین ایک ہستی ابن حزم کی ابھری۔ ابن حزم نے علی الاعلان یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ تعدد خلفاء جائز ہے۔ یعنی ایک وقت میں کئی خلفا ہو سکتے ہیں۔ اور شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں۔

لیکن اس فتویٰ کے ساتھ ساتھ ——— جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں عرض کر چکے ہیں ——— اسے بھی فراموش نہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو انتشار اور پراگندگی کا حکم نہیں دیا تھا۔ بلکہ حکم دیا تھا تو اس کا کہ مسلمان اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں۔ اور متفرق و پراگندہ نہ ہوں ——— لیکن ان میں تفرقہ پیدا ہو چکا تھا اور پراگند کی حد کو پہنچی ہوئی تھی

یہ صورتِ حالات اس تعلیم کے قطعاً خلاف تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کو دی تھی۔

یہ افتراق، یہ تشتت، یہ پراگندگی، اس دعوت اتحاد و محبت سے کوئی تعلق رکھتی تھی جو خدائے بزرگ و برتر نے اور اس کے نبی امی نے امت مسلمہ کو دی تھی؟ ———

جواب نفی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا

مسلمانوں کو تعلیم دی گئی تھی کہ اللہ کی رسی مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہیں۔

لیکن اس تعلیم پر عمل کس طرح کیا گیا؟

عمل یوں کیا گیا کہ وہ افتراق و انقسام کے شکار ہو گئے۔ جنگ باہمی میں مبتلا ہو گئے ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگے۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صالحین مؤمنین صحابہ کرام کسی چیز کو بھی اس درجہ مبغوض نہیں رکھتے تھے جتنا تفرقے اور انقسام کو۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"جس نے ہم (میں سے ایک دوسرے) پر ہتھیار اٹھائے۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کو بھی اس کتاب میں کئی مقام پر ہم زیر بحث لاچکے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

"خبردار ——————— میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔"

اور یہ جو کچھ ہوا، کیا تھا؟

یہ جو کچھ ہوا اس کا مصدر اور اس کی بنیاد اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مسلمان اس دنیا کی رعنائی اور زیبائی پر ریجھ گئے۔ ایسے ریجھے کہ سب کچھ فراموش کر بیٹھے۔ انہوں نے اس عظیم و جلیل ذمے داری کو فراموش کر دیا جو خدا نے انہیں سونپی تھی۔ جس کی تلقین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔ اور جس سے عہدہ برآ ہونا بغیر اس کے ممکن نہ تھا کہ وہ متحد رہتے۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہتے اور ایک دوسرے کی گردن کاٹنے میں مصروف و منہمک ہو کر نہ رہ جاتے۔

اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں سے جو کچھ چاہا تھا۔ مسلمان اس سے منحرف ہو گئے

اللہ تبارک و تعالےٰ نے مسلمانوں سے یہ چاہا تھا کہ ان کے نظام حیات کی بنیاد

عدل، انصاف، اور مساوات پر مبنی ہو۔ لیکن انہوں نے اس راستے کو ترک کر دیا۔

فہم قرآن کے بارے میں مسلمانوں کا اختلاف مبنی تھا ذاتی رجحان سے اثر پذیری پر۔ فہم قرآن کو انہوں نے اپنے خواہشات وتصورات کا پابند بنانے کی سعی شروع کر دی تھی۔ لہٰذا انھیں قرآن کے راستے سے ہٹنا ہی چاہیے تھا۔

◎

(۳۰)

علم و جہل

○

مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سبق آموز اور عبرت انگیز واقعہ

اس طرح حالات دگرگوں اور ابتر ہوتے چلے گئے۔ شئون حکومت پر اجنبی عناصر مسلط ہوتے چلے گئے۔ ان شئون واحوال کی بنیاد منافع پر تھی۔ منافع کا سلسلہ قائم رہنا چاہیے۔ اللہ تعالےٰ نے عدل، انصاف اور مساوات کا جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل ہو یا نہ ہو۔ منافع کی اس ہوس نے حالات کو بہت زیادہ ابتر اور نازک کر دیا تھا۔ نہ صرف عدل، انصاف اور مساوات کو نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ بلکہ یہ بات بھی دل سے اتر گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ اعمال ظاہرہ کو دیکھتا اور نیاّت باطنہ سے واقف ہے۔ اور بہت اچھی طرح واقف ہے

یہ کھٹک بھی دل کے کسی گوشے میں موجود نہیں رہ گئی تھی کہ اللہ تعالےٰ خبر دے چکا ہے کہ لوگ جو کچھ کریں گے۔ اس کی گواہی یوم قیامت کو ان کے اعضا و جوارح دیں گے۔ انہوں نے دلوں میں جو کچھ چھپا رکھا ہے وہ ظاہر ہو کر رہے گا۔

ان لوگوں نے ان مسلمانوں نے ان تمام باتوں کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔ ان کے ذہن د دماغ کے کسی گوشے میں یہ سوال نہیں پیدا ہوتا تھا کہ خدا کو کیا جواب دیں گے؟

انہوں نے اپنی حکومت کی بنیاد نفع عاجل پر قائم کر رکھی تھی۔

اور یہ نفع عاجل بھی صرف ان کی ذات خاص کے لیے، ان کے اعوان و انصار کے لیے، ان کے ساتھیوں اور ساجھیوں کے لیے، عوام بھی اس نفع کے حصے دار ہو سکتے ہیں انہیں بھی اس نفع میں شریک کرنا چاہیے۔ یہ ایسی بات تھی جسے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

ایک لمحے کے لیے بھی کبھی انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ قوم اور امت کے بھی کچھ حقوق ہیں اور ان حقوق کو ادا بھی کرنا چاہیے۔

اور یہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

یہ قوم اور امت کو اپنے اقتدار و اختیار کا مصدر نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک قوم ایک وسیلہ تھی طمع اور حرص کے پورے کرنے کا۔ ذریعہ تھی خواہشوں اور آرزوؤں کو بروئے کار لانے کا۔ حالانکہ ــــــــــ

حالانکہ ہر معقول اور اچھی حکومت کی اصل دینی یہ ہوتی ہے کہ امت غایت ہوتی ہے اور حکومت وسیلہ پھر امت اور حکومت کی غایت مشترکہ ہوتی ہے کہ حصول رضائے الٰہی کی کوشش اور رضائے الٰہی کا حصول بغیر اس کے ممکن نہیں کہ جور کا قلع قمع کر دیا جائے۔ اور عدل و انصاف کو رواج دیا جائے۔ باطل کی سرکوبی کی جائے اور حق کا ساتھ دیا جائے۔ مظلوم کی داد رسی کی جائے اور ظالم کو پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اور یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک امت اور حکومت دونوں پورے خلوص اور سرگرمی سے اس مقصد کے حصول میں مصروف و منہمک نہ ہو جائیں۔

حاکم اور محکوم دونوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ بے کار اور عبث نہیں پیدا کیے گئے ہیں۔ کوئی مقصد ہے جس کے باعث ان کی تخلیق ہوئی ہے۔

اور وہ مقصد کیا ہے؟ کیا ہو سکتا ہے؟

ظاہر ہے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ فساد برپا کریں۔ اور خون بہائیں ایک دوسرے کا

خلاف صف آرا ہوں ۔ اور سارا جوش کار ایک دوسرے کو زک دینے اور نیچا دکھانے
میں صرف کر دیں

پھر کیا ہے وہ مقصد ؟

وہ مقصد تخلیق یہ ہے کہ لوگ اپنی اصلاح کریں ۔ اچھے کام کریں ۔ نیکی کو اپنا شعار بنائیں ۔ بدی اور برائی سے اجتناب کریں ۔ حق کا ساتھ دیں اور باطل کی طرف رخ بھی نہ کریں اور جب وہ دن آئے کہ ان کا اپنے رب سے سامنا ہو تو اس طرح کہ ان کا نامۂ اعمال پکار اٹھے کہ یہ متقی ہیں ۔ پاک اور طاہر ہیں ۔ ذنوب و آثام سے یکسر بری ہیں ———

———— ⁘ ————

پھر ان حاکموں نے جو ہر اعتبار سے ان کے لیے اجنبی تھے ۔ اور اجنبی عناصر کے ماتحت تھے صرف انہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا ۔ یہ عربی زبان سے بھی ناواقف تھے ۔ اور اس کا حق ادا کرنے میں قاصر رہے تھے

انہوں نے اس بات پر بھی کبھی غور کرنے کی زحمت نہیں گوارا کی کہ عربی زبان ، قرآن کی زبان ہے ۔ ثقافت اسلامیہ کی آواز ہے ۔ اور اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو گویا قرآن ، سنت ثقافت ، ہر چیز ترک کر دی گئی ۔ اور یہ ترک و اہمال جس چیز پر منتج ہوتا ہے وہ ہے جہل —
—— جہل دین سب سے پہلے ، اس کے بعد جہل علم ، پھر جہل ثقافت ۔

اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ لوگوں کے معاملات جہل کے تصرف میں آگئے ۔ اور کھلی ہوئی بات ہے ۔ جہل علم کا پرانا دشمن ہے ۔ اور علم کے بعد جہل کی جن چیزوں سے ان بن ہے ۔ وہ ہیں حلم ، بردباری ۔ نیز خواہشات کے سامنے زیر ہو جانا ۔ اور نفس سے مغلوب ہو جانا ۔

جہل کی اس کار فرمائی کا سلسلہ کچھ اور بڑھتا اور ترقی کرتا رہا ۔ بات صرف عامۂ مسلمین تک محدود نہیں رہی ۔ بلکہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ حکام ، شئونِ دین ، شئونِ علم ،

اور شئونِ ثقافت سے بے بہرہ ہوگئے۔ ان کا کام یہ تھا کہ دین کی تبلیغ کرتے۔ علم کو پھیلاتے اور ثقافت کو پروان چڑھاتے۔ لیکن اس فریضے کو انہوں نے ترک کر دیا۔ اور امت جہل عام کی مصیبت میں گرفتار ہوگئی۔

اور اسی جہل عام سے وہ شر پیدا ہوا جس سے آج تک گلوخلاصی نہیں ہو سکی ہے۔ اور جس سے چھٹکارا پانے کے جتن کیے جا رہے ہیں۔ اور اس مصیبت سے اگر کسی کو نجات بھی ملی ہے تو سخت ترین شدائد و نوائب جھیل کر۔

حکومت جب شئون دین سے غافل ہو جائے تو علماء بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں چوکس نہیں رہتے۔ وہ ارباب حکومت کو تلقین کرنا ترک کر دیتے ہیں۔ اور لوگوں کو اس سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ جو ان کا حق ہے شئون دین کی نہ تعلیم دیتے ہیں۔ نہ اس کام پر انہیں ابھارتے ہیں۔

اپنے فرائض سے غافل اور بے پروا ہونے کے بعد وہ تحقیق و تدقیق کی دنیا سے بھی باہر نکل آتے ہیں۔ پھر نہ اصول میں تعمق سے کام لیتے ہیں۔ نہ استخراج فروع کے سلسلے میں کوئی جد و جہد کرتے ہیں۔ حالانکہ انہی چیزوں پر لوگوں کی زندگی میں مرور زمانہ اور تغیر احوال و ظروف کے باوجود لچک باقی رہتی ہے۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ سر چشمے گدلے ہو جاتے ہیں۔ جن سے اپنی تشنہ کامی دور کر کے فقہا تعمق اصول اور استخراج فروع کرتے رہتے ہیں۔ اجتہاد کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اور یہ وہ چیز ہے جو مسلمانوں سے پہلے کسی اور امت میں کبھی نہیں ملتی

فقہاء اسلام و مسلمین کا بہت بڑا اور وقیع کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اجتہاد کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ فہم قرآن، سنت نبوی اور سیرت صالحین صحابہ کو پیش نظر

رکھتے تھے۔ اور انہی چیزوں کو مصدر قرار دے کر استنباط احکام کرتے تھے۔ اس کارنامے کے انجام دینے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اپنے اس کام کو خوبی اور ذمے داری کے ساتھ انجام دیتے ہوئے وہ ملوک و سلاطین کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ نہ ان کے قہر و غضب سے ڈرتے تھے۔ نہ اس کی پروا کرتے تھے کہ لوگ پروانہ وار ان کا طواف کر رہے ہیں۔ نہ اس سے متاثر ہوتے تھے کہ لوگ ان سے ناخوش اور بیزار ہیں۔ کوئی خوش ہو یا خفا، ناخوش ہو یا بیزار۔ انہیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ نہ کسی کے سامنے صلے کے لیے ہاتھ پھیلاتے تھے نہ کسی سے تحسین و آفرین کے جویا تھے۔

ان علماء اور فقہاء کے ان مساعی جمیلہ کا نتیجہ بہت خوش آئند نکلا۔ اس سے امت کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔ اور علم کی دنیا میں گراں بہا اضافے ہوئے۔ انہوں نے فقہ و اجتہاد کی روشنی پھیلائی۔ اور متعدد مکاتب فکر انہوں نے قائم کئے۔

اور یہ فکری اختلاف، یہ مکاتب فکر کا تعدد، یہ مسالک اور مذاہب کا اختلاف مسلمانوں کی حیات عامہ اور حیات خاصہ دونوں کے لیے حد درجہ نافع، مفید اور ساز گار ثابت ہوا۔

اس سے ان کی عقول کا تزکیہ ہوا۔ ان کے قلوب کی تطہیر ہوئی اور حل مشکلات کے نئے وسائل پیدا ہوئے۔

(۳۱)

تقلید

جہل اور سہل انکاری کی کرشمہ سازیاں

جب تک مسلمانوں کو علم کا چسکا لگا ہوا تھا طلب علم کی جد وجہد میں وہ مشغول تھے، فقہ و تعمق کو انہوں نے اپنا وطیرہ اور مشغلہ بنا رکھا تھا۔ اس وقت تک اس کے خوش گوار اور نافع ثمرات بھی نظر کے سامنے آتے رہے۔

لیکن جب انہوں نے علم اور دین کو ترک کر دیا۔ عقل جامد ہو گئی سلسلۂ تفکیر منقطع ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ تقلید کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔

علماء جب اجتہاد کا دروازہ بند کر دیں تو عامۃ الناس تقلید کے سوا اور کس چیز سے اپنے دل کو تسکین و تسلی دے سکتے ہیں؟

اس تقلید نے فقہ کے مذاہب اربعہ یعنی فقہ مالکی، فقہ شافعی، فقہ احمد بن حنبل اور فقہ حنفی کو دیار و امصار اور اقالیم میں واجب کر دیا۔

فقہاء کا کام اب یہ رہ گیا کہ ان مذاہب میں سے کسی مذہب کا درس دیں۔ اس کے الفاظ و عبارت کی باریکیوں پر غور کریں۔ اس کے مفہوم و مقصود کو طرح طرح سے بیان کریں۔

اس کے لیے لڑیں اور اپنی ساری صلاحیت اس کے فہم و ادراک میں صرف کر دیں۔

ہر جماعت مذکورہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی مقلد تھی اور اپنے امام کے مذہب کو تقدیس کے درجے پر رکھتی تھی۔

یہ مقلد علما کسی طرح بھی اس راہ سے منحرف نہیں ہو سکتے تھے۔ نہ اپنے امام کی فقہ میں کسی طرح کی تبدیلی اور تغیر کو روا رکھ سکتے تھے۔

اب تعصب نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔

یہ تعصب تھا مقلدین کا اپنے امام کے لیے۔

اور امام کی تقدیس اور اجلال و اکرام کا تقاضا یہ سمجھا جاتا تھا کہ دوسرے ائمہ کو مورد طعن قرار دیا جائے۔ ان کی تنقیص کی جائے۔

اس بدترین تعصب کا بدترین نتیجہ بھی نکلا۔

تحقیق کی دنیا نے جو علما اور مجتہد پیدا کیے تھے۔ ان کے علم نافع کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ ان کی تحقیق اور اجتہاد کے کارنامے ـــــــ جو اپنے اندر بہت سے گراں بہا علمی ذخائر پنہاں رکھے تھے ـــــــ پہلے ماند پڑے۔ پھر مرور ایام کی نذر ہو گئے

مقلدین ائمہ اربعہ کا تعصب اپنے ائمہ کرام کے بارے میں اتنا زیادہ بڑھا کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عام اور خاص یعنی عوام اور خواص، سب ہی اس رنگ میں رنگ گئے۔

عقل فقہی کو ان باتوں سے زنگ لگ گیا۔ وہ منجمد اور متحجر ہو گئی۔

فقہا کا کام صرف یہ رہ گیا تھا۔ کہ اپنے ائمہ کے اقوال کو دوہراتے رہیں۔

متاخر نے متقدم پر ایک حرف کا اضافہ بھی نہیں کیا۔

اس کے بعد فقہ چند کتب تقلیدیہ میں منحصر اور محدود و مقید ہو کر رہ گئی۔ ان کتابوں

کا متن پڑھایا جاتا ہے۔ ان کی شرح پڑھائی جاتی۔ ان کے حواشی پڑھائے جاتے —— اور ایک ہی متن کے شروح و حواشی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اب اپج کا دور ختم ہوگیا تھا۔ سنی ہوئی باتوں پر طبع آزمائی اور ذہانت و ذکاوت کا اسراف رہ گیا تھا۔

طلبہ کا کام یہ تھا کہ وہ ان درسی کتابوں کے مختصرات کو زبانی یاد کریں اور جب خوب اچھی طرح رٹ چکیں تو اساتذہ کے حضور میں پہنچیں اور ان سے شروح و حواشی کی تعلیم حاصل کریں۔ جو سمجھ میں آجائے اسے ذہن میں محفوظ کرلیں۔ جو نہ سمجھ سکیں۔ اس سے کترا جائیں۔

بعض بلاد میں تو ایسا بھی ہوا کہ حکام نے اپنی صواب دید پر کوئی فقہی مذہب عوام پر بہ زور قوت نافذ کر دیا۔ اور اس مذہب کے قاضی مقرر کر دیئے۔ جو اپنی فقہ کے مطابق عوام کے معاملات و مسائل کا فیصلہ کرنے لگے۔

اس بات کا بڑا اہتمام ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ کہ حکام کے پسندیدہ مذہب کے قاضی کے سوا کسی اور فقہی مذہب کا قاضی مسند قضا پر نہ بیٹھنے پائے۔

عامی اور عالم سب کا یہی حال ہوگیا کہ تقلید کو اپنا شعار بنانے پر مجبور ہوگئے۔

ایک گروہ جو حنفی مذہب کا مقلد تھا۔ اس کے لوگ اسی مذہب پر چلنے لگے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ حنفی قاضی کسی مسئلے میں بھی کسی دوسرے امام کے مسلک پر فتویٰ دے سکے۔ یا قضا نافذ کرسکے

اسی طرح جو لوگ مذہب مالک سے وابستہ تھے وہ اپنے فقہی مذہب سے سرِ مو انحراف گوارا نہیں کرتے تھے۔

کہیں کہیں ایسا بھی تھا کہ عوام حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی مسلک پر عمل پیرا تھے۔ ایسے مواقعے پر حکام نے کسی ایک مذہب کو نافذ اور رائج نہیں کیا۔ بلکہ سب کو آزادی دے دی کہ اپنے اپنے مذہب کے اصول اور قواعد پر عمل کریں۔

چنانچہ قاہرہ میں یہی صورت تھی۔ یہاں کی مسند قضا پر حنفی، مالکی، شافعی قاضی

بیٹھا کرتے تھے۔

اور اس سے بڑھ کر ایک ملک اور ایک قوم کے لیے شر انگیز بات کیا ہوسکتی ہے کہ وہاں مختلف اور متعدد قوانین رائج ہوں اور ان سب پر عمل درآمد ہوتا ہو۔ ایک قانون نہ ہو۔ جسے سب مانیں۔ جو سب کا ہو۔ اور جو یکساں طور پر پیش آمدہ مشکلات کو حل کر دیا کرتا ہو۔

اس صورتِ احوال کا نتیجہ بہت جلد یہ رونما ہوا کہ جمود اور عقم کا دور دورہ ہو گیا۔ اِجتہاد ختم ہو گئی اور علم بانجھ ہو گیا۔

بالکل ایسی ہی صورت علمِ کلام کے ساتھ بھی پیش آئی۔ وہ علم فقہ سے زیادہ اس باب میں خوش قسمت نہیں ثابت ہو سکا۔ وہاں بھی جمود طاری ہو گیا۔ اور عقم (بانجھ پن) کی کارفرمائی نظر آنے لگی۔

جس طرح فقہی مذہب لوگوں پر حاوی ہو گیا تھا۔ اسی طرح کلامی مذہب نے بھی لوگوں کو مقلد بنا دیا۔

علمائِ متکلمین نے اپنے مذہب کو دین بنا لیا۔ اور جو شخص بھی اس "دین" سے منحرف تھا۔ وہ جادۂ صواب اور صراطِ مستقیم سے منحرف تھا۔

فقہ کی طرح یہاں بھی مختصرات ازبر ہونے لگے۔ شروح و حواشی کا درس جاری ہو گیا۔ یہاں تک کہ عقل ایک ایسا آلہ بن گئی جو معطل ہو۔ جس سے کوئی کام نہ لیا جاتا ہو۔ اس کا اگر کوئی کام تھا تو صرف آموختے کو یاد کرنا اور اسے دوہراتے رہنا۔ اور اس اعادے میں بھی فہم و عقل کو بالائے طاق رکھ دینا۔

جو کیفیت علمِ فقہ اور علمِ کلام کی تھی۔ بالکل یہی حال دوسرے تمام علوم کا ہو گیا۔

ان علوم کے مختصرات بھی زبانی یاد کرائے جاتے تھے۔ پھر ان کے شروح و حواشی کا درس ہوتا۔ اور ان پر ایسی تقریریں کی جاتیں جو حد درجہ پیچیدہ اور منغلق ہوتیں۔ عام فہم اور سادہ ذرا بھی نہ ہوتیں۔

جب علماء کی عقل اس طرح زنگ آلود ہو گئی تو ان کے تلامیذ اور شاگردوں کی عقل بھی جامد ہو کر رہ گئی۔

اور یہ جمود ایک ایسی وراثت بن گیا۔ جو ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہو رہا تھا۔

علم سے دوری اور تقلید کو اختیار کر لینے کے بعد جو منزل آئی اور جس نے عقل کا راستہ روکا۔ وہ تھی خرافات اور اساطیر کی منزل۔ یہ ایک دوسرے سے پیوست تھیں اور بارش کے قطروں کی طرح ٹپک رہی تھیں۔ ان چیزوں کے سامنے علم گونگا ہو کر رہ گیا۔ اور اس کا دروازہ عام لوگوں کے لیے بالکل اور متوسط طبقے کے لیے بڑی حد تک بند ہو گیا۔ صرف چند لوگ مستثنیٰ تھے۔ جو اس کلیہ کی زد سے باہر تھے۔

اس عام صورت احوال نے یہ کیفیت پیدا کر دی کہ استسلام و اذعان یعنی سپردگی اور سر تسلیم خم کرنے کی خو عام ہو گئی۔ جس سے جو سنا مان لیا۔ جس نے جو کہا تسلیم کر لیا۔

پھر جب حال میں، اور ماضی میں زیادہ سے زیادہ دوری پیدا ہو گئی۔ تو مسلمان اپنی تاریخ بھی بھول گئے۔ یہ بھی بھول گئے کہ انہوں نے کبھی علم کی قندیل روشن کی تھی اور ظلمت کدہ جہل کو علم کی روشنی سے منور کر دیا تھا۔ انہوں نے علم کی دنیا میں اضافے کیے تھے۔ اور ان اضافوں سے دنیا کا دامن بھر دیا تھا۔

انہیں، ان مسلمانوں کو یہ قطعی یاد نہیں رہ گیا تھا کہ ان کے اسلاف کرام اور آباو اجداد نے علم کے کیسے کیسے گنج ہائے گراں مایہ یادگار اور وراثت کے طور پر چھوڑے تھے۔ یہ ان کی قدر و

قیمت سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔ انہیں بالکل یاد نہیں تھا، وہ کیا تھے؟ اور کتنے تھے۔ البتہ انہیں درسی کتابوں کے مختصرات ازبر یاد تھے۔ خواہ یہ انہیں سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں۔ اب اسم نرچیز فہم وعقل نہیں رہ گئی تھی۔ وہ بڑی بڑی (شروح وحواشی کی) کتابیں رہ گئی تھیں۔ جن کے سمندر سے علم کے موتی چننے کے لیے یہ اپنے اساتذہ کی مجلس میں جاکر زانوئے شاگردی تہہ کیا کرتے تھے۔

اور خود استاذ کا حال کیا تھا؟

استاذ بھی ایک قیدی ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کے سامنے شروح وحواشی کے جو الفاظ پڑھے جاتے تھے۔ اس کی ساری ذہانت اور قابلیت انہی شروح اور حواشی کے الفاظ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ ان میں ایک لفظ کیا ایک حرف تک کا اضافہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی عقل نے تفکیر سے ناطہ توڑ لیا تھا۔ اس کی ساری عقل وفہم درسی کتابوں کے متن اور اس متن کی شرح اور حاشیے تک سمٹ کر رہ گئی تھی۔

اور یہ حاشیے کیا تھے؟ ——— ان شرحوں کی شرح مزید!

طلبا اور اساتذہ دونوں کی مثال اس طوطے کی طرح تھی۔ جس کے منہ سے صرف وہی الفاظ نکلتے رہتے ہیں جو اسے رٹائے جاتے ہیں۔ اپنی طرف سے وہ کچھ نہیں بول سکتا۔ اس لیے کہ فہم سے خالی اور عقل سے عاری ہے۔

لیکن یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ تاریک ترین دور جہالت وتقلید میں بھی ایسے اکابر واعاظم رجال پیدا ہوتے رہے۔ جنہوں نے جمود سے جنگ کی۔ تقلید سے لڑے اور اپنے علم کی دولت سے فائدہ اٹھایا۔ اور بیداری کی ایک لہر دوڑا دی۔

اس طرح کے لوگ کسی ایک دور میں نہیں، ہر عصر اور ہر عہد میں پیدا ہوتے رہے۔ اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ انہوں نے اپنی عقل کو وقف طاقِ نسیاں نہیں ہونے دیا۔ اسے بیدار رکھا۔ اور اس سے پورا پورا کام لیا۔ انہوں نے اپنے وجود سے تاریکی کو نور سے بدل دیا۔ انہوں نے قدماء کا علم پڑھا۔ اسے سمجھا۔ اور بے جھجک لوگوں کے سامنے کر دیا۔

اور یہ علماء ــــــــــ

یہ جامد، یہ مقلد اور یہ شروح و حواشی کے ماہر علماء ان اصحاب کے مقابلے میں آتے رہے۔ جو تقلید محض کے مخالف تھے۔ جو عقل سے کام لیتے تھے۔ اور چاہتے تھے۔ کہ دوسرے بھی اپنی عقل کو زنگ آلود نہ ہونے دیں۔ بلاشبہ یہ راستہ کانٹوں سے بھرپور تھا۔ یہ کانٹے ان کی جیب و دامن سے الجھے اور ان کے پاؤں میں چبھے۔ لیکن ان کا راستہ نہ روک سکے۔ ان کی زبان نہ بند کر سکے۔ انہیں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ یہ ساری تکلیفیں خندہ پیشانی کے ساتھ انہوں نے جھیل لیں۔ اور اپنے کام میں لگے رہے۔

مثال کے طور پر ابن تیمیہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ذرا ان کی سیرتِ گرامی پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ جامد علماء نے ان کے راستے میں کس طرح کانٹے بچھائے۔ اور انہیں کیسی کیسی اذیتوں اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اور صرف یہی نہیں کہ معاصر علماء سے انہیں اذیت پہنچی ہو، حکام کے استبداد کے بھی وہ شکار بنے۔ اور ان کے ہاتھوں بھی سخت سے سخت مصائب برداشت کیے۔ مگر کیا مجال ہے۔ جو زبان پر حرفِ شکایت آیا ہو۔

غرض اس دور کی تاریخ کا بھی اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ گو علماء کی بہت بڑی اکثریت جمود کا شکار ہو گئی تھی۔

اور اس سے اتنی مانوس ہو گئی کہ نہ صرف خود اس دائرے سے باہر نکلنا نہیں چاہتی تھی بلکہ اگر کسی کو یہ لوگ اس دائرے سے قدم باہر نکالتے دیکھتے تھے تو اس کا دامن کھینچ لیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے طریقے پر چلتے رہے اور ان کے نشانِ قدم اب تک موجود ہیں۔

◎

(۳۲)

غلامی

جہل اور تقلید کے نتائجِ بد

صدیوں تک مسلمان جن آلام و مصائب، اور ابتلاء وامتحان کا ہدف بنتے رہے اس کے عوامل میں سیاست بھی ایک عامل تھی۔

غیر اقوام کی حکومتوں نے جنہیں نہ صرف یہ کہ اسلام سے اور مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ بلکہ ایک طرح کی کد تھی۔ جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں پر جہالت طاری ہے۔ وہ تقلید محض کے دائرے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ غافل ہیں ظلم سہہ لینے کی خو ان میں پیدا ہوگئی ہے۔ ذلت، حقارت اور غلامی کی کیسی ہی لعنتیں ان پر مسلط کی جائیں۔ یہ انہیں قناعت کے ساتھ برداشت کر سکتے ہیں۔ تو وہ آگے بڑھیں۔

جب کوئی قوم پستی کی اس حد تک پہنچ جائے۔ جہاں تک مسلمان پہنچ گئے تھے۔ اور حد درجہ ضعیف اور کمزور ہو جائے[۱]۔ تو اس کی حکومت میں بھی دم خم باقی نہیں رہ جاتے۔ وہ بھی کمزور اور ضعیف ہو جاتی ہے اور اس میں یہ سکت باقی نہیں رہ جاتی۔ کہ طامع آزما دشمنوں کے

---

[۱] اقبال ـــــ ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات (مترجم)

کید و مکر کا مقابلہ کر سکے۔ یا اپنی قوم کو دشمن کے کید و مکر سے محفوظ رکھ سکے۔ وہ ظلم سے اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتی۔ اور اپنی قوم کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتی

اور قوم بھی ان حالات سے اس درجہ تنگ آچکی ہوتی ہے کہ وہ دل سے دعا مانگنے لگتی ہے۔ کہ اس کی حکومت ملّی کا سقوط عمل میں آجائے اور خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی دوسری حکومت برسرِ اقتدار آجائے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے ؟

اس لیے کہ قوم اپنی حکومت سے مایوس ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ اس کے عدل اور مساوات سے بھی مایوس ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ اب محسوس کرنے لگتی ہے۔ جیسے ایک شر، ایک فساد ایک طوفان بلاکت اس پر مسلط ہو گیا ہے۔

پس وہ تمنا کرنے لگتی ہے کہ یہ شر دُور ہو۔ یہ فساد زائل ہو۔ اور اس طوفان بلاخیز سے نجات ملے۔

وہ عدل کو ترس گئی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اسے آس پیدا ہونے لگتی ہے کہ غیر کی حکومت میں کم یا زیادہ بہرحال کچھ نہ کچھ عدل ملے گا۔ کسی نہ کسی حد تک اشک شوئی ہو گی۔ وہ لوگ جو اس کے ملک پر اور حکومت پر قبضہ کریں گے۔ کچھ تو اپنے بلند بانگ دعاوی کی لاج رکھیں گے۔ وہ اپنی شوکت اور بزرگی کو یکسر فراموش کر چکی ہوتی ہے۔ وہ اپنے حقوق اور واجبات کو بھی بھول چکی ہوتی ہے۔ اسے صرف ایک فکر ہوتی ہے۔ اور وہ فکر یہ ہوتی ہے۔ کہ اپنی حکومت کے بڑے ——— جسے وہ ایک عرصے سے بھگت رہی ہے ——— نجات پا جائے اور بس۔

راعی اور رعایا کی اس کش مکش کا نتیجہ بے چینی، اضطراب اور شورش کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ اور اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر استعماری نظام حکومت کے نمائندے آگے

بڑھتے ہیں۔ اور یہ دیکھ کر وفورِ مسرت سے بے قابو ہو جاتے ہیں۔ کہ لوگ استعمار کی حکومت قبول کرنے پر تیار ہیں۔ وہ آسانی سے فتح کر لیتے ہیں۔ اور اپنی استعماری حکومت قائم کر دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ جھوٹی آرزوؤں اور امیدوں کے دروازے بھی اس دل گرفتہ اور مغموم و مایوس قوم کے سامنے کھول دیتے ہیں

اور جب یہ سب کچھ ہو چکتا ہے

ایک قوم مفتوح اور دوسری فاتح بن چکتی ہے۔ تب مفتوح قوم کو احساس ہوتا ہے۔ کہ اس نے جو امیدیں نئے نظام اور نئے حکمرانوں سے قائم کی تھیں۔ وہ عبث تھیں۔ بے شک اسے ایک شر سے نجات مل گئی۔ لیکن دوسرا اس سے کہیں زیادہ بڑا۔ کہیں اور خطرناک شر اس پر مسلط ہو گیا۔ اور اس سے بڑھ کر بھی کوئی شر ہو سکتا ہے کہ ایک قوم پر ایک غیر اور اجنبی قوم حکومت کرنے لگے۔ جسے نہ مفتوح سے کوئی دلچسپی ہو۔ نہ اس کے ماضی کی قدر ہو، نہ حال کی پروا۔ نہ مستقبل کا خیال۔ اور یہ قوم، اپنی نو مفتوح قوم کے رزق اور مصالح کی حاکم بن جائے؟

بے شک یہ مفتوح لوگ خود اپنی حکومت کے دائرۂ اقتدار میں غلام تھے۔ اور غلاموں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن اب یہ ایسی قوم کے غلام بن گئے اور ایسی قوم کی ماتحتی میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جو کسی درجے میں بھی ان کی اپنی نہیں تھی۔ جو ہر اعتبار سے غیر اور اجنبی تھی ——— کوئی چیز بھی حاکم اور محکوم، فاتح اور مفتوح میں مشترک نہیں تھی ——— اختلاف زندگی کے ہر مرحلے پر، ہر معاملے میں اور اتفاق کہیں بھی نہیں۔ کسی معاملے میں بھی نہیں۔

اور اب یہ سوچنے اور دعا کرنے لگتے ہیں۔ کاش وہ پچھلا زمانہ پھر واپس آ جاتا۔ غلامی کرتے تو اپنوں ہی کی کرتے۔

وہ دور اس سے بہر حال بہتر ہوتا۔

(۳۳)

بیداری

ذہنی اور عملی غلامی کے خلاف اقدام وعمل

اگر جہل حائل نہ ہوتا تو علم جدید کی ضروری قدر افزائی کے ساتھ مسلمان اپنے علوم قدیمہ کو یکسر نظر انداز نہ کر دیتے۔ لیکن غلامی میں اور جہالت میں مبتلا ہونے کے بعد لوگ جمود سے ہمکنار ہو جاتے اور اس سے استمساک پر حریص ہو جاتے ہیں۔ اور سہل انگاری کے باعث اپنی وراثت قدیمہ کو بھی ایک شر خیال کرنے لگتے ہیں۔ اور قدیم کے احیاء کو کار بیکاراں تصور کرنے لگتے ہیں۔

یہ کیفیت کسی ایک اسلامی ملک کی نہ تھی۔ قریب قریب سب ہی اسی حال میں گرفتار تھے۔ سارے عالم اسلام کا یہی حال تھا۔ مغربی حکومتیں ایک ایک کرکے ان پر قابض اور ان کی حاکم بنتی جارہی تھیں۔

لیکن حالات نے پھر ایک پلٹا کھایا۔

غلاموں اور آقاؤں میں اتصال کی صورتیں پیدا ہوئیں حاکم اور محکوم کسی نہ کسی درجہ میں ایک دوسرے کے قریب ہوئے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر سب میں نہیں تو چند میں بیداری پیدا ہوئی۔ وہ اس گہری نیند سے جاگے۔ انہیں احساس ہوا کہ کتنے گہرے گڑھے ہیں جہالت اور غلامی کے وہ گر پڑے ہیں۔ وہ سو رہے تھے۔ دوسری قومیں بیدار تھیں۔ وہ ساکن تھے۔ دوسری قوموں میں حرکت تھی۔ یہ جاگتے تھے اور انہوں نے اپنی قوم کو بھی جگانا اور جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

یہ آسان کام نہیں تھا۔ اس کام کے انجام دینے میں غیر معمولی دشواریاں حائل تھیں لیکن انہوں نے دشواریوں کی ذرا پروا نہ کی۔ اپنے کام میں لگے رہے۔ انہیں تکلیفیں پہنچائی گئیں — اذیتیں دی گئیں۔ مصیبت اور امتحان میں مبتلا کیا گیا۔ لیکن ان کے پائے ثبات میں جنبش نہیں آئی اور راستے کی دشواری کا انہوں نے خیر مقدم کیا۔ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ اور بے سروسامان ہونے کے باوجود برابر منزل کی طرف بڑھتے رہے۔

میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ مصر جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ —— رحمہا اللہ —— کے عظیم و جلیل اور ناقابل فراموش کارناموں کو بھول سکتا ہے۔

ان دونوں بزرگوں نے ڈٹ کر استعمار کا مقابلہ کیا۔ اور اس راستے میں بہت سے خطرے جھیلے اور تکلیفیں برداشت کیں۔ ان پر طرح طرح کی پابندیاں عاید کی گئیں۔ جو لوگ ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ انہیں ستایا اور پریشان کیا گیا۔ پھر انہیں جتنا ستایا اور پریشان نہ کیا گیا ہو کم ہے۔

لیکن اس کے باوجود امت اسلامیہ عرصۂ دراز تک محو خواب خرگوش رہی۔ لیکن جب اس کے بعض سر برآوردہ اصحاب جاگے اور ہوشیار ہوئے۔ اور انہوں نے صور بیداری پھونکا تو بیداری کے ساتھ ساتھ ایسی صورت احوال بھی پیدا ہو گئی جس کی طرف اشارہ کرنا اور تنبیہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ ہے اسلام کی تاریخ ماضی سے ناواقفیت اور بے پروائی۔

خدانخواستہ میرا مقصد یہ نہیں کہ کم ہمتی پیدا کروں۔ حوصلہ شکنی کا ارتکاب کروں۔ یاس اور ناامیدی کے جذبات کو فروغ دوں۔ میں تو وہ باتیں کہہ رہا ہوں۔ اور کہنا چاہتا ہوں جن سے امید کا شعلہ اور فروزاں ہو جائے۔ عزم اور جوش کردار میں اور زیادہ قوت پیدا ہو جائے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں۔ اور یہی میری کوشش ہے کہ مسلمانوں میں خودنگری پیدا ہو۔ وہ اپنے آپ کو جانیں۔ اور پہچانیں۔ اور اس خلیج کو پاٹ دیں۔ جو ان کے اور قدما کے مابین پیدا ہو گئی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان امم جدیدہ سے ربط باہم قائم رکھیں۔ جو حضارت کی مالک ہیں۔ اور کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی جہت سے جدید عالم اسلام پر چھائی ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ ان کے اور صحیح قسم کی ترقی کے مابین ایک طول طویل راستہ ہے۔ اسے طے کرنا اور سر کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ دشواریوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور یہ بیداری جو ان کے اندر پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے ان کے سامنے دو راستے کھول دیئے ہیں۔ اور انہیں اختیار ہے کہ ان دونوں میں سے جو راستہ چاہیں اختیار کر لیں:

(۱) ——— ایک راستہ تو یہ ہے کہ جوں کے توں رہیں۔ بیداری کے آثار بھی موجود ہوں۔ اور خواب خرگوش بھی جاری رہے۔ خواب خرگوش میں مبتلا رہیں۔ اور ہوشیار بھی رہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ عروس کامرانی سے ہمکنار نہیں ہوں گے۔ انہیں جیسی کٹھنائیاں جھیلنا پڑی تھیں شاید ان سے بھی زیادہ بھگتنا پڑیں۔

(۲) ——— دوسری صورت یہ ہے کہ بیدار ہوئے ہیں تو بیداری کا حق ادا کریں اور اس نقصان عظیم کی تلافی کریں۔ جب وہ ٹھہرے ہوئے تھے اور دوسرے دوڑ رہے تھے۔ تاکہ ایک طرف وہ قدما کے صحیح معنوں میں جانشین بن جائیں۔ اور دوسری طرف ان لوگوں کے ہمسر بن جائیں۔ جو انہیں نیچا دکھانے کے درپے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ عہد ماضی میں ان کے بدیسی اور اجنبی حکمرانوں نے ان پر جہالت مسلط کر دی تھی۔ اس لیے کہ وہ خود بھی جاہل تھے لیکن

اب جو لوگ ان کے بارے میں طمع رکھتے ہیں۔ وہ قطعاً جاہل نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کی قہرمانیت اور استبداد میں جو سختی ہوگی وہ ماضی کے بدیسی اور اجنبی حکمرانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوگی۔

عصر حاضر کے استعمار پسند ان پر ایسا علم ٹھونسنے کی کوشش کریں گے۔ جو جہل سے برآمد ہوا ہوگا۔ اور ان اسباب کو منقطع کر دے گا۔ جو قوم اور اس کے ماضی کے مابین قائم رہا کیے ہیں۔ اور امم مستعمرہ میں انہیں جذب کر دے گا۔ لہٰذا اس سے حذر واجب ہے۔

ضروری ہے کہ اوپر جو دو صورتیں مذکور ہوئیں۔ مسلمان ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ ان کی بڑی تعداد اس منزل کو اختیار کرے گی۔ جو بیداری اور ہوشیاری کی منزل ہے۔

◎

۳۴

قدیم و جدید

دونوں کے ارتباط ہی سے بیڑا پار ہو سکتا ہے

اور بیداری و نہوض کی اس منزل تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

لیکن وہ راستہ کیا ہے؟

وہ راستہ ہے قدیم سے ٹوٹا ہوا ناطہ جوڑنا قدیم سے وراثت میں جو باتیں ملی تھیں، انھیں یاد کرنا اور یاد رکھنا۔

یہ کہنا بیکار ہے کہ وہ یاد ہیں۔ ان کی پوری پوری معرفت کی ضرورت ہے۔ انہیں مکمل طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ قدیم سرمایہ، جو مشتمل ہے علم کے ذخیروں پر اسے پھر سے اپنانے کی ضرورت ہے۔ اصحاب علم و خبر کا فرض ہے۔ اس کام کو ہاتھ میں لیں۔ اور جو نہیں جانتے انہیں بتائیں

یہ تو ہوئی ایک بات!

دوسری بات جو گرہ میں باندھ لینی چاہیے، یہ ہے کہ علم جدید میں سے جو کچھ کھویا جا چکا ہے

اس کا استدراک کیا جائے۔

قدیم کی طرف پلٹنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جدید کا متقاطعہ کر دیا جائے۔ اسے ایک محقق کی طرح ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ اور اس کے حصول میں کسی روکاوٹ کو خاطر میں نہ لانا چاہیے۔ اور زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کم سے کم وقت میں تلافی مافات کرنی چاہیے۔

اور یہ تلافی اس شان سے ہونی چاہیے کہ یہ نہ معلوم ہو کہ مسلمان علم جدید میں کسی کے پس رو ہیں۔ کسی سے اثر پذیر ہیں۔ بلکہ یہ معلوم ہو۔ علم جدید کے سرمبد ان ہیں۔ وہ برابر کے شریک اور ساجھی ہیں۔

صرف اسی طرح وہ قدما کے راستے اور ان کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے ورثے اور ترکے کی حفاظت بھی کی اور جو کچھ نیا ملا اسے قبول کرنے اور لینے میں بھی نہیں ہچکچائے انہیں بھی، ہمارے اسلاف کو بھی بدلیسی، اجنبی اور غیر تہذیب وحضارت او علم وثقافت سے سابقہ پڑا تھا۔ انہوں نے ہتھیار نہیں ڈال دیئے۔ گردن نہیں ڈال دی۔ انہوں نے اس جدید ثقافت اور علم کو نہ صرف قبول کیا اور حاصل کیا۔ بلکہ اپنی ذہانت وذکاوت اور مہارتِ تامہ سے کام لے کر اس میں مفید اور ضروری اضافے بھی کیے۔ اسے بالکل اپنا لیا۔ وہ غیر کی چیز تھی لیکن ان کی ہو گئی۔ انہوں نے علم کی شمع روشن کی۔ اور آج جو بلاد وامصار اس روشنی سے منور نظر آتے ہیں۔ وہاں درحقیقت یہ روشنی ہمارے اسلاف ہی نے پہنچائی تھی۔ وہی ہے جو آج تک اس دنیا کو روشن رکھے ہوئے ہے [1]

---

[1] اقبال مگر وہ علم کے موتی ـــــ کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ
(مترجم)

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لیے عروج وارتقاء کا کوئی نیا راستہ پیدا کیا جائے ہمارا مقصد تو بالکل واضح اور بہت زیادہ سادہ ہے۔ لیکن اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ تو پھر ہلاکت اور خطرہ ہے۔ یعنی مسلمانوں کی ساری ترقی، عروج اور کامرانی منحصر ہے ان کے اسلام کے ساتھ، قرآن کے ساتھ۔ جو کچھ ہو سکتا ہے اسی سے ہو سکتا ہے۔ قرآن آج بھی ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے پڑھتے ہیں۔ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ سماعت کرتے ہیں۔ اس کی آیتیں پڑھ کر تلاوت کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اسے سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ حالانکہ ضرورت ہے کہ ان کی تعداد میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔ اور یہ اضافہ ہوتا ہی چلا جائے۔ یہاں تک کہ انسانیت کے مابین علم صحیح عام ہو جائے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ طیبہ سے جو کچھ ثابت ہے محفوظ ہے کتابوں میں موجود ہے۔ لوگ اسے پڑھتے ہیں۔ استفادہ کرتے ہیں۔

لیکن وہی دشواری یہاں بھی ہے جس کا اشارہ ابھی ابھی ہم کر آئے ہیں۔ پڑھنے والے بہت ہیں۔ سمجھنے والے بہت کم۔

حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ سنت نبی ؐ کے جاننے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو۔ اور یہ اضافہ برابر جاری رہے تاکہ لوگوں کے سامنے وہ حقائق واضح کیے جا سکیں۔ جنکی تشریح سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ اور وہ امور دین سمجھے جا سکیں۔ جن کا تفقہ صرف اسی چیز پر منحصر ہے۔

خلفاء صالحین کی سیرت گرامی بھی معروف ومشہور ہے۔ کتابوں کے اوراق میں ثبت ہے۔ اہل تاریخ انہیں مطالعہ کرتے ہیں اور ان کا حوالہ دیتے رہتے ہیں

لیکن یہ علم گرامی منزلت ایسا نہیں ہے جسے صرف مؤرخین کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ

تو میراث مشترک ہے۔ ضروری ہے کہ اسے لوگوں میں عام کیا جائے۔ اور اس علم کے مضمرات سے وہ آشنا کیے جائیں

علماء ملت اسلامیہ بھی اوراق کتب میں محفوظ ہیں۔

اس علم کا بہت کم حصہ منظرِ عام پر آسکا ہے۔ باقی حصہ جو بہت بڑا حصہ ہے محو خواب ہے۔ اسی طرح جیسے امتِ اسلامیہ محو خوابِ خرگوش ہے۔ پس ضرورت ہے کہ یہ خواب ختم ہو۔ اور بیداری اس کی جگہ نمایاں ہو۔

امتِ اسلامیہ کیلیے سب سے ضروری اور لابدی چیز جو ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان اپنے امور دین اور اپنے امور دنیا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے اصحاب کرام اور صالحین مسلمین کی سیرت کو اپنا رہنما بنائیں۔ اور ان کی عقل و قلب میں جو جمود اور مادۂ تقلید پیدا ہو گیا ہے، اسے نکال پھینکیں۔

اللہ سے دعا ہے کہ شر سے ہمیں محفوظ رکھے اور خیر کی توفیق دے۔ وہ فرماتا ہے:

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ
اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ط

پھر کیا وہ ہماری پکار نہیں سنے گا؟ وہی سزاوارِ حمد ہے۔ اول بھی اور آخر بھی۔